ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

بُرہان

مُرتّب

سعید احمد اکبر آبادی

ایم۔ اے، فاضلِ دیوبند

اغراض ومقاصدِ ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) وقت کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر قرآن و سنت کی مکمل تشریح و تفسیر مروجہ زبانوں علی الخصوص اردو و انگریزی زبان میں کرنا۔

(۲) مغربی حکومتوں کے تسلط و استیلا اور علوم مادیہ کی بے پناہ اشاعت و ترویج کے باعث مذہب اور مذہب کی حقیقی تعلیمات سے جو بُعد ہوتا جارہا ہے بذریعہ تصنیف و تالیف اُسکے مقابلہ کی مؤثر تدبیریں اختیار کرنا۔

(۳) فقہ اسلامی جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی مکمل ترین قانونی تشریح ہے موجودہ حوادث و واقعات کی روشنی میں اس کی ترتیب و تدوین۔

(۴) قدیم و جدید تاریخ، سیر و تراجم، اسلامی تاریخ اور دیگر اسلامی علوم و فنون کی خدمت ایک بلند اور مخصوص معیار کے ماتحت انجام دینا۔

(۵) مستشرقین یورپ ریسرچ ورک کے پردے میں اسلامی روایات، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و تمدن یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام صلعم کی ذات اقدس پر جو ناروا بلکہ سخت بے رحمانہ اور ظالمانہ حملے کرتے رہتے ہیں، اُنکی تردید ٹھوس علمی طریقے پر کرنا اور جواب کے اندازِ تاثیر کو بڑھانے کیلئے مخصوص صورتوں میں انگریزی زبان اختیار کرنا۔

(۶) اسلامی عقائد و مسائل کو اس رنگ میں پیش کرنا کہ عامۃ الناس اُنکے مقصد و منشا سے آگاہ ہوجائیں اور اُن کو معلوم ہوجائے کہ ان حقائق پر زنگ کی جو تہیں چڑھی ہوئی ہیں اُنہوں نے اسلامی حیات اور اسلامی روح کو کس طرح دبا دیا ہے۔

(۷) عام مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو جدید قالب میں پیش کرنا خصوصیت سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر مسلمان بچوں اور بچیوں کی دماغی تربیت اس طریقے پر کرنا کہ وہ بڑے ہو کر تمدن جدید اور تہذیب نو کے مہلک اثرات سے محفوظ رہیں۔

برہان
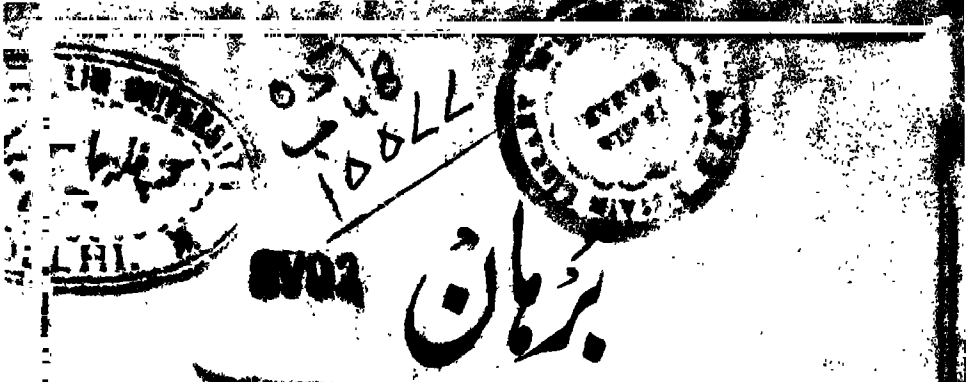
جلد اوّل — شمارہ (۱)

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ مطابق جولائی ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ندوۃ المصنفین

آج ہندوستان کے مسلمان ملک کے اندرونی اور بیرونی، سیاسی اور غیر سیاسی اثرات کے ماتحت جس عظیم الشان دورِ انقلاب سے گذر رہے ہیں اُس نے ہر صاحب فہم وبصیرت کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر اسی وقت مسلمانوں نے اپنی انفرادیت کو اور قومی حیثیت کو برقرار نہیں رکھا تو سیل انقلاب کی فلک بوس موجیں اُن کے وجود کو خس و خاشاک کی طرح بہالیجائینگی اور اُن کے کارناموں کا نقش لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی مانند مٹ جائیگا۔

مسلمانوں کی قومیت اُن کے مذہب سے وابستہ ہے۔ جس قدر مذہبی بندشیں اضمحلال پذیر ہوتی جائینگی اُن کی قومیت میں بھی کمزوری پیدا ہوتی رہیگی۔ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے یا قرآنی اصطلاح کے مطابق بحیثیت "امۃ واحدہ" کے اُسی وقت تک اقوامِ عالم کے سامنے روشناس ہوسکتے ہیں جب تک کہ اُن کے دلوں میں ایمان وعقیدت کا جوش اور ان کے اعمال و افعال میں خلوص وللّٰہیت کی گرمی موجود ہے۔ یہی مذہبی احترام وجوش اُن کی قومیت کی اصل روح رُواں ہے۔ اس کو نکال لیجیے تو دنیا کی تمام مسلم حکومتیں مل کر بھی ایک جسد بے روح اور ایک صورتِ بے معنی سے زیادہ نہیں

آج دنیا میں معاشی و اقتصادی مشکلات کے باعث نئی نئی تحریکیں بروئے کار آرہی ہیں مغربی علوم و فنون کی بے پناہ اشاعت نے نوجوانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات کے خطرناک جراثیم پیدا کردیے ہیں اور فرنگی تہذیب و تمدن کی مئے دوآتشہ نے آنکھوں میں خیرگی اور دماغوں میں زندشربی و خدا ناترسی کا جو خمار پیدا کردیا ہے، غور کیجیے تو ان سب کی زد بالواسطہ یا بلا واسطہ مسلمانوں کی اُس پختگی ایمان و یقین پر پڑ رہی ہے جس کے بغیر اُن کی قومیت کا قصر ریت کے ٹیلہ سے زیادہ وقیع اور پائیدار نہیں ہوسکتا۔

پھر اس سے بھی زیادہ حسرت انگیز یہ امر ہے کہ ایک طرف شبِ تاریک ہے، سمندر میں صد بلا در کنار طوفانی موجیں اُٹھ رہی ہیں، نشان راہ سراسر مفقود ہے، گردابِ بلا انتہائی تھرسامانی کے ساتھ دعوتِ خوف و ہراس دے رہا ہے، آسمان پر تیرہ و تار گھٹاؤں کا ہجوم ہے اور بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں نے ساحل مقصود کو بہت دور کردیا ہے۔ صرف برقِ جہاں سوز ہی جو کبھی کبھی پردۂ سحاب سے منہ نکال کر رہپارانِ بحر کی بیکسی پر ایک قہقہہ لگا جاتی ہے لیکن دوسری طرف کشتی کا عاقبت ناشناس ناخدا ہے جو نہ سفر کی مشکلات کا اندازہ رکھتا ہے نہ راستہ کے خطرات سے آگاہ ہے، اور نہ اُس نے آئندہ پیش آنے والی دشواریوں کا کوئی صحیح جائزہ لیا ہے۔ اُس نے اپنا مستول اور بادبان بھی نہیں بدلا۔ اور اس نے موج حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے کشتی کے پُرانے تختوں کو بھی مضبوط بنانے کی کوشش نہیں کی اور اس کے باوجود غایت بے فکری کے ساتھ راہِ ناشناس انسانوں کے ایک عظیم قافلہ کو اپنی کشتی پر بیٹھنے اور بحرِ ناپیدا کنار کو عبور کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ پھر جادہ پیمایانِ بحر کے اس کاروانِ گم کردہ راہ میں بعض روشن خیال لوگ ہیں جو ناخدا کے اس تغافل کو دیکھ کر ملاحی کے فرائض خود انجام دینے چلے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انہیں سفر کی مشکلات کا ایک بڑی حد تک اندازہ ہے۔ اُنہوں نے راستہ کے خطرات کا تھوڑا بہت جائزہ بھی لیا ہے۔ اور انہیں اس کی بھی فکر ہے کہ کشتی کے پُرانے اور بان

اور مستول کو تبدیل کرکے نئے بادبان اور مستول فراہم کرنے چاہییں لیکن مشکل یہ ہے کہ انہیں بحیرۂ روم کے سفر کا تجربہ ہو تو ہو، بحیرۂ عرب کے بحران و تلاطم سے یہ بیگانۂ محض ہیں۔ انہیں اس کا کوئی علم ہی نہیں کہ پانی کہاں کتنا گہرا ہے اور متلاطم موجوں کے ابھرنے اور بلند ہونے کا وقت کیا ہے اور اس کے لیے کن تدابیر کو عمل میں لانا چاہیے۔ انہوں نے کشتی کے ساز و سامان کو درست کرنے کے لیے شاطر مغرب کی جس دکان سے سودا کرنا چاہا ہے وہ طوفان حوادث کی بلاانگیزیوں میں زیادتی کا موجب تو ہو سکتا ہے، ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

ان کے برعکس چند انتہا پسند اور پرجوش لوگ ہیں جنہوں نے کشتی کے پرانے تختوں کو بدل کر ان کی جگہ نئے تختوں کا انتظام کیا ہے اور اس میں اس قدر جدت طرازیوں سے کام لیا ہے کہ سفینہ کی وضع و قطع اور ہیئت و صورت بالکل ہی نئی اور نرالی ہو گئی ہے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دین کی وہی قدیم کشتی ہے جس نے سینکڑوں طوفانہائے حوادث کا کامیاب مقابلہ کیا اور کروڑوں گم کردگانِ راہ کو نجات کے ساحل مقصود تک پہنچا کر شاد کام و فائز المرام بنایا۔

اس ہنگامۂ امید و بیم میں غریب مسافروں کا عجب حال ہے کچھ تو ایسے ہیں جنہوں نے ناخدا کے اس قیامت خیز تغافل کو دیکھ کر اس کشتی پر سوار ہونے کا ارادہ ہی فسخ کر دیا اور اپنے لیے کارخانۂ فرنگ کے بنے ہوئے نئے جہازوں کا انتخاب کر لیا ہے۔ کچھ ہیں جو خدا کا نام لے کر اس کشتی پر سوار تو ہو گئے ہیں لیکن ان کے دل کشاکش یاس و امید کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ چند اصحاب ایسے ہیں جنہوں نے اپنے سر رشتۂ امید کو دوسرے ناتجربہ کار ملاحوں کے ہاتھوں میں دیدیا ہے لیکن آگے پہنچ کر وہ بھی گردابِ بلا میں چکر لگا رہے ہیں، اور اپنی اس عجلت پسندی پر انتہائی نادم و شرمسار ہیں، کچھ ہیں جو غرق ہو گئے ہیں اور جو بچ رہے ہیں وہ امواجِ حوادث کے تھپیڑوں میں گھر جانے کے باعث ساحلِ مقصود تک پہنچ

کی امید ختم کر چکے ہیں۔

ایک طرف پرانی کشتی کا حال یہ ہے اور دوسری جانب "زایانِ فرنگ" نے بڑے طمطراق کے ساتھ ایک عجیب غریب جہاز تیار کیا ہے جس کا کپتان نہایت چست و چالاک اور بدرجۂ غایت ہوشیار ہے، اس کے پاس آلات بھی نئے نئے ہیں جن کے ذریعہ پانی کی گہرائی معلوم کی جاسکتی ہے جہاز کی مقدار حرکت اور اسکی مسافت کی پیمائش بھی ہو سکتی ہے۔ سمندر کتنا ہی عمیق ہو اور رات کتنی ہی تیرہ و تار، جو جگہ جگہ لائٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں، وائرلیس لگے ہوئے ہیں، ستارہ شناسی اور سمت معلوم کرنے کے آلات موجود ہیں، جہاز پر پالش بھی بہت دلفریب اور دلآویز ہے اور وزن کے اعتبار سے بھی وہ اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ سمندر کی پُرشور موجیں اس سے ٹکرا ٹکرا کے فنا ہو جاتی ہیں۔ پس ان حالات میں کیا پرانی کشتی کے ناخداؤں اور پاسبانوں کا فرض نہیں ہے کہ وہ اٹھیں اور ہر ممکن سے ممکن کوشش کے ذریعہ اس متاع قدیم و گرانمایہ کے تحفظ و بقا کا انتظام کریں

"الکنایۃ ابلغ من التصریح" ہمیں جو کچھ کہنا تھا اُسے مختصراً استعارہ و تشبیہ کی زبان میں ادا کر دیا گیا ہے۔ آپ کی چشمِ فراست و فطانت اگر ان کنایات کے باریک نقاب میں واضح حقائق کے روشن چہرہ کو دیکھ سکتی ہے تو دیکھیے اور سوچیے کہ ہم کس جہاز کے مسافر ہیں، کس راہ پر چل رہے ہیں۔ کن کن دشواریوں سے مقابلہ کرنے کا خطرہ ہے، اور بنام خدا جو ہماری ملاحی کے فرائض انجام دے رہے ہیں وہ کس حد تک اس بحرِ پرآشوب میں کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔

ان حالات کا صحیح احساس ہی ندوۃ المصنفین دہلی کو جس کا خصوصی مجلّہ یہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، عالم وجود میں لانے کا باعث ہے۔ اس ادارہ کے اغراض و مقاصد

پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے پیش نظر اس وقت چار اہم کام ہیں:-

(۱) قرآن مجید کی انگریزی اور اُردو تفسیر ایسے انداز میں لکھنی کہ قرآن کا صحیح مفہوم اور اُس کی تعلیمات حقہ اُن لوگوں کے ذہن نشین ہوسکیں جو واقعی طور پر راہِ حق کے متلاشی ہیں لیکن مغربی علوم وفنون کی سحرکاریاں انہیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں۔

(۲) فقہ اسلامی کی ترتیب وتدوین اس طرح کرنی کہ تمدن جدید نے جو انسانی زندگی کے بعض مخفی گوشوں کو بے حجاب کرکے نئے نئے مسائل پیدا کردیے ہیں اُن کے لیے قرآن وسنت اور اجماع اُمت وقیاس کی روشنی میں اسلامی نقطۂ نظر کی صاف وصریح وضاحت وتشریح ہوجائے۔ اسی دفعہ کے ماتحت تحریکات جدیدہ اور اسلام پر کتابیں شائع کرنا بھی ادارہ کے اہم مقاصد میں سے ہے

(۳) غیر مسلم اہل قلم اسلامی تاریخ اور اُس کی روایات کے متعلق جو ریسرچ کی آڑ میں مکروہ پروپاگنڈہ کرتے رہتے ہیں اُن کی موثر اور سنجیدہ تردید کرنی۔

(۴) مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے ایسا مکمل نصاب تعلیم تیار کرنا جو اسلامی تعلیمات کے مطابق اُن کی صحیح دماغی نشوونما کا کفیل ہو اور ساتھ ہی امور معاشی میں اُن کی کامیابی کا ضامن۔

ان میں سے اوّل کے دو کام تو ایک دو برس کے نہیں بلکہ سالہا سال کے ہیں جن کا سلسلہ اب شروع ہوکر اُس کے اختتام تک جاری رہیگا۔ بقیہ نمبر ۳ و ۴ کے ماتحت کتابیں تیار ہورہی ہیں اور خدا کے فضل وکرم پر بھروسہ کرکے کہہ سکتے ہیں کہ ایک سال کے اندر اندر ہم آپ کو کم سے کم چار کتابیں دے سکینگے۔ اس وقت جو کتابیں تیار ہیں اور جن کی کتابت شروع ہونے والی ہے، اور جو لکھی جارہی ہیں اور عنقریب پایۂ تکمیل کو پہنچ جائینگی اُن کے نام یہ ہیں:-

(۱) تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ از مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند۔

(۲) اسلام کا نظریہ سلطنت۔ از مولانا حامد الانصاری غازی

(۳) تفسیر قرآن مجید اور اسرائیلیات۔ از مولانا محمد ادریس میرٹھی

(۴) الرّق فی الاسلام۔ از سعید احمد اکبر آبادی۔

ان میں سے پہلی اور چوتھی کتاب تیار ہے اور بقیہ لکھی جا رہی ہیں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین اور مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین فقہ کی ترتیب و تدوین اور تفسیر کی اہم خدمت انجام دینگے لیکن یہ کام برسوں کا ہے اس لیے برابر جاری رہیگا اور اس اثنا میں یہ دونوں بزرگ مختلف عنوانات پر گرانقدر تصنیفات پیش کرنے کا کام ضمنی طور پر انجام دیتے رہینگے۔

کسی ادارہ کی کامیابی کے لیے دو چیزیں شرط اولین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک ارکانِ ادارہ کی اس کام کے لیے اہلیت و صلاحیت اور دوسری چیز جو عملاً اس سے بھی زیادہ ضروری ہے وہ کارکنوں کا خلوص وللہیت ہے۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو مخلصین اس ادارہ سے وابستہ ہیں وہ اگرچہ نوجوان ہیں لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے تعلیمی یا صحافی اداروں سے وابستہ رہ کر علم و مذہب کی مفید خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اور اب اسلامی ضرورتوں کے احساس قوی نے سب چیزوں سے کنارہ کش کرکے اُن کو ایک اہم مرکز پر جمع کر دیا ہے۔ انہوں نے اب تک کوئی شاندار تصنیفی کارنامہ پیش نہ کیا ہو لیکن ان لوگوں کی اہلیت و صلاحیت سے مسلمانوں کا مذہبی طبقہ ایک بڑی حد تک واقف ہے۔ کارکنان ادارہ میں بحمداللہ علوم اسلامیہ دینیہ کے ماہر بھی ہیں اور وہ بھی ہیں جو اسلامی علوم کی سندات کے ساتھ ساتھ تعلیم جدید کی اعلیٰ ڈگریاں بھی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ ان میں انگریزی کے علاوہ جرمنی زبان کے ایک ماہر بھی شریک کار ہیں جو اسلامی علوم و فنون پر جرمنی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی خدمت انجام دینگے۔ یہ صاحب ہمارے دوست

مسٹر سید مغنی الدین شمسی ایم اے ہیں۔

رہی دوسری چیز یعنی خلوص وللہیت، تو اس کا تعلق قلب سے ہے اور سوائے خدائے بصیر و خبیر کے کوئی اُسے محسوس نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس وقت نہ ہم آپ کو اس کا یقین دلا سکتے ہیں اور نہ آپ سے کہتے ہیں کہ یقین کر لیجیے، صرف درخواست اتنی ہے کہ اگر آپ ہم پر اعتماد واعتبار کا اظہار نہیں کرتے تو اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کے پیش نظر کم از کم یہ تو کیجیے کہ ادراے زمانہ پر قیاس کر کے ہماری نیتوں اور ارادوں کو اپنے شوق طعن وتشنیع کا نشانہ نہ بنائیے۔ اگر ہمارے عزائم میں خلوص اور نیتوں میں للہیت ہے تو آپ لاکھ نہ چاہیں خواہی نہ خواہی آپ کو ہماری کوششوں کی داد دینی پڑیگی اور ان خدمات کا اعتراف کرنا ہوگا بس ضرورت اس کی ہے کہ آپ چند دنوں تک خاموش رہیں اور نتائج کا انتظار کریں۔ وَمَا تَوْفِيقُنَا اِلَّا بِاللّٰهِ وَعَلَيْهِ التُّكْلَانُ وَهُوَ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ۔

اس موقعہ پر بیاختہ ہم کو اپنے اُستاذ حضرتنا العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ قدس اللہ سرہٗ کی یاد آرہی ہے جو علوم وفنون کے بحر ذخار ہونے کے ساتھ اپنے پہلو میں بدرجہ غایت حساس وبیدار دل رکھتے تھے اور مغربی علوم کی حشر سامانیوں اور تہذیب وتمدن جدید کی بلاخیزیوں کا تذکرہ دردناک لہجہ میں کر کے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں اگر تم علم ومذہب کی خدمت ہندوستان میں رہ کر کرنی چاہتے ہو تو اُردو تحریر میں کمال پیدا کرو اور انشا کے جدید طرز میں مہارت حاصل کرو۔ حضرت اقدس نے اپنی تصنیف وتالیف کے لیے ہمیشہ عربی زبان کو اختیار فرمایا لیکن زمانہ کے حالات کو بدلتا ہوا دیکھ کر اپنے خدام کو تاکید کرتے تھے کہ اُردو زبان میں کمال حاصل کریں، اور علماء پر بالعموم اُردو زبان میں کوتاہ قلم ہونے کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے اُس کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالیں۔ ہم اس وقت ایک خارزار میں قدم رکھ رہے ہیں لیکن ہمیں قوی اُمید ہے کہ اولاً خدائے قدوس کے فضل وکرم اور ثانیاً حضرت اُستاذ کا فیضانِ روح ہمارے لیے خضر راہ ثابت ہوگا۔ ہمارے تمام ولولے، اُمنگیں، ارادے اور حوصلے اصل

یہ ہے کہ یہ سب کے سب حضرت استاذ کے سرچشمہ فیض ہی کا ثمرہ اور انہی کی پیدا کی ہوئی روح کا نتیجہ ہیں۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

ڈاکٹر اقبال مرحوم

وا دیغا! دو سال کی طویل علالت کے بعد اسلام کے مایۂ ناز فرزند ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بتاریخ ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء لاہور میں انتقال فرمایا، اور ہماری بزم علم و حکمت کو خالی چھوڑ کر رہگزائے عالم جاودانی ہوگئے اقبال کا وجود عشق رسول کا پیکر تھا۔ آخر عمر میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ جہاں "مدینہ" یا آقائے مدینہ کا ذکر آیا اور بیساختہ رونے لگے ان کی شاعری علم و حکمت کے انمول موتیوں کا خزانہ اور اُنکی زبان حقیقت و معرفت ربانی کی ترجمان تھی ان کا قلب اسلامی سوز و گداز سے معمور اور ان کا دماغ حب اسلام کے نشہ سے مخمور تھا وہ اگرچہ انگلینڈ اور جرمنی کی اعلیٰ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے لیکن خمستان حجاز کی جس بادہ ہوش ربا کے چند جرعے اُنھوں نے اپنی طفولیت کے ابتدائی دنوں میں لے لئے تھے اس کا نشہ کم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھتا ہی گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی سرتاپا اسلامی سوز و گداز بن کے رہ گئی اقبال نے اسلام کے دور عروج و تنزل کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا اور ان کی شاعری میں اسلام کے روشن مستقبل سے متعلق بہت کچھ اُمید افزا خیالات پائے جاتے ہیں اقبال نے اپنا ترانہ اس وقت چھیڑا جبکہ ہنگامہ غدر کے اثرات مابعد سے مسلمانوں پر انتہائی جمود و خمود کا عالم طاری تھا۔ اور انکے قومی و ملی احساسات پامال ہوچکے تھے اقبال نے اپنے حیات آفریں نغموں سے اس دل شکستہ قوم کو اُبھارا اور زندگی کے احساس سے پھر انہیں پور کردیا

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی وفات حسرت آیات کا صدمہ ہمیں اس لئے بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ آں مرحوم میں اور ہمارے استاذ حضرت شاہ صاحبؒ میں ایک خاص قلبی ارتباط تھا۔ ڈاکٹر صاحب علوم اسلامیہ میں حضرت شاہ صاحب کو اپنا مرشد و رہنما جانتے تھے اور دل و جان سے اُن کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ خطبات مدراس جو "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کے نام سے شائع ہوچکے ہیں اُنیں

ڈاکٹر صاحب نے حضرت شاہ صاحب سے اپنے علمی استفادہ کا برملا اعتراف کیا ہے اُدھر حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ ڈاکٹر صاحب کی علمیت لیاقت، اسلام پرستی و نفز منشی کی قدر کرتے تھے اور دونوں میں مراسلت کا سلسلہ جاری تھا۔ دیوبند سے حضرت شاہ صاحب کی علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح حضرت مرحوم لاہور میں مستقل قیام کرنا منظور فرمالیں لیکن چند در چند موانع کے باعث ایسا نہ ہوسکا

حضرت شاہ صاحب سے اس خاص تعلق کے علاوہ ندوۃ المصنفین جن اغراض و مقاصد کے ماتحت قائم ہوا ہے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ان سے خاص دلچسپی تھی اور اپنی گفتگو میں ان کی اہمیت کو بڑے زور سے بیان کرتے تھے، علی الخصوص فقہ کی جدید ترتیب و تدوین کا مسئلہ اُنکی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور حضرت شاہ صاحب سے بھی بارہا اس کا تذکرہ کرچکے تھے اس بنا پر ندوۃ المصنفین کے ابتدا قیام سے ہی ہمارا ارادہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنے ادارہ کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل کریں اور ہمیں قوی توقع تھی کہ آں مرحوم ہماری اس خواہش کو مسترد نہ کرتے۔

صد حیف کہ ابھی ہم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے لاہور کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اچانک ان کی وفات کی اطلاع آگئی اور ہمارا یہ منصوبہ دل کا دل ہی میں رہ گیا

وما كان قيس هلكه هلك واحد　　ولكنه بنيان قوم تهدما

حق تعالےٰ انہیں غریق رحمت کرے اور اپنی بیش از بیش نعمتوں سے نوازے۔ آمین ثم آمین

حضرت مولانا سید سراج احمد رشیدی مرحوم

اس سلسلہ میں ہم کو اپنے استاذ حضرت مولانا سید سراج احمد رشیدی کا بھی ماتم کرنا ہے۔ حضرت مولانا دیوبند کے قدیم اساتذہ میں سے تھے۔ القاسم کے دور اول میں اس کی ادارت کے فرائض آپ سے متعلق تھے صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ صاحب باطن تھے حضرت مولانا گنگوہی سے نسبت حاصل تھی بیحد ذاکر شاغل، وضع کے پابند، اخلاق و مروت کا مجسمہ، بزرگانہ خصائل و شمائل کے پیکر، طلبہ کے مونس و غمخوار

دوستوں کے جاں نثار دوست اور چھوٹوں کے مشفق وشفیق بزرگ تھے۔ دیوبند میں عرصہ دراز تک مشکوٰۃ شریف کا خصوصاً اور ادب وفقہ کی اعلیٰ کتابوں کا عموماً درس دیتے رہے ۱۳۴۶ھ میں حضرت الاستاذ علامہ سید محمد انور شاہ اپنی جماعت کے ساتھ دیوبند سے ڈابھیل منتقل ہوئے تو آپ بھی اس کارواں کے بزرگان کارواں میں سے ایک تھے حدحیف کے وہاں تقریباً دس سال تک علم حدیث کی خدمت جلیلہ میں منہمک رہے کے بعد آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے دنی کو ہمیشہ کیلئے الوداع کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی صورت دیکھکر بزرگان سلف کی یاد تازہ اور آپ کی باتیں سنکر قلب ودماغ کو خاص مسرت محسوس ہوتی تھی۔ آپ عالم کامل تھے، ادر شاعر خوشنوا بھی، آپ علم حدیث وادب کے مدرس بھی تھے اور خوش بیان وبذلہ سنج بھی، سنجیدہ ظرافت آپ کی باتوں کا جوہر تھی ایک عرصہ سے دمہ کے عارضہ میں مبتلا تھے لیکن اس کے باوجود تہجد اور وظائف کی پابندی کرتے تھے۔

خاتمہ بھی ایسا اچھا ہوا کہ خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے، خاص بقرعید کے دن عصر ومغرب کے درمیان جبکہ دنیائے اسلام میں ہر جگہ قربانیاں ہوئی ہونگی آپ نے اپنی جان ناتوان کی قربانی رب السماء والارض کی بارگاہ کبریائی میں بڑی ہنسی خوشی کے ساتھ پیش کی اور رفیق اعلیٰ کا کلمہ پڑھتے ہوئے بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کردی جو احباب ومخلصین دم نزع آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک مسافر عالم دنیا سے رخصت نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رحمت ربانی کی آغوش نے وا ہو کر اسکو اپنی عاطفت میں لیلیا ہے اور وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے کرتے دوسرے ہی عالم میں پہنچ گیا ہے حق تعالیٰ انہیں علی علیین میں مقام عنایت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔ آمین

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

ہماری مرثیہ خوانی ناتمام رہیگی اگر اس موقعہ پر ہم نے ایک اور ذات گرامی یعنی مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا ذکر نہ کیا۔ مولانا ہندستان کے مشہور مورخ تھے لیکن جدید طرز کے نہیں بلکہ قدیم طرز کے وہ راسخ

مضبوط اسلامی عقیدت کی رہنمائی میں تاریخ کی قابل قدر خدمات انجام دینی چاہتے تھے اُن کی تصنیفات آئینۂ حقیقت نما تاریخ اسلام، مقدمۂ تاریخ ہند، نظام سلطنت، حجۃ الاسلام فیصل الخطاب اور معیار العلماء وغیرہ یہ سب اُن کے مذہبی جوش و دینی عقیدت کی شاہد عدل ہیں۔ مرحوم نہایت فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے ان کا اثاثہ بیت صرف ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا جس میں فارسی کی، زیادہ اور عربی کی کم تاریخ کی نادر قلمی کتابیں موجود ہیں مرحوم انتہا درجہ کے خود دار اور غیور رہتے تھے انھوں نے اپنی تمام عمر انتہائی افلاس وعسرت کے ساتھ ایک گوشۂ گمنام میں گذاری اور کبھی گوارا نہ کیا کہ ارباب ثروت کے آستانہائے عظمت و غرور پر جبہ سائی کر کے علم کی متاع لازوال کو رسوا و ذلیل کریں حالانکہ اگر وہ چاہتے تو امارت و ریاست کی دکان پر اپنے مذہبی تقدس اور علم کی فاتحہ پڑھنے والوں کی طرح ہزاروں رُپے ماہوار کما سکتے تھے۔ آں مرحوم ہوبہو اسلامی اخلاق کا مجسمہ تھے۔ نہایت متواضع حلیم و بردبار، صاف باطن، مروت کیش، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کرنے والے۔

اپنے والدین کے اس درجہ اطاعت گذار اور فرمانبردار تھے کہ اس قدر علم و فضل کے باوجود اپنے تئیں والدین کا ادنیٰ سے ادنیٰ خادم تصور کرتے تھے، عربی میں عُلّس والدین کی اطاعت میں ضرب المثل ہے۔ کہا جاتا ہے ھو اَبَرُّ من عُمَلّس ہماری رائے میں اگر عُلّس کی بجائے مولانا کا نام رکھدیا جائے۔ تو بالکل بجا و درست ہے۔

افسوس ہے کہ نوماہ کی طویل علالت کے بعد ہماری بزم علم و فضل کا یہ لعل شب چراغ بھی ۱۰ ار مئی ۱۹۳۰ء کو قیامت تک کے لئے گل ہوگیا۔ امطر اللہ علیہ شآبیب الرحمۃ والغفران، واسکنہٗ فی فرادیس الجنان۔

سحر و صابئیت تاریخ کی روشنی میں

(۱)

(از مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی فاضل دیوبند)

صاحب مقالہ تفسیر قرآن مجید اور اسرائیلیات" کے عنوان سے ندوۃ المصنفین کے لئے جو کتاب ترتیب دے رہے ہیں اور جس کا ایک معتدبہ حصّہ مکمل ہو چکا ہے ذیل کا مضمون اس کا ایک باب ہے۔ قارئین کرام کو اس کے مطالعہ سے اصل کتاب کے متعلق ایک عام اندازہ ہوسکیگا۔ (برہان)

وَلٰکِنَّ الشَّیَاطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا یُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَا اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَکْفُرْ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ

بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ یہ لوگوں کو سحر سکھلاتے ہیں اور وہ (جادو) سکھلاتے ہیں جو بابل میں ہاروت، اور ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ نہیں سکھلاتے کسی کو یہاں تک کہ کہہ دیتے کہ "ہم تو صرف آزمائش کیلئے ہیں لہذا تو کافر مت ہو" پس لوگ سیکھتے ان دونوں سے وہ جس سے جدائی کرا دیتے مرد اور اس کی بیوی میں

سحر عربی زبان کا ایک لفظ ہے اس کا ایک واقعی مفہوم و مصداق ہے یہ اپنی جگہ پر طے ہو گا کہ وہ واقعی ہے یا تخیلی، ہر زبان میں اس کے لئے ایک مستقل لفظ ہے اُردو اور ہندی میں اسے جادو کہتے ہیں، فارسی میں افسوں، انگریزی میں (Spell) کہتے ہیں

ہر ملک اور ہر قوم میں سحر اور اس میں منہمک رہنے والی ایک جماعت بلا تفریق ملت و مذہب پائی گئی ہے جن کو جادوگر اور ساحر وغیرہ کہتے ہیں، عرب میں یہودی، مصر میں قبطی شام و

عراق میں قبطی، ہندوستان میں بنگالی جادوگر مشہور و معروف ہیں۔ سحرِ بابل تو تمام دنیا میں ضرب المثل ہے۔

سحر ایک فن ہے اس کی تعلیم و تدریس کے لئے خاص خاص ادارے، اور اساتذۂ فن پائے گئے ہیں، بابل سحر کی سب سے پہلی درسگاہ تھی اور بابلی اقوام اس فن کے معلم اول ہیں مصر میں اب تک سحر و طلسمات کے آثار باقیہ موجود ہیں، دوسرے فنون کی طرح وہ باقاعدہ مدون ہوا اور اس پر کتابیں لکھی گئیں، علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں سحر و طلسم، نیرنگ اور شعبدہ وغیرہ پر مفصل بحث کی ہے اور اس کے ارتقار وانحطاط، مدونین واساتذہ، تصنیفات و تالیفات کے مفصل احوال بیان کیے ہیں[5]۔

سحر کے خصوصی امتیازات سحر عام طور پر ناجائز اغراض و مقاصد اور انسانی قدرت و اختیار سے خارج ضرر رساں کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے، خبیث الفطرۃ شریر النفس لوگ ہی اس خباثت میں حصہ لیتے ہیں چنانچہ حکمائے فلاسفہ کے یہاں سحر اور معجزہ میں مابہ الامتیاز یہی ہے

وجود المعجزة لصاحب الخير وفي مقاصد الخير وللنفوس المتمحضة للخير والتحدی بها علی دعوی النبوة والسحر انما يوجد لصاحب الشر وفي افعال الشر فی الغالب من التفريق بين الزوجين وضرر الاعداء وامثال ذلك وللنفوس المتمحضة للشر۔ (مقدمہ ابن خلدون، باب السحر)	معجزہ ہمیشہ اہل خیر سے ظاہر ہوتا ہے اور نیک مقاصد میں مستعمل ہوتا ہے اور ایسے ہی نفوس قدسیہ سے ظاہر ہوتا ہے جو فطری طور پر صرف نیکی کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور اس سے دعویٰ نبوت کی تصدیق کیجاتی ہے۔ سحر ہمیشہ اہل شر میں پایا گیا ہے اور بُرے کاموں میں مستعمل ہوا ہے عام طور پر تفریق زوجین، ضرر اعدار وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے اور وہ ہی نفوس خبیثہ کرتی ہیں جو فطری طور پر برائی کیلئے پیدا ہوئے

---

[5] حقیقت سحر کی مفصل بحث اصل کتاب میں مذکور ہے۔

السحر انما یظهر من نفس شریرة — سحر صرف شریر نفوس سے ظاہر ہوتا ہے

(دستور العلماء حرف س)

سلیم الفطرت انسان ہمیشہ ساحر کو موذی اور اس کے اعمال کو خلق اللہ کے لئے ایذا رساں سمجھتے ہیں۔ تمام آسمانی مذاہب اور شریعتیں جادوگری کو برا اور موجب کفر قرار دیتی ہیں۔ مذاہب باطلہ بھی اس کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے برا جانتے ہیں، علمائے مذاہب اور ارباب حکومت دوسرے مفسدین کی طرح ان کے استیصال اور بیخ کنی کی فکر میں رہتے ہیں، قدرت ہوتی ہے۔ تو سزائیں دیتے ہیں، عامۃ الناس کو روکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس کسی زمانہ میں شرائع سماویہ اور توحید و رسالت کا غلبہ ہوا ہے یہ علوم متروک ہو گئے ہیں۔

ولما کانت هذه العلوم مهجورة عند الشرائع لما فیها من الضرر ولما یشترط فیها من الوجهة الی غیر اللہ من کوکب وغیرها کانت کتبها کالمفقودة بین الناس الا ما وجد فی کتب الاقدمین مما قبل نبوت موسیٰ علیہ السلام مثل النبط والکلدانیین — چونکہ یہ علوم تمام مذاہب کے نزدیک متروک تھے اس لئے کہ ان میں ستارہ وغیرہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور امداد حاصل کرنا پڑتا ہے لہذا اس کی کتابیں لوگوں میں مفقود سی ہو گئی ہیں بجز ان متقدمین کی کتابوں کے جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے گذرے ہیں مثلاً نبطی، کلدانی وغیرہ

(مقدمہ)

الساحر لا یامر الا بما هو خلاف الشرع و الملة (دستور العلماء) — ساحر ایسی ہی چیزوں کا حکم کرتا ہے جو شریعت اور مذہب کے مخالف ہو

سحر شیاطین جن و انس کا اختراع ہو | قرآن حکیم کا یہ فیصلہ ہے کہ کفر و شرک، بت پرستی، ہوا پرستی اور عام سرکشی و نافرمانی کا محرک اول ابلیس لعین اور اس کی ذریت شیاطین جن ہیں یہ خلق اللہ کو معاصی

اور سیئات کا سبز باغ دکھا کر گمراہیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں نفس امارہ ان کی راہ پر لبیک کہتا ہے۔ اب اگر قوت ملکیہ اور فطرت سلیمہ غالب ہوتی ہے اور توفیق الٰہی شامل حال تو انسان اس دام تزویر سے بچ جاتا ہے اور اگر بہیمیت کا غلبہ اور نفس امارہ کا تسلط ہوتا ہے تو گرداب ضلالت میں غوطے کھانے لگتا ہے شیاطین اور ہوائے نفس کے پھندے میں پھنس کر خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنتا ہے یہ شیاطین اور نفس اس کو راندۂ درگاہ بناتے ہیں اور نئے نئے معاصی میں مبتلا کرتے ہیں یہ ہے فلسفۂ اثم و معصیت جس کو قرآن نے جا بجا بیان فرمایا ہے۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ　　　شیاطین نے کفار کی نظروں میں ان کے اعمال کو آراستہ کردیا

إِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ　　　شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں باتیں ڈالتے ہیں

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ　　　شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ　　　بیشک نفس بکثرت برائیوں کا حکم کرنے والا ہے۔

لہٰذا شرک و کفر اور بت پرستی کی طرح اس لعنت میں بھی دنیا کو انہی شیاطین نے مبتلا کیا ہے اعمال سحر لوگوں کو سکھاتے ہیں اور ترکیبیں بتاتے ہیں لوگ ان پر عمل کرتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم سحر کا معلم اور پروپیگنڈہ کرنے والا انہی شیاطین کو قرار دیتا ہے۔

وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ　　　بلکہ شیاطین نے کفر کیا کیونکہ یہ لوگوں کو جادو سکھلاتے ہیں اور یہودیوں نے

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ۔　　　اس سحر کی پیروی کی جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کے نام سے پھیلاتے تھے

حقیقت سحر کی تحقیق اور اعمال سحر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ سحر کی وہ قبیح ترین قسم جس کو قرآن حکیم نے کفر سے تعبیر کیا ہے اور اس کو سکھلانے والے شیاطین کو کافر قرار دیا ہے اس کا جزو اعظم شیاطین جن، ارواح خبیثہ، کواکب و اصنام کی استعانت ہے، ساحران کو خوش اور مطیع بنانے کے لیے ان کی حسب منشاء کلمات کفر و شرک کہتا ہے خوفناک قسم کی قربانیاں اور چڑھاوے چڑھاتا

سے حیوان اور انسان کے خون، بول و براز اور اسی قسم کی پلید چیزوں کی بھینٹ دیتا ہے، ان سے تقرب اور مناسبت حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے سجدے کرتا ہے ہاتھ جوڑتا ہے دعائیں اور منتر پڑھتا ہے، شراب، مُردار جانور اور خنزیر وغیرہ کا گوشت اور اسی قسم کی خبیث چیزیں استعمال کرتا ہے۔ ناپاکی کی حالت میں رہتا ہے تاکہ وہ ارواح خبیثہ اور شیاطین خوش ہو کر اس کے حسب منشا کام کرنے لگیں اور اس کے تابعدار ہو جائیں، پھر ان اعمال اور ان کی تجدید کے خاص خاص زمانے ہوتے ہیں انہی میں وہ اعمال کیے جاتے ہیں۔

الساحر یفسق و یتصف بما ھو رجس فربما لا یغتسل من الجنابۃ ولا یستنجی من الغائط ولا یطھر الثیاب الملبوسۃ بالنجاسات لان لہ تاثیرا بلیغا بالاتصاف بتلک الامور

جادوگر بدکار فاسق ہوتا ہے۔ ناپاک رہتا ہے بسا اوقات ناپاکی کا غسل نہیں کرتا پاخانہ سے آکر استنجا نہیں کرتا نجس پہنے ہوئے کپڑوں کو پاک نہیں کرتا کیونکہ سحر و طلسمات میں ان چیزوں کو خاص دخل ہے۔ (دستور العلماء جزو ثانی)

علامہ ابن خلدون سحر کو ایک شقیہ ریاضت قرار دیتے ہیں، اور اس کے اعمال پر تبصرہ کرتے ہیں۔

و ریاضۃ السحر کلھا انما تکون بالتوجہ الی الافلاک والکواکب والعوالم العلویۃ و الشیاطین بانواع التعظیم والعبادۃ والخضوع والتذلل فھی لذلک توجہ الی غیر اللہ و سجود لہ والوجھۃ لغیر اللہ کفر فلھذا کان السحر کفراً

تمام جادوگری کی مشق اور ریاضت صرف اس طرح ہوتی ہے کہ آسمانوں ستاروں اور عالم روحانیات اور شیاطین کی طرح طرح تعظیم و تکریم، عبادت و پرستش، عاجزی و زاری کی جائے اسی لیے سحر غیر اللہ کی طرف جھکنے اور پرستش کرنے کا مرادف ہے اور ظاہر ہے کہ غیر اللہ کی طرف جھکنا کفر ہے لہذا سحر کفر ہے۔

علامہ موصوف مغرب کی ایک جادوگر قوم بعاجین سے ملے ہیں ان کے جادو اُنہوں نے

دیکھے ہیں وہ اُن کا بیان نقل کرتے ہیں ۔

واخبرنی ان لھم وجھۃ و ریاضۃ خاصۃ	اور اُنہوں نے مجھے بتلایا کہ ہمارے ہاں خاص قسم کی توجہ
بدعوات کفریہ واشراک الروحانیات الجن	اور ریاضت ہے جس میں کفریہ دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔
والکواکب سطرت فیہا صحیفۃ عندھم تسمی	جن اور کواکب وغیرہ روحانیات کی پرستش کیجاتی ہے
الخزیریۃ یتدارسونھا وان بھذہ الریاضۃ	اور شرک وکفر کیا جاتا ہے ان اعمال کے متعلق ان کے پاس
والوجھۃ یصلون الی حصول ھذہ الافعال	ایک صحیفہ ہے جسے وہ خزیریہ کہتے ہیں وہ اُس کو پڑھتے پڑھاتے
لھم	ہیں اور اُنہوں نے کہا کہ اس ریاضت اور توجہ سے ہم
(مقدمہ ابن خلدون)	ان کاموں پر قدرت حاصل کرتے ہیں۔

لہذا سحر و طلسمات میں دنیا کو مبتلا کرنے والے صرف شیاطین اور ارواح خبیثہ ہیں دنیا کو اس قعر ضلالت کی طرف انہوں نے ہی راستہ بتلایا ہے اور کچھ نہیں تو اللہ کے ایک جلیل القدر نبی کے معجزات کو جعلسازیوں اور مکاریوں سے سحر بنا دیا اور اسی کے نام سے سحر سکھلایا۔

سحر کہاں سے آیا اور کس قوم کے تخیل دماغی کا نتیجہ ہے سحر کی اس اجمالی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے بہت آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ سحر دراصل سیارات و کواکب، اجرام علویہ و سفلیہ اور روحانیات کی پرستش کی پیداوار ہے یہ ایک نتیجہ ہے جو روحانیات اور کواکب کی پرستش پر مرتب ہوتا ہے۔ لہذا سب سے پہلے سحر کا وجود اسی قوم میں مل سکتا ہے جو سیارات اور روحانیات کی پرستار ہو۔

اس قوم کا کیا نام تھا؟ اس کے اعمال و معتقدات کیا تھے؟ یہ کہاں رہتے تھے؟ ان کا زمانہ عروج و ارتقا کونسا زمانہ تھا؟ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے کوئی نبی ان کی طرف مبعوث ہوئے یا نہیں؟ اس کے لیے ہمیں قرآن کریم اور تاریخ نیز آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تاکہ سحر کا زمانہ ایجاد اور اُس کے موجدین کی تاریخ سامنے آجائے۔

(۱) قرآنِ حکیم نے جن انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت وارشاد اور مخاطبات کا تذکرہ کیا ہے اُن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے عام قومیں بت پرست اور مشرک و نافرمان تھیں۔ حضرت نوح، ہود، صالح وغیرہ انبیاء کرام اُن کو توحید و رسالت اور ایمان کی دعوت دیتے تھے بت پرستی اور کفر و شرک سے روکتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے نبی ہیں جنہوں نے بت شکنی کے ساتھ ربوبیتِ کواکب کا طلسم بھی توڑا ہے، وہ ایک طرف اپنے بت پرست اور بت تراش باپ (یا چچا) آزر کو جو نمرود کے سب سے بڑے بتکدے کا داروغہ تھا، اور اُس کی قوم کو بت پرستی سے روکتے ہیں، اور اس بت پرستی کو شیطان پرستی قرار دیتے ہیں، اُن کے اصنام کی تحقیر کرتے ہیں۔

اذ قال ابراهيم لابيه آزر اتتخذ اصناما الهة انی اراك و قومك فی ضلال مبين،	جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم بتوں کو خدا بناتے ہو میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں
يا ابت لا تعبد الشيطان ان الشيطان كان للرحمٰن عصيا۔	اے میرے باپ تو شیطان کی عبادت مت کر بیشک شیطان اللہ رحمٰن کا نافرمان و سرکش ہے۔
اذ قال ابراهيم لابيه وقومه ما هٰذه التماثيل التی انتم لها عاكفون۔	جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا، یہ کیا مورتیں ہیں جن کو تم گھیرے ہوئے ہو۔

اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ محسوس طریق پر عملاً بت شکنی کی سنت قائم کرتے ہیں۔

فجعلهم جذاذا الا كبيرا لهم فقالوا من فعل هٰذا بالٰهتنا يا ابراهيم قال بل فعله كبيرهم هٰذا	پس ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا بجز ان میں سے سب سے بڑے بت کے اس کو رہنے دیا، پس اُنھوں نے کہا اے ابراہیم

فاسئلوھم ان کانوا ینطقون۔ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کس نے کیا، آپ نے فرمایا، بلکہ ان کے بڑے بُت نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ انھی سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں۔

دوسری طرف ربوبیت کواکب اور ستارہ پرستی کے تباہ کن عقیدہ کو اپنے بصیرت افروز احتجاج سے باطل فرماتے ہیں :۔

وکذلک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین فلما جن علیہ اللیل رای کوکبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین فلما رای القمر بازغا قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین، فلما رای الشمس بازغۃ قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما افلت قال یاقوم انی بریٔ مما تشرکون انی وجھت وجھی للذی فطر السموٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔

اور ہم نے اسی طرح ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمان و زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ کامل یقین رکھنے والوں میں سے ہوجائیں پھر رات ان پر طاری ہوئی تو اُنہوں نے ایک ستارہ کو دیکھا، آپ نے فرمایا، یہ میرا رب ہے، پس جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا، پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے، جب وہ بھی غروب ہوگیا تو فرمایا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی تو میں گمراہوں میں سے ہوجاؤنگا پھر جب آفتاب کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا، یہ ہے میرا رب یہ سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو فرمایا اے لوگو! میں تو اُس سے بیزار ہوں جس کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو، میں تو اپنا رُخ صرف اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، اور میں شرک کرنیوالوں میں سے نہیں ہوں

آیۃ کریمہ کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مشرک تھے مگر خدا کے منکر نہ تھے خدا کے ساتھ سیارات کو بھی "رب" کہتے تھے، ابراہیم علیہ السلام حَنیفیّت اور توحید خالص کی دعوت دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ اللہ کے سوا اور کوئی چیز ربوبیت کی اہل نہیں ہوسکتی۔

(۲) قرآن حکیم نے ابراہیم علیہ السلام کے خطابات و مکالمات کا متعدد مقامات پر تذکرہ کیا مگر کسی ایک مقام سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ بت پرست اور ستارہ پرست قوم کونسی قوم تھی، کہاں رہتی تھی، اس کا کیا نام تھا خطابات میں اذ قال ابراھیم لقومہ۔ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عاد، ثمود، اصحاب ایکہ، اصحاب حجر وغیرہ کی طرح ان کا کوئی نام ونسب نہیں بتلایا۔

لیکن اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے مذاہب باطلہ کی تردید کے سلسلہ میں جن ادیان کا ذکر کیا ہے ان میں ایک مذہب صابئیت بھی ہے، یہود، نصاریٰ اور مجوس کے دوش بدوش قرآن حکیم میں تین مقام پر صابئین کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والصابئین والنصاریٰ والمجوس والذین اشرکوا ان اللہ یفصل بینھم یوم القیٰمۃ	جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابئیں اور نصرانی اور مجوسی اور وہ جنہوں نے شرک کیا ہے بیشک اللہ قیامت کے روز اُن کا فیصلہ کردیگا۔

مگر کسی ایک مقام پر بھی صابئیت کی تفصیلات، اصول وعقائد کا ذکر نہیں، نہ کسی قوم پر صابئین کا نام لے کر تردید کی، نہ کسی نبی نے اس نام کے ساتھ کسی قوم کو مخاطب کیا اس لیے قرآن حکیم کے مطالعہ سے نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس قوم کا مذہب تھا، اس کا بانی کون تھا، کس زمانہ میں اور کہاں پیدا ہوا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ مومن ہیں نہ یہودی نہ نصرانی نہ مجوسی نہ مشرک بلکہ مستقل شخصیت رکھتے ہیں ان میں سے کسی ایک کے ضمن میں بھی نہیں آتے، نیز معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص قوم وملک کے ساتھ بھی مخصوص نہیں ہیں۔

اسی کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم بت پرستی اور کواکب پرستی کے ساتھ ساتھ فرشتوں اور جنوں کی پرستش کی بھی تردید کرتا ہے۔

وجعلوا للہ شرکاء الجن (انعام)	مشرکوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا۔

وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسباً (صافات) مشرکوں نے خدا میں اور جنوں میں رشتہ قائم کیا۔

دوسرے مقام پر ذرا تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے :-

یوم یحشرھم جمیعا ثم یقول للملٰئکۃ اھؤلاء ایاکم کانوا یعبدون؟ قالوا سبحانک انت ولینا من دونھم، بل کانوا یعبدون الجن اکثرھم بہ مؤمنون۔

جس دن اللہ پاک لوگوں کو قبروں سے اکٹھا کریگا پھر فرشتوں سے کہیگا تم ہی کو یہ پوجتے تھے؟ فرشتے کہینگے، تو پاک ہے تو ہی ہمارا آقا و مولیٰ ہے نہ وہ، بلکہ یہ جنوں کو پوجتے تھے اور اُن میں سے اکثر لوگ جنوں پر ایمان رکھتے تھے۔

اس فرشتہ پرست اور جن پرست قوم کا بھی کوئی نام و نشان نہیں بیان کیا گیا، نہ کسی خاص نبی کی دعوت میں اس کا ذکر ہے۔ قرآن حکیم از خود اس کی تردید کرتا ہے۔ اور اسی لیے صابئین کی تعیین کے بارے میں مفسرین، محدثین، مؤرخین اور ائمۂ لغت میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ تاہم اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صابئی وہ شخص ہے جو اپنا پہلا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرلے۔ ابتدا میں مشرکین عرب نے حلقہ اسلام میں داخل ہونے والوں کو یہی خطاب دیا تھا۔ صابئین کو اس لیے اس لفظ سے یاد کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے نوح علیہ السلام کے فطری دین کو چھوڑ کر ارواح کی پرستش شروع کر دی تھی۔

صابئیت دنیا کا سب سے پُرانا اور عالمگیر مذہب ہے۔ اس کا تعلق نبطی، سریانی، کلدانی، کسدانی اور بابل کی ان قوموں سے رہا ہے جن سے زیر نظر موضوع کا خاص تعلق ہے۔ انشاء اللہ ہم آئندہ فرصت میں صابئین، مذہب صابئیت، صابئیت کے اصولی عقائد کو پیش کرینگے اور علم و تحقیق کی روشنی میں ان عقائد سے پیدا ہونے والے طلسمات، سحر و کہانت، تعویذات و نقوش اور علوم و فنون پر بحث کرینگے۔

مُسلمانوں کی آمد ہندوستان میں

اسلام کی عالمگیر فتوحات کا ایک تاریخی باب

(از مولانا حامد الانصاری غازی)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد تاریخ کا ایک اہم باب ہے یہ باب انسانی تاریخ کے ارتقاء کے ساتھ اپنے لیے ایک مستقل وسعت پیدا کرتا رہا ہے۔ مسلمان دنیا کے قلب سے اُٹھے اور ایک شان امتیاز کے ساتھ آگے بڑھے۔ ایک طرف عرب کے ہرے بھرے نخلستانوں سے فیضیاب ہوئے اور دوسری طرف مغرب اقصیٰ کے دامنوں سے مردانہ وار گذرے۔ اسپین پہنچے تو اُنھوں نے "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کا اصول وضع کیا۔ اس ملک کو پاک، صاف مسجدوں، شائستہ درسگاہوں، آراستہ، پیراستہ محلوں، ترقی یافتہ نوآبادیوں، شفاخانوں اور صحت گاہوں، باغ و بہار اور گل و گلزار کی ایک رنگین و نزہت آئین جنت بنایا اور اس کا نام اندلس رکھا۔ اندلس سے قدم آگے بڑھائے تو فرانس کے پہلو میں "پیری نیز" کے سلسلۂ کوہ تک پہنچے۔

اسلام کی فتوحات کا یہ سلسلہ ایک طرف فرانس تک پہنچا تو دوسری طرف مشرق اور اقصائے مشرق کے بعید ترین گوشوں تک پہنچ کر بھی دنیا کے روکے نہ رُک سکا۔ مسلمانوں کی فاتح و مظفر فوج کا ہراول دستہ جب ارادوں کے اسلحے لے کر اُٹھا تو تمام دنیا کی فتح کی خبر لایا۔ اُس نے عرب سے چل کر شام پہنچ کر صبح کی، قدس سے انسانی معراج کی منزل دریافت کی۔ بحر روم کے مشرقی ساحل پر پہنچ کر صبحدم وہاں کے میٹھے سنگتروں کا رس چوسا، عراق کے دجلہ و فرات کا شیریں پانی پی کر تازہ دم ہوا اور آخر کار عجم کی راہ سے گذر اور

سنہ ھ پہنچ کر ہند کی سلطنت کے تخت پر اپنے قدم رکھنے میں کامیاب ہوا۔

ہندوستان میں زندگی و بیداری کے جو ستون منزل بمنزل قائم ہیں اُن میں سے ہر ایک کی لوح پر مسلمانوں کا نام نقش ہے۔ جب مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے تو وہ پردیسی تھے لیکن جب اُن کی فیروز بختی نے ان کی فتوحات کو مکمل کر دیا تو انہوں نے ہر ملک کی طرح اللہ کے اس ملک کو بھی اپنا ملک بنا لیا۔ انہوں نے بعد میں آنے والے فرنگیوں سے بالکل مختلف پالیسی اختیار کی۔ اس ملک کو تہذیب و تمدن کی نئی نعمتوں سے نوازا، اس کے چٹیل میدانوں میں چمن بندی کی، اس کی سلطنت کو منظم کیا، اس کے قانون کی تجدید تشکیل میں حصہ لیا، اُسے اخلاق کی تازہ دولت دی۔ ایک سادہ سمجھ میں آنے والا فطری مذہب عطا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس دیس کو اپنا دیس بنایا۔ مسلمان بھی انگریزوں اور آریوں کی طرح باہر سے آئے۔ انہوں نے اس ملک کی زندگی کے صاف چشموں بہتے ہوئے دریاؤں اور اوپر سے گرنے والے آبشاروں سے پانی پیا۔ وہ ساحل کے علاقوں۔ بت ھ کی راہوں اور خیبر کے دروازوں سے اس ملک کی وادیوں میں پہنچے اور یہاں پہنچ کر قدیم قوموں کی طرح رہنے سہنے لگے۔ جب وہ اس ملک میں تازہ دم فوجیوں اور مبلغ تاجروں کی حیثیت میں آئے تھے تو سینکڑوں اور ہزاروں سے زیادہ نہ تھے مگر اب جبکہ وہ اس ملک میں عام ملکیوں کی طرح صدیوں سے رہتے ہیں تو لاکھوں سے متجاوز کروڑوں ہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ ترقی۔

سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے برطانوی ہند کی ۹۵ فیصدی متمدن آبادی میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ ۶۵ لاکھ ہے۔ متفرق آبادی اور برما کی اسلامی مردم شماری اس سے علیحدہ ہے اور اس اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۸ کروڑ کے قریب پہنچتی ہے۔ مسلمان بالعموم اپنی آبادی کے متعلق نو کروڑ کا عدد استعمال کرتے ہیں۔ سرکاری مردم شماری میں فرقہ وارانہ رجحانات کے ماتحت مقررہ ضابطوں کے خلاف جو کارروائی ہوتی رہی ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے مسلمانوں کی آبادی کے متعلق یہ قیاسی اضافہ غلط نہیں ہے

سرکاری دفاتر نے ہندوستان کی آبادی کے متعلق جو آخری اندازہ شائع کیا ہے اُس میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ ہندوستان کی آبادی گذشتہ آٹھ سال میں ترقی کر کے ۴۰ کروڑ نفوس تک پہنچ چکی ہے۔ نئی نسل کے ان پانچ کروڑ انسانوں میں اگر دو کروڑ نہیں تو ایک کروڑ لازماً مسلمان ہونگے۔ قدرت نے مسلمانوں کو مردم شماری میں اضافہ کا جو سلیقہ دیا ہے اس میں سکھوں کے علاوہ ہندوستان کی اور کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی اسلام کی پر جوش تبلیغ اور دین قیم کی فطری کشش ہی مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کا کیا کم باعث تھی کہ پھر اُس پر مسلمانوں کے اخلاق فاضلہ جس پر بیگانے یگانے اور دشمن دوست بجائیں سونے پر سہاگہ ہوا۔

مسلمانوں نے جب ہندوستان کی زمین پر قدم رکھا تو وہ گنتی کے چند مبلغ مصلح اور تاجر تھے۔ ان کی فوجیں ہندوستان کی طرف پہلی بار حق کا نام لے کر ایک نیک مقصد سے آگے بڑھیں تو فوجیوں کی تعداد چھ ہزار[1] سے زیادہ نہ تھی۔ مسلمان سلاطین کا عہد ترقی کے اعتبار سے اگر مایوس کن نہ تھا تو کچھ امید افزا بھی نہ تھا۔ مسلمانوں نے انگریزی غلامی کے عہد میں مردم شماری کی جو بہار دیکھی وہ آزادی کے اُس عہد میں نظر نہ آسکی جو غیر مسلم مورخین کی رائے میں "اسلام کی حکومت اور تلوار" کا زمانہ تھا۔

اگرچہ ہندوستان میں انگریزی عہد حکومت کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز اُنیسویں صدی کے تیسرے ربع کے آخر میں ہوا تاہم جب مرہٹوں کی طاقت پارہ پارہ ہوگئی۔ مسلمانوں کی سلطنت کا زوال مکمل ہوگیا۔ مغل قلعہ کے ایوان خاص کے بے نور فانوس کی جگہ انگریزی قمقمے تجلیل کرنے لگے اور ۱۸۱۸ء میں ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا مکمل تسلط قائم ہوگیا تو اس وقت مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ[2] سے زیادہ نہیں تھی مسلمانوں نے اپنے عہد میں "صدیوں تک تلوار چمکانے" مورخین کے ایک متعصب طبقے کے خیال کے مطابق "ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کرنے، ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنانے اور ہندوستان کی آبادی کو اسلام کے ایوانِ حکومت میں حقِ بندگی ادا کرنے کے لیے تمام مظالم ڈھانے" کے بعد جو کامیابی حاصل کی وہ صرف دو کروڑ انسانوں پر مشتمل تھی یعنی برطانوی عہد کی کامیابی کا ایک چوتھائی ـــــ ہمارے اس عہد کے برخلاف

[1] فتوح البلدان (فتوح السندھ ص۴۴۱) [2] غازی کی یادداشتیں ۱۹۲۳ء

رغبت مسلمان ہونے والے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا رُبع۔

دوسری قوموں سے مسلمانوں کی ترقی کا مقابلہ

گذشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کی وسعت پذیر آبادی کا یہ پھیلاؤ اپنی مکمل اور حقیقی شکل میں ان تمام تاریخی اعتراضوں کا جواب ہے جو ہندوستان میں اسلام کے ظہور اور اُس کی قدرتی ترقی پر کیے جاتے رہے ہیں۔ خدا کے چھ ہزار صلاحیت مند بندوں کا ایک قافلہ چھ کروڑ کی فوج کی صورت میں بدل جاتا ہے اور چھ کروڑ سے آٹھ کروڑ اور آٹھ کروڑ سے نو کروڑ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کی یہ ترقی اسلام کی عام اور عالمگیر ترقی کے مماثل ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح اسلام کا ظہور اور ایک صدی کا عروج تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ[۲] ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے نشو و نما کی گذشتہ ایک صدی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔

برطانوی ہند کی ۹۵ فیصدی آبادی کے علاوہ دوسری جماعتوں اور فرقوں کی آبادی جس قدر غیر اہم ہے اُسی قدر ہندوستان کے مسلمان زندگی کی نمودگاہ میں زیادہ پھیلے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ عیسائی اپنی سلطنت کے باوجود ایک صدی سے زیادہ عرصہ میں ۳۶ لاکھ (۱۴ر) فیصدی سے زیادہ نہ بڑھ سکے[۳] جس مذہبی فرقہ کو سلطنت کی سرپرستی، جائز سے زیادہ ناجائز تبلیغ کی آزادی۔ انگلستان اور امریکہ کے کروڑ پتی مخیر دولتمندوں کی ثروت۔ ہندوستان کے برطانوی حکام کی سیاسی حمایت، تقریر و تحریر تالیفِ قلوب اور تبلیغی فریب دہی کی پوری پوری آزادی حاصل تھی، مگر اُس نے ۳۶ لاکھ انسانوں کو تعلیم و تربیت، شادی بیاہ اور کھانے پینے کے ایک مرکز پر جمع کر لیا تو ظاہر ہے کہ کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔

سکھوں کو پنجاب میں گرونانک ایسا نیک سرشت مصلح ملا، گرو گوبند ایسا جرنیل دستیاب ہوا، رنجیت سنگھ

---

[۱] فتوحات الاسلامیہ (سید احمد زینی دحلان) مطبوعہ ۱۳۱۱ھ مکہ معظمہ (فتح سندھ ص۱۲۳)

[۲] جدید دنیائے اسلام (ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ)

[۳] مقالہ سر ہیگ میکفرسن سابق گورنر پولیٹیکل انڈیا

کے تحت کی حمایت نصیب ہوئی مگر انہوں نے اپنے اعداد و شمار کے نقشے میں بتیس[۳۲] لاکھ کے خانہ سے آگے قدم نہیں رکھا یعنی کل آبادی میں ۲۰ فیصدی۔ لا مذہب قبائل اکیاون لاکھ سے زیادہ نہ بڑھ سکے ہندوؤں کی آبادی ستر کروڑ ضرور ہے لیکن تمام سیاسی ترقیوں کے باوجود ان کی بستیاں مردم شماری کے محاذ پر خطرناک اور غیر محسوس صورت میں پیچھے کی طرف کھسک رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ملکی تنظیم اور حکومت خود اختیاری کی اصلاحی اسکیمیں ان کی بے روح زندگی میں رفتہ رفتہ جان ڈال رہی ہیں لیکن اسلام غیر معلوم راہوں سے عام ہندوؤں تک جو رسائی حاصل کر رہا ہے اور اسلام کی فطری کشش اُن کو جس طرح فتح کر رہی ہے اُس کے نتیجہ کا ایک صدی سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔ اگر چھوت چھات کی شکستہ دیواریں اور رخنے پڑ گئے، سیاسی نفرت اور سیاسی چھوت چھات کا وہ نقصان رساں نظریہ جس کے موجد اس عصر کے ناعاقبت اندیش مسلم سیاستدان ہیں اپنی موت آپ مرگیا اور تمدنی زندگی کی عام راہوں پر ہندوؤں کو مسلمانوں سے زیادہ میل جول کا موقع ملا تو ہم دیکھینگے کہ ستر کروڑ ہندوؤں اور چار کروڑ اچھوتوں کو مسلمانوں کی مقناطیسی کشش کس طرح اپنے اندر جذب کر لینے میں کامیاب ہو جائیگی۔

ماضی و حال کا ربط

ہم آج ہندوستان میں نو کروڑ ہیں، یہ بات ہمارے لیے جس قدر خوش آئند ہے اُس سے زیادہ اس ملک میں ہماری ذمہ داریوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ اگرچہ ہماری موجودہ زندگی۔ زندگی کے محرکات۔ ان محرکات سے پیدا ہونے والے آثار و علائم بالکل نئے ہیں اور واقعات و حالات کے آئینہ میں مذہبی سے زیادہ سیاسی نظر آرہے ہیں تاہم ہندوستان سے ہمارے اس تعلق کے ربط و ضبط کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان بنیادوں کا تلاش کرنا ضروری ہے جن پر ہماری ترقی پذیر تاریخ کا انحصار ہے۔

اگرچہ واقعات کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے اور ہم علم و آگاہی کے مقام پر اپنے ماضی کے آثار کو زیادہ محسوس کرنے کے عادی نہیں ہیں مگر یہ حقیقت ہمیشہ اپنی جگہ پر قائم رہیگی کہ تاریخ کی عمارت ماضی ہی پر

قائم ہوتی ہے۔ زمانہ امروز و فردا کے واقعات کا ایک مکمل مجموعہ ہے۔ ہماری آج کی تشکیلات جن کو ہم زندہ آرزوؤں کے فانوس میں ایک پھیلی ہوئی روشنی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں اسی مجموعہ کا ایک حصہ ہیں ہمارے حال کی وسعتیں اور ان وسعتوں کے خوشگوار و خوش آئند نتائج کا تمام دار و مدار ہماری تاریخ ماضی کے ان مجاہدین پر ہے جنہوں نے ہم سے پہلے زمین کے دل پر دسترس حاصل کی۔

ہم آج یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تعداد کروڑوں انسانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ملک میں جس طرح ہم ایک خدا پرست اور راستباز مسلمان کی حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح ہماری ایک صحیح حیثیت یہ بھی ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان سے ہمارا تعلق تاریخی ہے۔ دنیا کا کوئی جبر اور کوئی مخالف قوت نہ ہمارے اس تعلق پر حرف لا سکتی ہے اور نہ اس کو منقطع کر سکتی ہے۔

یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ہم ہندوستان کے سینے میں ایک گرم دل کی حیثیت رکھتے ہیں ہم نے یہاں مذہب، اخلاق اور تہذیب و تمدن کی جن نئی راہوں اور شاہراہوں کو تعمیر کیا ہے راہ سے گذرنے والے ان کی افادی حیثیت سے انکار نہیں سکتے۔ اگرچہ ہماری موجودہ زندگی کے نئے عناصر کی تخلیق میں انیسویں صدی کے نصف اول میں رونما ہونے والے واقعات کا بہت زبردست اثر ہے۔ لیکن جب ہم اس سرچشمہ کی تلاش میں نکلتے ہیں جہاں پہنچ کر ہم نے پہلے دن اس ملک کا پانی پیا تھا جہاں گنگا ایسی اچھی اور بڑی ندی بہتی ہے اور جس کی حفاظت و پاسبانی قدرت کی جانب سے ہمالیہ ایسے بلند پہاڑ کے سپرد کی گئی ہے، تو ہمیں بالکل ابتدائی منزل پر محمد بن قاسم کی ظفر موج افواج کا ہراول دستہ نظر آتا ہے۔

تاریخ قدیم کا ایک صفحہ

اس میں ذرا شک نہیں کہ ہندوستان میں ہماری آمد کی دشوار گذار راہوں پر جو سنگلاخ چٹانیں نظر آتی ہیں اُن کے ہر گوشہ پر محمد بن قاسم کے فاتح سپاہیوں کا نام ثبت نظر آتا ہے لیکن ہمیں اس

بات کو نظرانداز نہ کردینا چاہیے کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد اُن کی آبادی اور وسعت
پذ انحصار تمام تر فوج کشی پر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اسلام کے ان سعید فطرت باکمال اور صاحب حال
بزرگوں سے بھی ہے جو زندگی بھر اس مادی دنیا میں اسلام کی حقیقی اور موثر روح کی نمائندگی کرتے رہے
ہندوستان میلاد مسیح سے صدیوں قبل ایک شاندار اور مستقل تہذیب کا گہوارہ تھا، ہمیں
راجہ اشوک کے عہد حکومت میں ہندوستان کی زندگی میں مذہبی انداز پر سلطنت کی تنظیم کی صورتیں
بھی نظر آتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آمد اور محمد بن قاسم کی فوج کشی
سے قبل ہندوستان میں مذہب اور سلطنت کی قوتیں اپنی محکم صورت میں باقی نہیں رہی تھیں۔ محمد بن قاسم
کے مہذب و متمدن سپاہیوں کے لیے انسانی خدمت کے نقطۂ نگاہ سے یہ وقت کی ایک نیک فال
تھی تاہم اس کا اثر جس قدر سندھ پر ہوسکتا تھا اتنا ملک کے بعید ترین علاقوں میں ہونا دشوار تھا۔

محمد بن قاسم کی آمد سے قبل اسی ہندوستان میں شمال مغربی راہ سے یونانی آچکے تھے، ایرانی
آچکے تھے، اہل باختر (افغانستان قدیم اور وسط ایشیا کے باشندے) آچکے تھے، سفید ہن اور سیتھین
آچکے تھے، اور ہندوستان کے باشندوں کے لے جلے نقوش اور ملک کے مختلف حصوں میں مختلف الاصل
انسانوں اور مختلف تمدنوں کی متعدد نشانیاں ان کی آمد کی گواہی دے رہی تھیں۔

یہ باہر سے آنے والے تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے اور اُن کے اس پھیلاؤ کو تاریخ کی آنکھ دیکھ
رہی تھی ان کے مقابلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم کی آمد کا اثر سندھ پر تو ضرور تھا مگر ہندوستان کے
دوسرے حصے اس سے محروم تھے۔

سوال یہ ہے کہ اسلام آج تک جس اعتقادی وحدت، جس مذہبی اثر و نفوذ اور جس تمدنی تنظیم
کا داعی رہا ہے اُس کی رسائی ملک کے دوسرے حصوں میں کیونکر ہوئی؟

یہ صحیح ہے کہ وندھیاچل پہاڑ کے جنوب میں جہاں اسلام کی فتح و فوز کا قدم شمالی ہند کی فتوحات

کے صدیوں بعد پنچا مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کوئی نمایاں اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم تناسب کی اس کمی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق مدراس میں یہ تناسب صرف ۷ فیصدی ہے، بمبئی کے مخصوص علاقہ میں ۹ فیصدی ہے، صوبہ متوسط (سی، پی) میں ۵ فیصدی ہے۔ صوبہ بہار و اڑیسہ میں ۱۱ فیصدی۔ صوبہ متحدہ (دریائے گنگا کے وسطی رقبہ) میں جہاں مسلمانوں کی شہری اہمیت ۵۰ فیصدی سے زیادہ معلوم ہوتی ہے ۱۵ فیصدی ہے۔ یہ تناسب ہر صوبہ میں اپنی جداگانہ حیثیت سے کم سہی لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سرحد، سندھ، پنجاب اور بنگال کے علاوہ دوسرے صوبوں میں بھی مسلمان ایک مجموعی اہمیت رکھتے ہیں۔

مذہب و اخلاق کے عام مطمح نظر کی رو سے یہ بات کچھ کم اہم نہیں ہے اور اس مرحلہ پر پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ اسلام کی یہ نوآبادیاں محض مسلمانوں کی فوج کشی کے زیر اثر روبہ ترقی ہیں یا اس کے علاوہ کسی دوسرے سبب سے۔

ملک گیری کا اسلامی نصب العین

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے ملک کی شہرہ آفاق ادیبہ سروجنی نائیڈو نے جو اوائل ہی سے اسلام، پیغمبر اسلام اور اسلامی تمدن کی مداح ہیں آج سے بارہ سال قبل فرمایا تھا:

"اسلام نے آج سے تیرہ سو سال قبل انسانی مساوات کا قابلِ قبول اصول پیش کیا۔ دنیا کو ایک خاندان کے مساوی افراد کا مجموعہ قرار دیا اور عوام کی بھلائی کے لیے ایک ایسی جاذب توجہ جمہوریت کی تشکیل میں حصہ لیا جس کو قانون الٰہی چلاتا ہے اور جس کی نظر میں امیر و غریب یکساں ہیں"

ان الفاظ کے بعد ایک پیشین گوئی بھی تھی اور اس کے یہ الفاظ تھے:۔ "میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ ایک دن وہ آئیگا جب اسلام تمام دنیا کے مذاہب کو اپنے اندر جذب کرلیگا"

اسلام کے متعلق انگلستان کے مشہور ادیب برنارڈ شا کے الفاظ بھی دنیا کے کانوں نے گذشتہ چند سال میں بار بار سُنے ہیں۔ "دنیا کا آئندہ مذہب اسلام ہوگا"

زبانِ خلق نقارۂ خدا کی آواز ہے۔ ایک مسلمان کو یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا لیکن اب دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا دنیا کا آئندہ مذہب اس لیے اسلام ہوگا کہ محمد بن قاسم کے فوجی اپنی قبروں سے اُٹھ کر تلواریں سنبھال کر گھوڑوں پر سوار ہو جائینگے اور ہندوستان کو فتح کرنے تمام دنیا کو فتح کر ڈالینگے یا سچائی اور ایمان کی وہ قوتیں جو محمد بن قاسم کے اسلحہ کی قوت تھیں دنیا کو فتح کر کے اسلام کے فیضان عام کو عام کر دینگی۔

سروجنی نائیڈو اور برنارڈشا کے اقوال اپنی جگہ دل خوش کن سہی لیکن کیا یہ اقوال ان الفاظ کا تازہ نساس نہیں ہیں جو آج سے تیرہ سو سال قبل دنیا کے سب سے بڑے انسان محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُنے گئے تھے۔

لَا یَبْقیٰ عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ	زمین کی سطح پر کوئی گھر مٹی کا ہو یا اونی خیمہ کا ایسا باقی نہیں ہوگا
اِلَّا اَدْخَلَہ اللہُ کَلِمَۃَ اسلام	جس میں اسلام کا نام نہ لیا جاتا ہو

اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے فاتح مذہب ہے وہ انسانی جسم کی طرح روح کو بھی فتح کرتا ہے کروڑوں انسانوں کی ایک مستقل دنیا محض جبر واکراہ سے مسلمان نہیں بن سکتی۔ اسلام کے پیرؤں نے ملک گیری میں حصہ ضرور لیا ہے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کی ملک گیری کا نصب العین اسلام کے علاوہ اور کچھ نہیں اور اسلام اپنی سادہ اور حقیقی شکل میں انسانی بھلائی کا ایک ضابطہ ہے، اور اس کے علاوہ کوئی ایسی شے نہیں جس کے باب میں سوچنے اور سمجھنے والے انسان کی فطرت کو کوئی جھجک پیدا ہو۔

ہندوستان میں اسلامی فتوحات اور مبلغینِ اسلام کی حیرت انگیز کامیابی کا اندازہ کرنے کے

یے تاریخ کا ایک واقعہ کافی ہوگا۔ غسان کا بادشاہ روم کے شہنشاہوں سے خاص تعلق رکھتا تھا۔

پیغمبر اسلام نے شجاع بن وہب الاسدی کو اپنا مذہبی سفیر بنا کر شاہ غسان کے پاس بھیجا۔ بادشاہ کے وزیر دربار نے شاہی ملاقات سے پہلے ملاقات کی اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات اور کچھ اطمینان آفریں جوابات پائے، چند روز بعد شاہی دربار میں رسائی ہوئی اور سفارتی کاغذات پیش کیے۔ پیغمبر اسلام کے نامۂ گرامی میں یہ الفاظ بھی تھے۔

فَانِّی اَدْعُوکَ اِلٰی اَنْ تُوْمِنَ بِاللہِ وَحْدَہٗ — میں تم کو ایمان (سکون روح کی حقیقی منزل) کی طرف بلاتا ہوں

یبقی لک ملکک — اگر تم ایمان لے آؤ تو تمہارا ملک بدستور تمہارے قبضہ میں رہیگا

ان صاف الفاظ سے یہ بات واضح ہوسکتی ہے کہ ہندوستان میں صحیح الاصول مسلمانوں کی ملک گیری کا مقصد ملک گیری نہیں تھا بلکہ ایمان کا وہ ضابطہ اجتماعی تھا جس نے خود ان کی زندگی میں ایک بہتر انقلاب پیدا کر دیا تھا اور جس کے متعلق ان کے دل کا سچا جذبہ یہ تھا کہ تمام دنیا اپنی فوز و فلاح کے اسی ضابطہ پر آکر جمع ہوجائے۔

خلفائے راشدینؓ کی نظر ہندوستان پر۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے متعلق اگر تاریخ کی غلط بینی سے علیحدہ ہو کر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی منظم آمد کے اس پہلو کے علاوہ جس کا تعلق سندھ سے ہے دوسرا پہلو دو امور پر مبنی نظر آتا ہے

(۱) بھائی بندی اور مساوات کے مذہبی اصول پر عقیدۂ توحید کی تبلیغ

(۲) ایک ایسی عالمگیر عمرانی جمہوریت کی تشکیل جس میں تمام بندوں کے شہری حقوق مساوی ہوں اور جس کو بغیر شبہ خدائی جمہوریت کا نام دیا جاسکے۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال الٰہی کے بعد خلفائے راشدین کے فوجی اقدام

اور پیشرفت کی بنیاد یہی دو امور تھے۔ ان امور کی تکمیل کے لیے اولین کام ایک "سچے پیغام" کا پہنچانا تھا۔ یہ پیغام جس ملک اور جس قوم کو دیا گیا اس کے ساتھ چند حقیقتیں ہمیشہ رہی تھیں لیکن ہر زمانہ کی طرح اس زمانہ میں بھی ایسی روحیں موجود تھیں جو اس پیغام کے پہنچنے سے پہلے جارحانہ ارادوں کے ساتھ میدان میں نکل آتی تھیں اور ان کا مجبور کن نتیجہ ایک جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی فوجوں کے آنے سے پہلے عرب تاجر تبلیغ کے لیے ساحل گجرات پر اتر کر سچائی اور وحدت کا پیغام پہنچا چکے تھے۔ بلکہ ان میں سے بعض عالی ہمت ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے بادبانی جہازوں کو چین تک پہنچا کر دم لیا۔

امیرالمومنین خلیفہ دوم کے زمانہ ہی میں شہادت کی انگلی ہندوستان کی طرف اشارہ کرچکی تھی۔ جب فاروق اعظم نے حضرت عثمان ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر بنایا تھا تو انہوں نے عمان پہنچ کر ایک لشکر کو سندھ کے ساحل کی طرف روانہ کیا تھا۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فوجی نقطۂ نگاہ سے ایک نظامی افسر کو ہندوستان کے حالات کی تحقیق کے لیے بھیجا۔ اس افسر کا نام حکیم بن جبلہ عبدی تھا۔ جب حکیم ہندوستان میں امر الٰہی کی اشاعت اور تحقیق حال کے بعد واپس ہوا تو امیرالمومنین نے اس سے حالات دریافت کیے۔ حکیم نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا:-

"امیرالمومنین! میں نے وہاں کے بہت سے شہروں سے واقفیت حاصل کی ہے اور خوب آزمایا ہے، ہندوستان میں پانی کم، کھجوریں خراب قسم کی اور لٹیرے بڑے دلیر ہیں۔ اگر ہماری فوج کم ہوگی تو تباہ ہوجائیگی، زیادہ ہوگی بھوکوں مرجائیگی۔"

ؔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے متعلق یہ کسی قدر غلط رپورٹ تھی جو حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب حکیم نے سندھ سے آگے بڑھ کر ملک کی جو حالت معلوم کی ہوگی وہ بالکل درست تھی۔ سندھ کے مشرق میں راجپوتانہ کا ریگستانی علاقہ ایسا ہی ہے، جہاں پانی کی قلت اور اجناس کی پیداوار کی کمی ہے، نیز بھیلوں وغیرہ کا پیشہ ہی لوٹ تھا۔ ملک کی حالت کئی سو میل تک یہی تھی، اسی پر کل ہندوستان کو قیاس کرلیا گیا۔

امیرالمومنین نے ان الفاظ کو بڑی حیرت سے سُنا اور تعجب سے فرمایا کہ "یہ شاعری ہے یا واقعات" جواباً عرض کیا گیا کہ "امیرالمومنین صحیح عرض کر رہا ہوں" چونکہ تحقیقاتی رپورٹ ہمت افزا نہیں تھی اس لیے حضرت عثمانؓ نے توحید کے سپاہیوں کو کوچ کا حکم نہیں دیا۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے عہد گرامی میں سرحد سندھ پر اسلامی سپاہ نے اقدام کیا اور خراسان کے پہلو میں سندھ کے ایک شہر پر فتح حاصل کی یہاں تک کہ اسلامی جرنیل جناب حارث جن کے ماتحت رضاکاروں کے دستے تھے کچھ ہی روز بعد دوسرے حادثہ میں شہید ہوگئے محمد بن قاسم کے حملہ سے پہلے اسی طرح مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، ابتدائی جنگوں نے ہندوؤں کے تعصب اور جنگی روح کو اور بھی بیدار کر دیا لیکن ان کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کی اخلاقی روح کام کرنے لگی، مفتوحین پر کوئی جبر نہ تھا۔ فاتحوں نے ان سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہ کیا۔ ان کے مذہبی معاملات میں صلح کی پالیسی کو برقرار رکھا اور سابق باشندوں کو اس امر کا یقین دلا دیا کہ ہمارے سفر کی روح رواں ملک گیری نہیں ہے، مسلمانوں کے انسانی اخلاق نے مفتوح طبقوں کے دلوں کو اس حد تک مطمئن کر دیا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ ہمارے یہ نئے ہموطن جو انہی راہوں سے آئے ہیں جن راہوں سے ہماری نسلیں اس سے پہلے آچکی ہیں۔ ہم سے بہتر ہیں اور ہماری ترقی کے لیے ان کے پاس کچھ ایسی بنیادیں ہیں جن کو مادی سے زیادہ روحانی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے معتقدات ہمارے معتقدات سے بہتر ان کے اخلاق ہمارے اخلاق سے افضل اور ان کے اصول زندگی ہماری زندگی کے طور طریقوں سے اچھے ہیں۔

چند تاریخی شواہد

مسلمان ہندوستان میں صحیح اعتقاد کی دولت لے کر آئے تھے۔ ہندوازم کے اوہام اور ہندو نظامِ سلطنت کی تقسیم و تفریق کے اس تاریخی دور میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد اسلام کے سچے

اعتقادات کی تلوار ہی کے فاتحانہ کارناموں کی ایک صورت تھی۔

اس سلسلہ میں عسیفان کے بادشاہ کا ایک واقعہ اس تمام اجمال کی تفصیل پیش کرسکتا ہے، یہ بادشاہ کشمیر، کابل اور ملتان کے درمیان حکومت کرتا تھا۔ اس کی فطرت اپنی اصل کے اعتبار سے صحیح تھی، اعتقادی امور میں عقل و دانش کو رہنما سمجھتا تھا۔ اس کی رعایا بت کی پوجا کرتی تھی، رعایا کا ایک مندر تھا، مندر میں ایک مورتی تھی اور اُسے کپڑے پہنا رکھے تھے۔ بادشاہ کا بیٹا بیمار ہوا تو پجاریوں کو دعا کا حکم ہوا، پجاری پتھر کی مورت کے سامنے حاضر ہوئے، دعا کی، ناکام ہونا تھا ناکام ہوئے اُدھر دعا ہو رہی تھی، اِدھر لڑکا ختم ہو گیا۔ بادشاہ کی فطرت سلیم کو غصہ آیا مندر گروا دیا گیا، بُت تڑوا دیا گیا اور مسلمان تاجروں کو تلقین اسلام کے لیے دعوت دی گئی۔ اُنھوں نے اسلام کی حقیقت بیان کی اور توحید کی تعلیم پیش کی تو بادشاہ کی فطرت سلیم کو سکون حاصل ہوا اور بالآخر اُس نے اسلام قبول کر لیا، یہ واقعہ عہد عباسی میں امیر المومنین مُعتصِم باللہ کے عہد میں پیش آیا[۱]

خلیفہ ثالث کے عہد سے لے کر عباسیوں کے عہد تک ہندوستان میں اسلامی فوج کشی کی تاریخ اس قسم کے واقعات کی نعمت سے مالا مال ہے۔

ہمیں مسلمانوں کے حملوں میں بالعموم ایک تسلسل نظر آتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد سلطنت میں ۳۹ھ کے آغاز میں حارث بن مُرّہ عبدی نے رضاکاروں کے ایک دستہ کے ساتھ امیر المومنین کی اجازت سے اقدام کیا اور فتح حاصل کی اور آخر کار ایک دوسرے معرکے میں بجز چند کے سب شہید ہو گئے۔ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا عہد تدبیر و تدبر کا عہد تھا آپ کے عہد میں ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ کی کمان میں حملہ کیا گیا۔ اس کے بعد دوسرا حملہ عبداللہ بن سوار نے کیا اور اُنھیں شہادت نصیب ہوئی۔

ہمیں ان تمام فتوحات میں ملک گیری سے زیادہ امر حق کی تبلیغ نظر آتی ہے۔ مکران کے متعلق

[۱] فتوح البلدان (باب فتوح السند) ۱۲

عربی ادب کا ایک ٹکڑا ہے کہ "وہاں کی حالت یہ ہے کہ آدمی زیادہ ہوں تو بھوکے مرجائیں کم ہوں تو مصیبت میں مبتلا ہوجائیں" مسلمانوں نے مکران کو بھی فتح کیا، مکران کے فاتح سنان بن سلمہ کے لیے تاریخ کی یہ شہادت موجود ہے کہ اُس نے مفتوحہ علاقہ کی تنظیم کی، اس کی شہری حیثیت کو ترقی دی اور گورنر سندھ کی حیثیت سے اُس نے تمام بلاد سندھ کا نظم ونسق قائم کیا۔ تاریخ اُس کی قابلیت کا اعتراف کرتی ہے اور یہ بات ناقابل انکار ہے کہ اس کے اس اقدام میں خداپرستی کے جذبہ کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہ تھا۔

اِن فتوحات کے سلسلہ میں جو حقیقی جذبہ کارفرما رہا ہے اُس کو صحیح صورت میں محسوس کرنے کے لیے اسی دور کی تاریخ کے چند واقعات کا ذکر کافی ہوگا۔

(۱) دیبل کی تاریخی جنگ محمد بن قاسم کی زندگی میں ایک یادگار ہے۔ دیبل کو پوری قوت صرف کرنے کے بعد فتح کیا گیا۔ لیکن فتح کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا گیا وہ وہاں ایک مسجد کی تعمیر تھی جس میں چار ہزار خدا پرست انسان خدا کی عبادت کرسکیں۔

(۲) محمد بن قاسم دیبل سے "بیرون" آیا۔ اہل دیبل کی طرف سے دو سادھو اس سے ملے محمد نے اُن کے پیام صلح کو قبول کیا، اور اُنھوں نے یہ وعدہ کیا کہ خداپرستوں کی فوج کے لیے رسد کا انتظام کرینگے۔

(۳) محمد بن قاسم آگے بڑھا تو "سر بیدس" کے سادھو آئے اور اسلام کی دولت صلح وسلام سے اپنا حصہ لے کر چلے گئے۔

(۴) محمد "سدوسان" پہنچا، وہاں کے باشندوں نے صلح کا پیغام دیا، اُس کو قبول کیا گیا اور اُن کی شہری زندگی پر ذرا بھی حرف نہیں آیا۔ سدوسان کے چار ہزار جاٹ اسلامی فوج میں داخل ہوئے۔

(۵) محمد بن قاسم اسی طرح منزل بہ منزل اپنے اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اس نے اہلِ ساوندری کو امان دی اہل ساوندری نے اسلامی فوجوں کی مہمانی کو قبول کیا۔ یہاں تک کہ اسلام ان لوگوں کی روح پر چھا گیا۔

(۶) بسمد والوں سے بھی وہی سلوک ہوا جو ساوندری والوں سے ہو چکا تھا۔

(۷) رور کے باشندوں نے مقابلہ کیا، مسلمانوں نے سختی سے دفاع کیا اور بڑھ کر محاصرہ کر لیا۔ جب رور کے باشندوں نے دانش سے کام لیا اور آزمائشی صلح کا پیغام بھیجا تو صلح کی طے شدہ شرطیں یہ تھیں:-

ا۔ مسلمان اہل رور کو قتل نہیں کرینگے۔

ب۔ مسلمان ان کے مندروں کو نہیں توڑینگے۔

اگرچہ مسلمان بت پرستی کے خلاف تھے لیکن انہوں نے اِن دونوں شرطوں کو قبول کیا، اُن کی پابندی کی اور شہر والوں کو امان دینے کے بعد جو پہلا کام کیا وہ ایک مسجد کی تعمیر تھی کیونکہ خدا کے گھر میں خدا کا نام بلند کرنا ہی ان کی فتوحات کا مقصد تھا۔

اگرچہ اسلامی افواج نے معرکہ کے وقت سخت معرکہ کی جنگ لڑی لیکن بیشتر حالات میں جنگ اصل مقصد نہ تھی۔

(۹) ۹۹ھ میں سلیمان کی وفات کے بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیا تو انہوں نے راجگانِ ہند کے نام خطوط لکھے۔ ان خطوط کی روح بالکل وہی تھی جو پیغمبر اسلام کے مکتوب محبوب (بنام مَلِکِ غسّان) میں محسوس ہوتی ہے۔ ان خطوط کے الفاظ اپنے حقیقی مطالب کے ساتھ یہ تھے۔

اسلام و اطاعت کو قبول کرو جو اسلام لے آئینگے اُن کے حقوقِ سلطنت میں کوئی تبدیلی

نہ ہوگی وہ اپنے ملک میں بدستور حکمراں رہینگے۔ مسلمانوں کے برابر اُن کے حقوق ہونگے اور جو ذمہ داریاں مسلمانوں پر عائد ہیں وہی اُن پر عائد ہونگی"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ان خطوط کے ساتھ راجگانِ ہند کے سامنے اسلام کی تلوار نہیں گئی تھی۔ مگر ان کا اثر یہ ہوا کہ جے سنگھ اور بعض اور راجگان ہند نے بالآخر اسلام قبول کرلیا۔

اسلامی ہند کے عناصر ترکیبی

تاریخ کی ترقی کے ساتھ مسلمان بھی ترقی کرتے رہے۔ اور ان کی ترقی کے لیے ہندوستان کی فضا نے کچھ اور ایسے نئے سامان کردیے جنہوں نے مقصد کی حدود کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

اسلام کو ہندوستان میں جو قبول عام، ترقی اور ہمہ گیر حیثیت حاصل ہوئی اُس کو علیگڈھ کالج کے مشہور پرنسپل سر تھیوڈر مارلین نے اپنے مقالے "مسلم تحریکات" میں ایک دلکش تقسیم کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ اس کا اختصار دیکھنے کے قابل ہے۔

(۱) تمام ہندوستان کی مجموعی آبادی (باستثنائے برما) تیس کروڑ اسی لاکھ ہے جس میں سے سات کروڑ ستر لاکھ مسلمان ہیں۔

(۲) ان مسلمانوں میں کچھ تو وسط ایشیا سے آنے والے اُن فاتح عربوں، افغانوں اور ترکوں کی اولاد ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے رہے۔

(۳) لیکن ان مسلمانوں کی اکثریت کی رگوں میں ہندوستان ہی کا خون جاری و ساری ہے۔ یہ اکثریت اونچی ذات کے راجپوتوں، محنتی شودروں اور پسماندہ اچھوتوں پر مشتمل ہے جنہیں نامعلوم الاسم مبلغین نے مسلمان بنایا تھا۔ یا جن تک دعوت اسلام اُن مشہور اولیاء اور بزرگانِ دین کے ذریعہ پہنچی ہے جن کے مزار آج تک بے شمار عقیدتمندوں کا مرجع ہیں۔

---

[۱] پولیٹکل انڈیا۔

(۴) ہندوستان کی اسلامی آبادی میں ایک اور ذریعے سے بھی اضافہ ہوا۔ تیرہویں صدی میں قطب الدین ایبک کے زمانہ سے اٹھارویں صدی کے اوائل، اورنگ زیب کے عہد تک شاہانِ اسلام کی حکومت میں ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے وسط ایشیا سے متمدن اور مہذب سپاہی، فوجی افسر، ماہرین فنون، مدبرین اور علماء مسلسل بڑی تعداد میں ہندوستان آتے رہے، اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں نامور خاندانوں کی بنیاد ڈالی۔

سر تھیوڈر ماریسن کی یہ تصریحات تاریخ کی سنجیدہ روایات سے ایک قدرتی مطابقت رکھتی ہیں۔ کروڑوں انسانوں کا کسی ایک مرکز وحدت پر اجتماع کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ تلوار کسی ایک مختصر جماعت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجبور نہیں کرسکتی، کیونکہ کارلائل کے قول کے مطابق تلوار کی قوت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر اسلام کے تیغ زن سپاہیوں نے دنیا کو مسلمان بنایا ہے تو ان تیغ زن سپاہیوں کو پہلے پہل کون سی تلوار سے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔

گاندھی جی کا اعلانِ حق

مہاتما گاندھی آج پوری عقیدت سے کہتے ہیں:۔

"اسلام دینِ حق کی ایک آواز ہے جب مغرب تاریکی میں تھا تو مشرق کے اُفق پر نور کا ایک ستارہ طلوع ہوا، اسلام بے چین دنیا کے لیے سکونِ روح بن کر آیا۔ اسلام کوئی جھوٹا مذہب نہیں ہے۔ مجھے پختہ یقین ہوگیا ہے کہ اسلام کی ترقی واشاعت میں تلوار نہیں بلکہ اس کی تعلیم اور تجربہ تھا۔"[1]

گاندھی جی کی اس رائے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلامی سلطنت کے زوال کے

---

[1] بھائی پرمانند کا ترجمان اخبار ہندو لاہور صـ۱۲ مورخہ ۲۲۔ مئی ۱۹۳۵ء

بعد مسلمانوں کی ترقی اور مزید ترقی کی استعداد کسی غلط اصول پر مبنی ہے۔ جابر حکومتوں کا اثر اُن کے جبر کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اپنے دور حکومت کے بعد زیادہ موثر ثابت ہوا۔ منکر طبیعتیں خواہ اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کی تمام اصلاحی تحریکوں کی روح اسلام ہے۔ ممکن ہے اس روح کو عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں لیکن جس طرح خدا کو عام نظریں نہیں دیکھتیں مگر وہ موجود ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی رگوں میں اسلامی روح گرم خون کی طرح جاری و ساری ہے۔

اگر گرونانک کی اصلاحی تحریک اسلامی صوفیار کے روحانی آثار میں سے ایک اثر ہے تو دیانندجی کی وحدانیت اور ہندو سماج کی نئی تنظیم، اسلام کی تنظیم کا نقش ہے۔ اوہام سے آزادی، مظلوم بیوہ عورتوں کی شادی، طلاق کی صحیح صورت مجلسی اصلاح کے لیے طبعی ابھار اسلام کی وہ نعمتیں ہیں جن کو احساس شناس ہندو اور انصاف پسند طبائع بارہا تسلیم کر چکی ہیں۔

اس موقع پر مجھے مسٹر کوئلم سالسٹر لیورپول (انگلستان) کے چند جملوں کا اظہار مفید مقصد معلوم ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ انہی جملوں پر اس مضمون کو ختم ہو جانا چاہیے۔

"اسلام تلقین و تبلیغ کے اعتبار سے دنیا کے ایک بڑے حصہ پر عیسائیت کے مقابلہ میں کامیاب رہا ہے، مذہب اسلام کی وسعت مراکو، جاوا اور زنجبار سے چین تک ہے۔ اس نے افریقہ میں کونگو اور زیمبزی تک رسائی حاصل کر لی اور سب سے قوی حبشی ریاست یوگنڈا کو بھی فتح کر لیا۔ ہندوستان میں نئی تہذیب ہنود کو تباہ کر رہی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے لیے راستہ صاف ہو رہا ہے۔"

لے مسٹر عبداللہ کوئلم (نو مسلم)

مذہب اور انسانیت

از جناب پروفیسر یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی ورنگل کالج

مذہب کا بنیادی اصول خدا کا یقین یا ایک مافوق الفطرت ہستی کا اعتقاد ہے یعنی ایک ایسی ہستی کا یقین جو تمام سے بالاتر ہو جس کو مختلف الفاظ میں اللہ، خدا، گاڈ، سرب شکتی مان وغیرہ کہتے ہیں۔ تاریخ انسانیت بتاتی ہے کہ جب سے حضرت انسان کائنات کے دسترخوان پر مدعو ہوئے ہیں یا بقید حیات موجود ہوئے ہیں، اُس وقت سے اِس وقت تک ہر دور ہر زمانے میں ایک مافوق الفطرت ہستی کا اعتقاد پایا گیا ہے۔ دور وحشت ہو یا دورِ تمدن، علم کا زمانہ ہو یا جہالت کا، تاریخ ہو یا قبل تاریخ، ہر زمانہ میں انسانی گروہ نے ایک بڑی قوت اور زبردست ہستی کے اعتقاد کے ساتھ عاجزی اور عبادت کے اعمال و افعال ادا کیے ہیں۔

پلوٹارک کہتا ہے کہ تم کو بہت سے ایسے مقامات ملینگے جہاں نہ تمدن ہے نہ تہذیب لیکن ایسی کوئی جگہ نہ ملیگی جہاں خدا نہ ہو، غرض ایک بالاتر قوت کا اعتقاد و یقین ہر دور اور ہر زمانے میں پایا گیا ہے اور یہ چیز تمام اقوام عالم میں مشترک ہے اور یہی مذہب کا اصل اصول ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اقوام عالم میں عبادت کے مختلف طریقے پائے گئے ہیں اور اس بالاتر ہستی کی ذات و صفات کے متعلق مختلف بیان اور نظریے ملتے ہیں۔

لیکن یہ اختلاف اس بالاتر ہستی کے صحیح عرفان یا غلط پہچان کے مظہر ہیں! اتنا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور انسانیت میں ایک گہرا اور نہ ٹوٹنے والا رشتہ موجود ہے۔ کیونکہ جس قدر فطری اور نیچرل چیزیں ہیں گو مختلف زمانوں میں ان کا ظہور مختلف صورتوں میں ہو لیکن وہ انسان

سے الگ اور جدا نہیں ہوسکتیں!

ہسٹری آف دی نیشنز (History of the nations) کے حصہ کتاب کالڈیا میں لکھا ہے کہ دو چیزیں انسان کو حیوانیت سے جدا کرتی ہیں اوّل نطق دوسرے مذہب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کا خمیر مذہب اور نطق سے گوندھا گیا ہے اور انہی دو اجزاء کے مجموعہ کا نام انسان ہے اس لیے اگر نطق کو انسان سے جدا کرلیا جائے تو انسان، انسان باقی نہیں رہتا اور اگر انسان سے مذہب الگ ہوجائے تو انسانیت کی روح ہی فنا ہوجاتی ہے ٹھیک جس طرح بھوک اور پیاس ہر جاندار کی فطرت ہے اور انسان کی بھی، لیکن کبھی سخت امراض کی وجہ سے بھوک کم ہوجاتی ہے پیاس باقی نہیں رہتی، اسی طرح جن انسانوں کو روگ لگ جاتا ہے وہ بھی مذہب اور خدا کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ بھوک کے عارضی طور سے گم ہونے کی وجہ سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ بھوک فطری نہیں ہے۔ اسی طرح مذہب کے خال خال انکار کی وجہ سے مذہب کے فطری ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قوتِ شہوانی جاندار کے لیے ایک فطری چیز ہے جس سے بقائے نسل اور اغراضِ تمدن وابستہ ہیں۔ خال خال انسان نامرد بھی پائے جاتے ہیں لیکن ایسے انسانوں کا وجود قوتِ شہوانی کے فطری ہونے پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ یوں بھی اگر آپ ایک ایسی فہرست مرتب کریں جس میں بالاتر قوت کو ماننے والے ایک طرف اور منکرین کو دوسری طرف درج کریں تو منکرین کی تعداد اتنی ہی کم ہوگی جتنا کہ آٹے میں نمک۔ فلاسفہ کے گروہ کو لیجیے یا علماء و فضلاء کی جماعت کو، عوام کو لیجیے یا خواص کو، دنیا کی کثرت اور زیادتی خدا کے ماننے والوں اور ایک ما فوق الفطرت ہستی کا اعتقاد رکھنے والوں کی طرف ہوگی۔

ہمارے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب ایک نیچرل چیز ہے اس کے وجود میں انسانی ہاتھ اور صنعت کا دخل نہیں بلکہ مذہب کا ابھار خود بخود فطرت کی طرف سے عمل میں آیا ہے۔

خدا کا وجود نہ ذہن اور عقل کی پیداوار ہے اور نہ دلائل و فلسفہ کا محتاج وہ نہ نیچر کی بڑی سے بڑی چیز کے رُعب کا اثر ہے اور نہ انسان کی احتیاج اور اس کی کمزوری مذہب کی تخلیق کا باعث ہے بلکہ مذہب فطرت کا ایک لطیف اشارہ ہے۔ انسانی روح اس اشارہ سے عبادت کا جذبہ انسان میں پیدا کرتی ہے۔

عقل و مذہب کی پابندیاں فطری اُبھار ہیں | جن لوگوں نے انسانی فطرت کا مطالعہ کیا ہے، جو حضرات مذہب اور تمدن کے فلسفے سے واقف ہیں، جن لوگوں کے ذہنوں میں تہذیب اور وحشت کے معنی کی تفسیر اور تشریح موجود ہے۔ جن حضرات کے علم میں انسانی معاشرت اور اخلاق حسنہ کی وہ حدیا حقیقت آچکی ہے جو اچھائی اور بُرائی تہذیب اور وحشت میں باہم امتیاز پیدا کرتی ہے وہ جانتے ہیں کہ احکام عقلی اور مذہب دونوں فطری خواہشوں اور نیچرل داعیوں پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ یہی عقلی اور مذہبی پابندیاں اور ان پابندیوں کا عدم، اخلاق و تہذیب کے بارے میں حسنہ و قبیحہ تہذیب و وحشت کے معنی پیدا کرتا ہے۔ ان پابندیوں کو فطرت کے خلاف یا ان نیچرل (unnatural) نہیں کہا جا سکتا بلکہ فطرت کے اشارے کو عقلی اور مذہبی پابندیاں انسان کی عملی زندگی میں مفید بناتی ہیں گویا فطرت کے اُبھار اور اس کے لطیف اشارے عقل اور مذہب کے راستے پر گامزن ہو کر انسان کے لیے مفید اور بہتر ثابت ہوتے ہیں، بھوک، پیاس، خواہش تقاضا، روح، علم کی خواہش اور جستجو وغیرہ فطرت کے لطیف اشارے ہیں، ایک وحشی انسان جو علم و فن سے محض ناواقف ہو، مضر اور مفید چیزوں سے نابلد ہے، اپنے اس فطری اشارے کو جنگلی میوے آنا پ شناپ کھا کر پورا کرتا ہے لیکن فطرت کا یہی اشارہ علم و عقل کی پابندیوں میں انسان کے لیے مفید سے مفید اور اعلیٰ سے اعلیٰ غذا مہیا کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مافوق الفطرت ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت اور روح کا ایک لطیف اشارہ ہے۔

الہامی اور مذہبی پابندیاں جن کو پیغمبرِ وقت اپنے زمانہ میں ظاہر کرتے رہے ہیں، اس لطیف اشارے کو صحیح اور مفید راستے پر ڈالتی ہیں؛ اور اس طرح انسان ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتا ہے غرض یہ ہے کہ عقل اور مذہب نے جو پابندیاں فطری رجحان پر عائد کی ہیں وہ فطرت کے خلاف اور متضاد نہیں بلکہ مقاصد فطرت کی مفسر اور خود فطرت کے لیے معین و مددگار ہیں۔

عقل ومذہب کے مراتب اور ان کے اختلاف کی حقیقت | ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مذہب یعنی خدا کا وجود اور اُس کی یکتائی کا یقین فطرتِ انسانی کا ایک اشارہ ہے۔ اس لطیف اشارے کے مقاصد کی تفسیر عقل ومذہب کے احکام سے ہوتی ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ لطیف اشارے کی اصل کیا ہے۔

تمام اقوام عالم کا عاجزی اور عبادت کے افعال واعمال کی طرف رجحان اس لطیف اشارے کو بتاتا ہے جس کو خداوند تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ذکر فرمایا۔

واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم قالوا بلیٰ شهدنا۔

اور جب خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو نکالا اور خود ان کو انہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب بول اُٹھے کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔"

جوہرِ حیات اور روح کا فرق | اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فطرت کے خمیر میں شروع سے ہی خدا کا اقرار رکھا گیا ہے۔ امتدادِ زمانہ اور اختلافِ عالم کی وجہ سے انسان کو یہ واقعہ اور وہ شہادت جو خدا کے روبرو دی تھی یاد نہ رہی ہو لیکن اقوامِ انسانی کا عبادت کی طرف متفق رجحان اس کی اصلیت پر روشن دلیل ہے۔ اس واقعہ سے، علاوہ اس کے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا اقرار موجود ہے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ روح ایک حقیقت ہے افسانہ نہیں اور اس عالم کے پیدا ہونے سے قبل ہی ارواح مخلوق ہو چکی تھیں اور جس کو آج دنیا زندگی اور حیات کہتی ہے وہ اور روح دونوں

الگ الگ چیزیں ہیں ورنہ انسانی حیات اور پیدایش سے پہلے یہ شبہات اور سوال کیسا؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان روح اور حیات سے مرکب ہے۔ گویہ دونوں خدا ہی کی طرف سے آتی ہیں! لیکن ان میں ایک یعنی حیات (زندگی) ایسا خدا کا حکم ہے جو اسباب قدرت طے کرکے انسان تک پہنچتا ہے اور روح خدا کا وہ امر اور حکم ہے جو بلا توسط اسباب خدا کی طرف سے آتا ہے اور غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ روح نفسانی خاصۂ انسانی ہے جو انسان کے سوائے دیگر حیوانات، نباتات وجمادات کو میسر نہیں، غرض انسانیت روح اور حیات دونوں کے اجتماع سے نمودار ہوتی ہے کیونکہ مذہب اور عقل دونوں اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ انسان میں اس قسم کے آثار موجود ہیں اول شعور اور ادراک اور جذبۂ ترقی اس لیے کہ آج تہذیب وترقی کے جس بلند مقام پر ہم کھڑے ہیں، جن علوم وفنون کے چشموں سے آج ہم سیراب ہو رہے ہیں، جو سہولتیں معاشرت کی آج ہم کو حاصل ہیں، کیا وہ ہمیشہ سے تھیں؟ ہرگز نہیں انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں تدریجاً ترقی کرتا آیا ہے۔ زمانۂ حال نے ماضی سے فائدہ حاصل کیا اور ماضی وحال دونوں کی ترقیوں میں عقل وشعور وادراک کی کارفرمائیوں نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ انسان نے جزئیات سے کلیات بنائے اور اپنے تجربوں سے سربستہ رازوں کو آشکارا کیا۔ کبھی ایک حالت پر قائم نہ رہا۔

اُس نے اپنی بُری حالت کو بہتر اور بہتر کو بہترین بنانے کی سعی کی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ جو انسان قدیم زمانہ میں غاروں میں رہتا زمین پر سوتا، آگ سے گرمی اور روشنی حاصل کرتا اور پتھر سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرتا تھا۔ آج بنگلوں میں آرام کرتا، بجلی سے روشنی اور گرمی حاصل کرتا بندوقوں، توپوں، ہوائی جہازوں اور گیسوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل حیوانات میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ ان کی تاریخ اس جذبہ سے یکسر خالی ہے۔ جہاں ہزار برس پہلے تھے ویں آج بھی ہیں۔ انسانی تمدن کی بنیادیں اور مادی دنیا کا کل فروغ مندکرہ بالا آثار پر روشن دلیل

ہے۔ اسی وجہ سے انسان تمام دنیا پر دسترس رکھتا ہے۔ یہ آثار درحقیقت حیات اور زندگی کے آثار ہیں جو انسان اور حیوانوں میں توالد و تناسل کا ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے آثار جو انسان سے ظاہر ہوتے ہیں وہ مافوق الفطرت ہستی کا اعتقاد اور افعال عبادت کی طرف میلان ہے۔ درحقیقت یہ آثار روح کے ہیں نہ حیات کے کیونکہ ہر چیز اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے۔ اس لیے حیات و زندگی اور اس کے تمام مقتضیات یہیں تمام ہو جاتے ہیں لیکن جو رب الارواح کی طرف سے آتی ہے اپنی اصلیت کی طرف لوٹتی ہے۔ خود روح کا تقاضا یعنی خدا کی طرف میلان بھی ہمارے اس دعویٰ کو ثابت کرتا ہے۔ ہمارے اس بیان سے ظاہر ہے کہ حقیقتِ انسانی، حیاتِ انسانی سے فرید در افضل ہے۔ کیونکہ اگر انسانیت کی حقیقت بھی وہی ہے جو دیگر حیوانات کی یعنی انسانی حیات اور حیوانی حیات میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ جس طرح حیات حیوانی کا باعث توالد و تناسل ہے۔ اسی طرح انسانی حیات بھی ظاہر ہوتی ہے تو سوال یہ ہے کہ انسان میں ایسی خصوصیات کہاں سے آئی ہیں جو دیگر مخلوقات میں نہیں پائی جاتیں یعنی مذہب اور اس کے مقتضیات کی دیگر چیزیں یعنی عقل اور نطق با علم ہر چیز میں اپنی اپنی حیات اور زندگی کے مطابق پائی جاتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حیاتِ انسانی حیاتِ حیوانی سے بالاتر اور ترقی یافتہ ہے۔ اسی لیے نفسِ حیات کے اثرات یعنی عقل اور نطق بھی اس میں بالاتر اور ترقی یافتہ پائے جاتے ہیں لیکن اقتضائے مذہب کا افتیان مخصوص اور عرفانی جذبہ کے ساتھ شعبۂ حیوانات میں نہیں پایا جاتا اور یہ خصوصیت صرف انسان ہی کی ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی خصوصیات وہی نہیں جو عقلا اور فلسفہ و سائنس والوں اور اہلِ نجوم کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہیں بلکہ سب سے بڑی خصوصیات وہ ہیں جو پیغمبرانِ کرام کے ذریعہ ظاہر ہوئی ہیں۔

موجودہ دور میں اگر خصوصیات انبیار کا اظہار نہ ہو، خواہ قلتِ کمالات کی وجہ سے یا فقدان مطلق کی وجہ سے تو محض اس لیے ان خصوصیات کا انکار نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر بالفرض کوئی قوم دنیائے سائنس کے لیے تاتاری بن کر دنیا میں نمودار ہو اور وہ سائنس کے تمام قابل فخر آلات اور علوم و کتب کو فنا کر دے یا دنیا کے لوگ خود ہی اس کے مضر اثرات سے تنگ آکر اس سے قطع نظر کریں اور ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں صدیاں گذرنے کے بعد سائنس والوں کا پیدا ہونا اور ان کے کمالات کا ظاہر ہونا بند ہو جائے تو کیا سائنس کے کمالات کے وجود کا اس وجہ سے انکار کرنا کہ اب اس کا ظہور نہیں ہو رہا ہے صحیح ہوگا؟

اسی طرح اگر اس زمانہ میں کمالاتِ نبوت کی طرف دنیا کی توجہ نہ رہی اور روحانی راستے پر عرصہ سے لوگوں نے چلنا ترک کر دیا ہو اور اس غفلت اور جمود کو صدیاں ہو گئی ہوں تو کیا اس وجہ سے روحانیت کا انکار قرین عقل و صواب ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ان خصوصیات کا اصل مبدأ معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو خاص زمانۂ سابق میں یا زمانۂ حال میں ظاہر ہوئی ہوں یہ ظاہر ہے کہ روحانی خصوصیات اور مذہبی خصوصیات صرف انسان میں پائی گئی ہیں ہمارے نزدیک انسان کی اُن خصوصیات کا سرِ چشمہ اور منبعِ حیات سے الگ صرف روح انسانی ہے۔ روحِ انسانی دل و دماغ کو اعلیٰ اور برتر مقصد کی طرف لیجاتی ہے۔ زندگیِ جاوید کی تمنا انسان میں پیدا کرتی ہے۔ خود روح براہ راست زندۂ جاوید ازلی و ابدی روح سے روشن ہوتی ہے۔ اس لیے اُس میں وہ رنگ موجود ہے جو اصل منبع کا حقیقی رنگ ہے۔ اسی زندگیٔ جاوید کے جذبہ کو حافظ شیرازیؒ نے ظاہر کیا ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور اُس کا رُخ ہمیشہ خدا اور اس کی عبادت کی طرف ہوتا ہے بشرطیکہ یہ روح اپنی اصلی حالت میں

باقی رہے۔ بُرے افعال و اعمال کا میل نہ آنے پائے اور جذبہ عقل ہی میں محو ہو کر نہ رہجائے، اسی لیے بہت سے انسان ریاضتِ روحانی اور مذہب پر عمل کر کے غیبی عالم کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ روح کا اثر ہے نہ حیات کا۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عقل کا تعلق حیات سے ہے اور روح کا مذہب سے۔ روح عقل پر حاوی ہے، اس لیے روح کے اثرات مذاہب کے احکام کے خلاف نہیں ہوتے، چونکہ عقل کا تعلق حیات سے ہے اور حیات کی حقیقت روح کی حقیقت سے بہت کمزور اور کمتر ہے کیونکہ روح بلا واسطہ امر رب اسبابِ حیات سے گذر کر انسان تک پہنچی۔ اس لیے روح کے بہت سے احکام اور اثرات و مقتضیات عقل میں نہیں آتے اور صرف عقل ان کے سمجھانے کے لیے کافی نہیں بلکہ کسی بڑی روح کی ضرورت ہے جو اپنے مقتضیاتِ روحانی سے اس کو سمجھا سکے اور اس کا تیقن دلا سکے اس لیے عقلا اور فلاسفہ کی موجودگی میں بھی انبیاء کی ضرورت ہوتی ہے اور انبیاء وہ ہوتے ہیں جو عقل و فلسفہ کے کمالات کے ساتھ جو فطرۃً ان کو حاصل ہوتے ہیں سب سے بڑی روح یعنی رب الارواح سے انتہائی وابستہ ہوتے ہیں۔ اور اس وابستگی کی ابتدا، انبیاء کے کسب سے نہیں ہوتی بلکہ خدائی مشیت اور ارادے سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے کسی بڑی سعید روح کو انتخاب کر لیتا ہے اور پھر اس کو دنیا میں بھیج کر رشد و ہدایت کا کام انجام دلاتا ہے اور اس طرح مسائلِ علم، اعتقاد و یقین کی وہ پیچیدگیاں جو مذہبی احکام کے خلافِ عقل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ عوام و خواص کی عقل سے بالاتر ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں، انبیاء کرام کے ذریعہ درست کی جاتی ہیں۔ یہ خصوصیاتِ روح ہیں اور خصوصیات روح ہی مختلف قابلیتوں کے لحاظ سے مختلف انسانوں میں ظاہر ہوتی ہیں لیکن ان کا انسان کے سوا دوسری مخلوق حیوانات وغیرہ میں پتہ نہیں ملتا لیکن خصوصیات روح کے سوا انسان میں دوسری خصوصیاتِ حیات ہیں اور عقل درحقیقت حیات کا لازمی اثر

ہے جس درجہ کی حیات ہوگی اسی درجہ کی عقل بھی پائی جائیگی لیکن مطلق عقل سے کوئی ذی حیات محروم نہیں! حیات کے مقابلہ پر روح صرف انسان ہی کا خاصہ ہے حیوانات میں اس کا پتہ نہیں

روح اور روحانیت افسانہ نہیں بلکہ حقائق ہیں | جن لوگوں نے حیات و روح کو ایک ہی حقیقت سمجھا ہے وہ حیات کی تہ میں روح کو دیکھنا چاہتے ہیں بالآخر اُن کو روح ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے مگر یہ خیال کم نظری پر مبنی ہے۔ حیات و روح دو الگ حقیقتیں ہیں۔ انسانیت ان دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ انسان دو وجہ سے حیوان سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ اوّل انسان کی عقلِ کلّی یعنی دیگر حیوانات سے بالاتر عقل، دوسرے عقلِ کلّی کی وجہ کر انسان ترقی کی طرف گامزن ہے اور ابتداء سے اس وقت تک برابر بتدریجاً مادّی ترقی کرتا آیا ہے اور روح کی وجہ سے اس میں خدا کے وجود کا اقرار اور عبادت کا میلان ہے۔ روح کیونکہ غیبی چیز ہے اسی لیے اس کے احکام جو اصول کا درجہ رکھتے ہیں عالمِ غیب ہی سے متعلق ہے۔ حشر و نشر، جنت و دوزخ وغیرہا غیبی امور کا کامل یقین بھی اسی طرح بغیر روحانی فکر و عمل کے حاصل نہیں ہوتا جس طرح انسان کی عقل کلّی کے احکام بدون عقلی تدبر کے ظاہر نہیں ہوتے۔ مذہبی احکام کا کامل یقین بغیر دو طریقوں کے حاصل نہیں ہو سکتا یا کسی بڑے مسلم الثبوت ناقابلِ انکار انسان کے تجربے اور اس کے اقوال پر یقین کیا جائے۔ جیسے پیغمبرانِ کرام، اولیاء اللہ یا خود اس راستہ پر گامزن ہو کر احکام غیبی کے مبادی کا یقین حاصل کیا جائے۔ موجودہ دور مادی دور ہے عقلی زمانہ ہے اس لیے روحانیت سے غفلت پائی جاتی ہے غیبی امور میں یقین نہیں کیا جاتا لیکن اس مادّی دور میں بھی جب کبھی روحانیت کی طرف توجہ کی گئی تو کچھ نہ کچھ ایسی چنگاریاں محسوس ہوئیں جن سے روحانیت کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہ ادنیٰ روحانیت ہے جو صرف انسانیت سے متعلق ہے لیکن ایمان و اسلام کے ارتباط سے اس روحانیت میں غیر معمولی پرواز اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے

اس درجہ کے بعد اسلام و ایمان کے غیبی اصول و احکام کا انسان تیقن حاصل کرسکتا ہے۔
روح کا انسان سے خاص ہونا اور صرف روح ہی کے لیے احکام غیبی کا آنا اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حشر و نشر سزا و جزاء اور خدا کی معرفت وغیرہ کا سوال صرف انسان ہی سے متعلق ہے۔ حیوانات میں مذہب کا کہیں پتہ نہیں ملتا آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا ان میں عقل نہیں، زبان نہیں اپنے ارادے سے اپنے کام انجام نہیں دیتے یقیناً یہ سب باتیں اپنے مدارج اور اپنی اصلاح کے لحاظ سے پائی جاتی ہیں۔ بلکہ بعض چیزیں حیوانات میں انسان سے بھی زیادہ قوی ہیں تو پھر حیوانات کے اعمال کی باز پرس ان کے لیے حشر و نشر بصیرت و تدبر کیوں نہیں ظاہر ہے کہ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ مذہب روح کا اقتضا ہے نہ کہ حیاتِ محض کا اور روح صرف انسان سے متعلق ہے نہ کہ حیوانات سے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اُن انسانوں کو جو باوجود عقل رکھنے کے مذہبی مقتضیات کے منکر ہیں جانور کہا ہے۔ صرف اس لیے کہ انھوں نے اصل انسانیت یعنی روح کے مقتضیات اور احکامِ غیب سے انکار کیا۔ پھر وہ صنفِ انسانی کس طرح رہ سکتے ہیں بلکہ اُن کو حیوانات سے بھی زیادہ بُرا کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے حقیقت انسانیہ رکھ کر روح کے ہوتے ہوئے پھر احکامِ روح سے مُنہ پھیر لیا اور انکار کیا[1]۔

---

[1] اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

قاہرہ میں ڈاکٹر خالد شیلڈرک کا خطبہ

(ترجمہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد قا[illegible]ی دیوبند)

مشہور نومسلم انگریز علامہ ڈاکٹر خالد شیلڈرک نے مصری نوجوانوں کی انجمن (جمعیۃ الشبان المسلمین قاہرہ) کے ایوان میں ایک عظیم اجتماع کے سامنے مقالہ ذیل پیش کیا ہے۔

مقالہ کی جامعیت اور معنوی اہمیت کی بنا پر اس کا اُردو ترجمہ پیش کر رہا ہوں علاوہ بیش قرار مباحث کے اس مقالہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یورپ میں اشاعتِ اسلام قادیانی مبلغوں کی نام نہاد مساعی کی رہین منت نہیں ہے بلکہ تعلیم یافتہ یوروپین اپنے ذاتی مطالعہ کی بنا پر فوج در فوج حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ فَسُبْحَانَ مُحَمَّدٍ رَبِّكَ!

لیورپول انگلستان کی عدالت کے سالسٹر مسٹر عبداللہ کوئلم نے ایک مرتبہ یہ اعتراف کیا تھا کہ اسلام دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر تبلیغ و تلقین کے اعتبار سے عیسائیت سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ یہ مقالہ اسی اعتراف کی حدود کو زیادہ نمایاں کرتا ہے اور اس سے ان اسباب پر صحیح روشنی پڑتی ہے جو بیسویں صدی میں عیسائی معتقدات کے زوال اور اسلام کے عروج و ترقی کا باعث ہوئے ہیں۔

میں اپنے خطبہ کا افتتاح کلمۂ طیبہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" سے کرنا چاہتا ہوں کہ میرے جذبات مسرت کا تقاضا یہی ہے۔ میں نے دین اسلام کافی غور و فکر کے بعد قبول کیا ہے اور آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے اس دین کی تعلیمات اولاً اس کے موافقین کی کتابوں سے نہیں بلکہ اس کے مخالفین کی کتابوں سے حاصل کی ہیں۔

میں برطانوی ماں باپ کے گھر پیدا ہوا جو "پروٹسٹنٹ چرچ" سے وابستہ تھے اور میرے والد کی آرزو تھی کہ وہ مجھے اس چرچ کا ایک پادری دیکھے، اس لیے مجھے دینی کتب کے مطالعہ، اور مذہبی موضوعات پر مباحثہ میں مصروف دیکھ کر اُسے مسرت ہوتی تھی۔

مجھے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اگرچہ بظاہر عیسائیت کا پیرو ہے لیکن ۹۰ فیصدی انگریز عیسائیت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور میں بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میں خود اپنی زندگی میں ایک دن بھی عیسائیت کے مزعومہ اصول کا قائل نہ ہوسکا۔ آپ جانتے ہیں کہ عیسائیت کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ خدا کی ذات واحد تین شخصیتوں کا مجموعہ ہے اور یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جسے قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ اور بیٹا ہر زمانہ میں ساتھ ساتھ موجود ہوں جس کسی زمانہ میں باپ کا وجود فرض کیا جائے بیٹے کا وجود بھی اس کے ساتھ لازم ہو یہ ایک ناقابل فہم عقیدہ ہے جسے کوئی ذی ہوش تسلیم نہیں کرسکتا۔ بایں ہمہ عیسائی عقیدۂ تثلیث پر اڑے ہوئے ہیں خواہ اس کو سمجھتے نہ ہوں۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائی ۲۵ دسمبر کو مسیح علیہ السلام کا یوم ولادت مانتے ہیں۔ حالانکہ اس خیال کی تائید میں وہ کسی مسیح کی ہم عصر یا قریب العصر شخصیت کی سند پیش نہیں کرسکتے دراصل یہ ایک پوپ کی دماغی اختراع ہے جس کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں۔ بلکہ اصول حساب

کی شہادت اس کے برخلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ ۲۵ دسمبر قدیم بت پرستوں کا ایک مقدس دن تھا۔ یہ لوگ سورج دیوتا کے پجاری تھے۔ چنانچہ جب ان کا دیوتا سورج جسے یہ مصدر وجود اور چشمۂ حیات سمجھتے تھے زمانہ انقلاب سرمائی کو ختم کرلیتا تھا تو اس سے اگلے دن یہ عید مناتے تھے اور اسے اپنے دیوتا کا یوم ولادت مانتے تھے۔ اسی عقیدہ ولادت شمس کو عیسائیوں نے عقیدۂ ولادتِ مسیح میں تبدیل کرلیا۔ اور بت پرستوں کے قدیم دستور کے مطابق ۲۵ دسمبر کو عید قرار دیا۔ حالانکہ ان کے پاس کوئی علمی یا تاریخی سند نہیں جس سے وہ اس تاریخ کو یوم ولادت مسیح ثابت کرسکیں۔

اسی طرح قدیم بت پرست اعتدال ربیعی سے اگلے دن بھی عید مناتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آج ان کے خدا سورج دیوتا نے اس تاریکی پر فتح پائی ہے جو اس کے راستہ میں حائل ہوگئی تھی اور اب اس کی طاقت اور روشنی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ پرانے بت پرستوں کی پیروی میں جس طرح عیسائیوں نے یوم ولادتِ شمس کو یوم ولادتِ مسیح میں تبدیل کرکے عید منایا تھا اسی طرح انہوں نے یوم اعتدال ربیعی کو جو دراصل سورج دیوتا کے طاقت پانے کا دن تھا مسیح کے طاقت پانے کا دن قرار دے کر اسے عید القیامہ (ایسٹر) بنالیا۔ باپ بیٹے کا مسیحی عقیدہ بھی قطعی پرانے بت پرستوں کے عقائد سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بدھ مت کے ماننے والے بدھ کے بچپن کے زمانے کی تصویر اس کی ماں مایا کے ساتھ جس انداز سے بناتے ہیں بعینہٖ اسی انداز کی تصویر مسیح کے زمانہ طفولیت کی، ان کی ماں مریم کے ساتھ، ہم ہر گرجا میں منقوش پاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسیح کی وہ شخصیت جس کے عیسائی دعویدار ہیں کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر کوئی ناقد علمی طریقہ سے اس موضوع پر بحث کرے تو اسے اس بحث سے خالی ہاتھ واپس

آنا پڑیگا۔ اس کا اندازہ آپ مسیح کی ان تصویروں ہی سے کیجیے جو مختلف ممالک میں آپ پاتے ہیں آسٹریا کے گرجوں میں آپ مسیح کی صورت کچھ پائیں گے اور اٹلی کے گرجوں میں کچھ۔ آپ غور وفکر کے بعد بھی مسیح کی ان فرضی تصویروں سے ان کی اصلی صورت کا اندازہ نہ کر سکینگے۔

اسلام کے خلاف عیسائیت کا غلط پروپیگنڈا

واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے مختلف طبقوں میں اصول عیسائیت اور ذات مسیح کے متعلق بنیادی اختلافات ہیں۔ عیسائیت کی انہی الجھنوں نے دوسرے مذاہب کے مطالعہ پر آمادہ کیا۔ چنانچہ مذاہب عالم کے متعلق انگلستان کی لائبریریوں میں مجھے جتنی کتابیں ملیں میں نے اُن کا مطالعہ شروع کیا۔ یہاں میں نے دنیا کے ہر مذہب کے متعلق علمی کتابیں پائیں جن سے ان مذاہب کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ مگر جو کتابیں اسلام کے متعلق دیکھیں ان میں بجز طعن و تشنیع کے کچھ نہ تھا۔ ان کتابوں کا نچوڑ یہی تھا کہ اسلام کوئی مستقل مذہب نہیں ہے بلکہ وہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے۔

قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اگر واقعی اسلام ایسا ہی بے حقیقت مذہب ہے جیسا کہ یہ ظاہر کرتے ہیں تو پھر اس پر اس قدر اعتراضات، اس قدر طعن و تشنیع، اور اس کے مقابلہ و مدافعت کے لیے اتنی طاقت آزمائی کی کیا ضرورت؟ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر دین اسلام سے انہیں خوف نہ ہوتا اور اس کی قوت و زندگی سے مرعوب نہ ہوتے تو اس سے مقابلہ و مجادلہ اور اس توہین و تذلیل کے لیے اتنی محنت برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ اب میں نے طے کرلیا کہ دین اسلام کی جتنی کتابیں مجھے مل سکتی ہیں میں اُن سب کو ایک ایک کرکے دیکھونگا۔

معترضین کے اعتراضات سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ لوگ اگرچہ معاندانہ نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ مگر اس سے بھی اسلام کی طاقت و قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلام کے لیے دعوتِ

تبلیغ کا راستہ پیدا ہوتا ہے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن　　پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

اب جبکہ مجھے ہدایت نصیب ہوگئی، اور میں نے دل کے پردوں میں سے یہ آواز آتی سنی کہ میں مسلمان ہوں تو میں نے باقاعدہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوجانے کا ارادہ کرلیا مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ دار الخلافہ اسلام میں ایک مشہور مسجد ہے جس کا نام مسجدِ ایاصوفیہ ہے (اور وہ اسلام کا سینٹر ہے) تو میں نے اس مسجد کے پتہ پر اپنے حالات لکھ بھیجے۔ جب میرا خط قسطنطنیہ پہنچا تو محکمہ ڈاک نے اسے سلطان عبد الحمید کی خدمت میں روانہ کردیا۔ سلطان المعظم کے سکرٹری نے مجھے جواب دیا کہ آپ مشہور انگریز نومسلم شیخ عبد اللہ کوئلم بیرسٹر لورپول سے ملاقات کریں آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے ایسے مسلمان انگریز سے ملاقات کرکے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی جس سے میں کھل کر اپنے دل کا راز بیان کرسکوں اور آزادی کے ساتھ اپنے عقائد و خیالات کا اظہار کرسکوں۔ اور یہ عبد اللہ کوئلم وہ شخصیت ہے جس کی تنہا کوشش سے انگلستان میں پانسو سے زیادہ انگریز مسلمان ہوئے ہیں۔

اس دوران میں میرا ارادہ ہوا کہ اپنے قبول اسلام کی اطلاع والد کو کردوں۔ چنانچہ میں نے اطلاع کردی۔ میں اس واقعہ کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ عیسائیت کو خیرباد کہنے سے تو میرے والد کو قطعاً رنج نہ ہوا۔ مگر افسوس! کہ میرے قبول اسلام کی خبر سے ان کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اور ان کو اور ان کے ساتھ تمام خاندان کو اس سے بڑا رنج ہوا۔ ان کے اس رنج کو اگر کوئی چیز کم کرسکتی تھی تو وہ یہ خیال تھا کہ شاید میں ان کے کہنے سننے سے پھر (معاذ اللہ) اسلام کو ترک کرکے داخلِ مسیحیت ہوجاؤں۔ لیکن میں انتہائی مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اسلام کے دامن کو تھامے ہوئے پینتیس سال گذر گئے ہیں اور آج میں اس وقت کی بہ نسبت کہیں زیادہ اصولِ

اسلام کا معتقد اور اس کے محاسن و فضائل کا معترف ہوں۔ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے میں اس کے احکام پر عمل کرتا ہوں۔ میں ولی اللہ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر یہ ضرور ہے کہ میں فرائض اسلامی کو ادا کرنے میں کسر نہیں چھوڑتا۔

مسلمانوں کو عملی نمونہ بننا چاہیے

مجھے کامل یقین ہے کہ ایک دن تمام دنیا دین اسلام کے جھنڈے کے نیچے آجائیگی۔ مگر یہ اس امر پر موقوف ہے کہ پیروانِ اسلام اسلام کا نمونہ بنیں اور اصول اسلام کو عملی طور پر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مختلف ممالک اسلامی کے سفر کے دوران میں میں نے محسوس کیا ہے کہ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں ان پر ضعف پست ہمتی اور افتراق غالب ہے اور جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں وہ اصول دینی کی پیروی اور احکام دین پر عمل میں (جو قوت و ترقی کے اسباب ہیں) نسبتہً بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان، اپنے دین کی پیروی کریں اور ان کی سیرت پر اسلام کی عظمت کے آثار نمایاں ہوں تو یہ اسلام کی ایک عملی تبلیغ ہوگی جو اقوام عالم کو اسلام کے اصولوں کا گرویدہ بنادیگی

یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب غیر مسلم مسلمانوں کو احکام دین کے خلاف عمل کرتے دیکھتے ہیں تو وہ ان کے اعمال کے آئینہ میں دین اسلام کی مسخ شدہ تصویر دیکھ کر اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر انہیں یہ بتایا بھی جائے کہ جو کچھ مسلمان کر رہے ہیں اسلام کے احکام اس سے مختلف ہیں۔ تب بھی وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر احکام اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو سب سے پہلے متبعین اسلام ان پر عمل کرتے اور کسی صورت میں ان کی مخالفت نہ کرتے۔ مثال کے طور یوں سمجھیے کہ اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کی کسی تقریب میں شریک ہو اور وہاں اس کے سامنے شراب پیش کی جائے اور وہ اسے اپنی رواداری اور وسیع النظری کے اظہار کے لیے قبول کرلے تو اس کا یہ عمل

غیر مسلموں کے لیے اس امر کا ثبوت ہوگا کہ یہ مسلمان خود اپنے مذہب کی تعلیمات کی ترویج و انتشار کی صلاحیت کا منکر ہے۔ ورنہ سب سے پہلے وہ خود ان پر عمل کرتا اور اپنے عمل سے دوسروں کے لیے بہترین نمونہ بنتا۔ لہذا ہر مسلمان اپنے مذہب کا مبلغ بن سکتا ہے اگر وہ اس کے آداب اخلاق اور آئین و قوانین کی محافظت کرے جس طرح وہ اس کے لیے مانع بن سکتا ہے اگر ان امور میں مداہنت برتے۔

قرآن کریم صرف احکام دینی ہی کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی، دنیوی زندگی کا بھی بہترین رہنما ہے۔ اور یہ حقیقت میں نے اسی وقت محسوس کرلی تھی جب میں نے اس کا مطالعہ شروع ہی کیا تھا۔ حالانکہ میرا مطالعہ ان تراجم کے واسطہ سے تھا جن میں اس کی پاک تعلیم کو آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں جو ہر قسم کی عبادت کو خداوند جل و علیٰ کے لیے مخصوص کرتا ہو اور توحید خالص کے عقیدہ کا اعلان کرتا ہو۔ اور عیسائیت تو انسانوں کی پیشانیوں کو ان کے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے معبودوں کے سامنے گراتی ہے۔ بھلا اس کے اس شرک ظاہر کا اسلام کی توحید باہر سے کیا مقابلہ جس کی دعوت سورۂ اخلاص میں اس طرح دی گئی ہے:-

قل هو الله احد، الله الصمد، لم يلد ولم يولد، ولم يكن له كفوا احد.　　کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، اور وہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اسے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قرآن نے جس خدا کی عبادت کے لیے بندوں کی رہنمائی کی ہے وہ ہر عیب سے بری اور ہر صفت کمال سے متصف ہے۔ جب انسانیت جہالت اور بچپن کے زمانہ سے گزر رہی تھی تو وہ ہاتھ اور قلم کے بنائے ہوئے خداؤں سے کھیلتی تھی، افسوس کہ آج

میں بھی یہ حماقت دیکھی جا رہی ہے۔ خدا کے تخیل کے متعلق عقل انسانی کی طفلانہ لغزشوں کے تماشے آپ اگر جاؤں میں دیکھ سکتے ہیں لیکن انسانیت کے شباب کے مناظر مسجدوں میں نظر آئیں گے۔ جہاں تصویر ہوگی نہ مجسمے جو عبادت کرنے والوں کے دل غیر اللہ کی طرف پھیریں حالانکہ خدائے واحد ہی تمام کمالات کا مرکز ہے اور عبادت کا مستحق۔ انسانیت کو اس رفیع مرتبہ پر پہنچانے کا سہرا ہادی اعظم نبی اکرم، محمد رسول اللہ و خاتم النبیین کے سر ہے جنھوں نے بتوں کو توڑا اور جلی و خفی شرک کے آثار مٹا کو مٹا دیا اور انسانیت کو ذلت کے مقام سے نکال کر عزت کے اس مرتبہ پر فائز کیا جو ہر طرح اس کے لائق تھا۔

اسلامی برادری کی جاذب نظر خصوصیت یہ ہے کہ آپ کرۂ زمین پر کسی ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو چلے جائیں آپ اجنبیت محسوس نہ کرینگے بلکہ آپ کو عزیزوں کی جگہ عزیز اور بھائیوں کی جگہ بھائی ملیں گے، لہذا اے حلقہ بگوشانِ اسلام! ہمیں نہ بالشویزم کی ضرورت ہے اور نہ کمیونزم کی۔

اسلامی اخوت و مساوات

سیاسی مذاہب جن خوبیوں کے دعویدار ہیں وہ ہمارے دین میں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور جن خرابیوں سے یہ آلودہ ہیں اُن سے ہمارا دین پاک ہے۔ یہ ایک معتدل مذہب ہے اور ایک عملی پروگرام ہے جو ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں انسانی سوسائٹی کی فوز و فلاح کا ضامن ہے۔ اخوت اسلامی کے نام سے دنیا سب سے پہلے اسی کے ذریعہ واقف ہوئی، یہ ایک "جمعیۃ اقوام" ہے جو اغراض و اہوا سے بری ہے اور اس کے رکن جنسی وطنی اختلافات سے ناواقف ہیں یہ سب اخوت کی ایسی مضبوط زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں جس کے حلقوں کو امیری و غریبی اور اس قسم کے دوسرے ناپائدار مظاہر جدا نہیں کر سکتے۔ جب مجھے دینِ اسلام کے یہ اصول معلوم ہوئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام اپنی ان

خوبیوں کی بنا پر تمام سماوی و ارضی شریعتوں سے ممتاز ہے اور میں پہلے سے زیادہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔

دینِ اسلام کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے اپنی طرف ملتفت کیا اور جس سے اُس کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوئی وہ "تحریمِ شراب" ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جس سے دوسرے مذاہب کی کتابیں ہمیں خالی نظر آتی ہیں۔ بلکہ عیسائیت میں تو ہم اس اُم الخبائث کی ترغیب پاتے ہیں۔ مثلاً "سینٹ پولس" کی اپنے شاگرد کو ہدایت کہ "وہ تھوڑی شراب اپنے معدہ کی اصلاح کے لیے پیا کرے" یا پانی سے بھرے ہوئے برتنوں کا شراب میں تبدیل ہو جانے کا واقعہ" مجھے تسلیم ہے کہ اس مذہب کے پیشوا شراب سے احتراز کرنے کی ہدایت کرتے بھی نظر آتے ہیں لیکن ہم کتب مقدسہ کی ان نصوص سے بھی آنکھیں نہیں بند کر سکتے جو صراحۃً شراب پینے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ پھر بتائیے ہم کیا مانیں اور کیا نہ مانیں؟ بعض اشخاص کی تحریر یا کتب مقدسہ کی تحریض؟

ابھی کچھ عرصہ ہوا امریکہ نے شراب کے خلاف جہاد شروع کیا تھا مگر باوجود تمدن جدید کے تمام وسائل کے اسے اس معرکہ میں پسپا ہونا پڑا۔ کیا امریکہ کی اس معرکہ آرائی کا رسول اکرم مصلح اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے کوئی مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ جوں ہی آپ نے شیدایانِ اسلام کو بتایا کہ ان کے خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے تو بے تامل شراب کے مٹکے الٹ دیے گئے اور برتن توڑ دیے گئے اور سڑکوں پر شراب کی ندیاں بہ گئیں۔ یورپ اور امریکہ کے فہمیدہ انسان جن کی ہدایات و نصائح کی وجہ سے امریکہ میں کچھ عرصہ شراب کی بندش رہی، خواہ زبان سے اعتراف نہ کریں مگر ان کے دل یقیناً انسانی سوسائٹی کی اصلاح میں محمد عربیؐ کے حسن تاثیر اور آپ کی رہنمائی کی کامیابی کا اقرار کر رہے ہیں۔

ہمیں طب بتاتی ہے کہ خنزیر کا گوشت صحت کے لیے سخت مضر ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خاص قسم کے جراثیم پائے جاتے ہیں جن کے متعلق تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ آگ ان پر کوئی اثر

نہیں کرسکتی اور اُن کی مضرت کو دور نہیں کرسکتی۔ اگرچہ عیسائیوں کی کتب مقدسہ خنزیر کے گوشت کی ممانعت کرتی ہیں مگر دنیا کے ہر حصہ میں عیسائی اسے بالعموم استعمال کرتے ہیں اور اس کی طبّی مضرت اور اپنے مذہب کی ممانعت کی پروا نہیں کرتے، برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے پاک مذہب کے حکم کے مطابق اس سے قطعاً محترز ہیں اور دنیا کے کسی حصہ میں اس کا استعمال نہیں کرتے۔

بلاشبہ چونکہ اکثر عیسائی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جو انجیل ان کے ہاتھوں میں ہے وہ مسیح علیہ السلام سے بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ اور چونکہ انہیں ان بنیادی اختلافات کا علم ہے جو ان کی دینی کتابوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اس علم و وقوف نے انہیں اپنے احکام دین سے اعراض پر جری کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کو کامل یقین ہے کہ جو قرآن آج ان کے ہاتھوں میں ہے وہ وہی قرآن ہے جو صاحب وحی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کا فرق نہیں۔

اعتقادی حقائق

حقائق مذکورہ کی معرفت کے بعد، جب میں نے عام معتقدات اسلامی کا جائزہ لیا تو میں نے تمام اسلامی عقائد عقل کے عین مطابق پائے، توحید خالص کا عقیدہ جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے صحیح ترین عقیدہ ہے جس سے انسان واقف ہو سکا ہے۔ توحید الوہیت، توحید ربوبیت، اور خالق عالم کے لیے تمام صفات کمال کے اثبات میں وہ منفرد و مکمل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام خدا کے تمام پیغمبروں کی بھی تصدیق کرتا ہے، علیہم صلوٰۃ اللہ وسلامہ۔

مسلمان ایک دوسرے کو جو سلام کرتے ہیں وہ کیا خوب ہے! اس کے معنی کیسے دلپذیر ہیں اور وہ طریقہ جس سے سلام کیا جاتا ہے کیسا دلکش ہے! خصوصاً سر اور دل کی طرف ہاتھ سے اشارہ، کیونکہ جسم انسانی میں یہی دونوں اعضا بہتر و برتر ہیں۔ بھلا اس سلام کا اٹلی کے فیسٹ سلام سے

یا دنیا کی دوسری قوموں اور جماعتوں کے سلام سے کیا مقابلہ ؟

بعض یوروپین الزام لگاتے ہیں کہ "اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے" یہ ایک ذلیل جھوٹ ہے اور الزام لگانے والے خود جانتے ہیں کہ یہ غلط اور غیر معقول ہے۔ کیونکہ یہ اگر ایک طرف تاریخ کی تصریحات کے خلاف ہے تو دوسری طرف اصول اسلام کے۔ اگر اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہوتا تو کیا ممالک اسلامیہ میں آج ان گرجاؤں، صنم خانوں اور غیر اسلامی اوضاع و اطوار کا جو اسلام کے زمانۂ شباب سے اپنی اصلی حالت میں چلے آتے ہیں وجود بھی باقی رہتا۔ اور پھر قرآن مجید کی آیات بینات کے سامنے ان کے ان ہفوات کی کیا حیثیت رہجاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ	دین میں کوئی جبر نہیں۔
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُسَيْطِرٍ	(اے نبی) آپ ان کافروں پر مسلط نہیں کیے گئے۔
لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ	تمہیں تمہارا دین مبارک اور مجھے میرا دین۔

تلوار کی دھار سے مذہب کی تبلیغ تو خود ان کا اپنا طریقہ رہا ہے۔ مذہب کے نام پر جو مظالم اسپین کے مسلمانوں پر روا رکھے گئے اُن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں رنگین ہیں اور عیسائیوں کی پیشانیاں داغدار ،ان کو خود اس کا اقرار ہے کہ جب شارلمان جرمنی میں داخل ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ جو سیکسن عیسائیت قبول نہ کرے اسے تلوار سے اُڑا دیا جائے۔ بہرکیف، اگر کوئی مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے تو وہ اسلام نہیں بلکہ کوئی اور مذہب ہے۔

برادران اسلام! وقت زیادہ ہوگیا ہے۔ میں اس موضوع پر آپ سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ سب نہ کہہ سکا۔ میں دوبارہ آپ کے سامنے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جس قدر اسلام کے متعلق میری معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے میرے دل میں اس کا احترام و ایقان زیادہ ہوتا جاتا ہے مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میں نے مکمل مذہبی معلومات حاصل کرلی ہیں لیکن بہ قدر ضرورت میں

ان سے ضرور بہرہ مند ہو چکا ہوں۔ مجاہد اعظم سیف اللہ خالد بن ولیدؓ نے فتوحات اسلامیہ میں جوش مجاہدانہ، بہادرانہ، اور رحیمانہ طرز عمل اختیار کیا اور اس سے دین اسلام کو جو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی چونکہ میرے دل میں اس کی بڑی قدر ہے اس لیے میں نے اس مجاہد کے نام پر اپنا نام رکھنا پسند کیا ہے۔

نوجوانان اسلام! قبل اس کے کہ میں اس ممبر سے اُتروں آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ پر اسلام کی طرف سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس کو آپ کی جان فروشی اور سخت کوشی کی ضرورت ہے۔ ہم خادمان اسلام اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آپ لوگ اسلام کی ترقی و تبلیغ کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنی امکانی کوشش میں کسر نہ چھوڑیئے تاکہ اس انجمن کے اغراض کی تکمیل ہو اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت جو اس کے مقاصد ہیں اُن کی تحصیل ہو۔ آپ انجمن کے عہدیداروں کے بھروسہ پر نہ رہیے۔ انہیں بہت سے دفتری کام ہیں، اصل اور ٹھوس کام آپ کو کرنا ہے، اگر آپ مل جل کر اُسے انجام دینے کے لیے تیار رہوں، تاکہ یہ شاندار ادارہ ترقی کی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس وقت میں نے آپ سے اس طرح گفتگو کی ہے جس طرح ایک دوست اپنے دوستوں سے کرتا ہے مجھے معلوم ہے کہ ایک مقرر کو اپنے مخصوص حدود میں رہ کر تقریر کرنی چاہیے مگر دوستانہ گفتگو اس پابندی سے آزاد ہے۔ بھائی اپنے بھائیوں سے جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان باتوں کو توجہ سے سُنا اور مترجم حضرات کا بھی جنہوں نے ترجمانی کی زحمت گوارا کی، کیونکہ مجھے افسوس ہے کہ میں عربی زبان میں آپ کو مخاطب کرنے سے معذور تھا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

لطائفِ ادبیہ

غزل کا دامن کسی ایک مضمون تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ اُس میں فلسفہ، حکمت، تصوف، رموز طریقت معرفت ایسے مضامین بھی بیان ہوتے ہیں لیکن سب کے لیے انداز بیان اور تشبیہات واستعارات ایک ہی ہیں۔ وہی بادہ وجام وسبو ہے کہ اُس کا ذکر کسی رندمے آشام کی زبان سے ہو تو لوگ ان سے مُراد دنیا کی شراب لیتے ہیں، لیکن اگر ان چیزوں کا تذکرہ خواجہ حافظ، عراقی، خسرو اور نظامی کی زبان سے ہو تو شراب فوراً شراب معرفت بنجاتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ غزل میں جو مضامین بیان کیے جاتے ہیں وہ باعتبار مفہوم اس قدر متنوع ہوتے ہیں کہ ایک صوفی اور رند دونوں اُس سے یکساں طور پر محظوظ وشادکام ہوتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اُٹھاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ

مقصد ہی ناز وغمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

زلف وکمر اور گل وبلبل کی داستانوں سے ہمارے بعض غزل گو شعراء نے جہاں مذاقِ عوام کو پست کیا ہے، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی ایسے شعراء نے اپنی غزلوں سے اُردو ادب کو لطیف ونفیس بھی بنا دیا ہے۔ "برہان" میں صرف وہی غزلیں اشاعت پذیر ہونگی جو اُس کے معیارِ تغزل پر راست آئیں۔

"برہان" اگرچہ ایک مذہبی وعلمی رسالہ ہے لیکن وہ ادب کو بھی مذہب کے ایک معاون کی حیثیت سے قبول کرتا ہے اور ملک میں ایک ایسا عام ادبی رجحان پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے انسانی فطرت کی حقیقی ضرورتوں کو امداد مل سکے۔ نہال صاحب سیوہاروی کی مسلسل غزل

اسی سلسلہ کی پہلی چیز ہے :-

پھر جیبِ تجلی جلوہ بناتے ہوئے آئے
بجلی سی حواسوں پہ گراتے ہوئے آئے

ہر گام پہ تھا حُسن کا نیرنگ نرالا
تصویر پہ تصویر دکھاتے ہوئے آئے

انداز قیامت کے ہیں رفتار میں اُن کی
سوتے ہوئے فتنوں کو جگاتے ہوئے آئے

بے ہوش مجھے مدبھری آنکھوں سی بنایا
مستانہ نگاہوں سی پلاتے ہوئے آئے

اللہ رے وہ تابشِ رخسار کا عالم
ہر ذرہ کو خورشید بناتے ہوئے آئے

آنکھوں میں مری پھر گئی کیفیت ایمن
موسیٰ کا وہ افسانہ سُناتے ہوئے آئے

کس درجہ دل آویز تھا آنے کا یہ انداز
بکھری ہوئی زلفوں کو بناتے ہوئے آئے

جس رہ میں کیا پائے خدائی نے تردد
اُس راہ میں اک باغ لگاتے ہوئے آئے

کیا حسنِ تکلم تھا کہ ہر جنبشِ لب سے
سو پھول تبسم کے کھلاتے ہوئے آئے

ہر فردِ گرامی سے لیا خطِ غلامی
ہر گردنِ سرکش کو جھکاتے ہوئے آئے

آئے تو بجز اُن کے نظر کوئی نہ آیا
وہ عالمِ ایجاد پہ چھاتے ہوئے آئے

ہر خرمنِ جذبات میں اک آگ لگا دی
پھر سوزِ محبت کو بڑھاتے ہوئے آئے

پھر قصرِ تمنا میں ہوا جشنِ چراغاں
اُجڑی ہوئی محفل کو سجاتے ہوئے آئے

شکوہ نہ رہے تا مجھے بیگانہ وشی کا
آئینِ تکلف کو اُٹھاتے ہوئے آئے

گویا کبھی مانوسِ تغافل ہی نہ تھے وہ
یوں میرے دل و جاں میں سماتے ہوئے آئے

طالع مرا بیدار ہوا خوابِ گراں سے
اس نیند کے ماتے کو جگاتے ہوئے آئے

پُر کیف کیا عشرتِ امروز سے مجھ کو
ذکرِ غمِ دوشیں کو بھلاتے ہوئے آئے

کیا خوب نہال آج کیا دادِ سخن سے
میری ہی غزل مجھ کو سناتے ہوئے آئے

شئونِ علمیہ

امریکہ کا طلائی ذخیرہ

امریکہ کی قومی جغرافیائی اکاڈمی نے اپنے ملک کے مالی استحکام کے متعلق تازہ اعداد و شمار شائع کیے ہیں، ان کی رو سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حکومت امریکہ کے پاس سونے کا جو ذخیرہ سکے کی صورت میں موجود ہے اس کا اندازہ دس بلین ڈالر (دس ارب ڈالر) کیا جاتا ہے یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ اس سے پہلے کسی حکومت نے سونے کی صورت میں اتنی دولت جمع نہیں کی۔ خالص سونا اس کے علاوہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر امریکہ کے تمام سونے کے ذخیرہ کو جمع کیا جائے تو اس سے سات لاکھ پندرہ ہزار طلائی اینٹیں تیار کی جاسکینگی۔ جن میں سے ہر اینٹ کا وزن ۴۰۰ اونس اور ہر اینٹ کی قیمت چودہ ہزار ڈالر ہوگی (ڈالر قریب قریب عہ کے برابر قیمت رکھتا ہے) اگر یہ اینٹیں امریکہ کے محکمہ مفاد عامہ کو دے دی جائیں تو وہ نیویارک سے سان فرانسسکو تک سڑک بنا سکتا ہے۔

حکومت امریکہ نے اپنی اس دولت کی حفاظت کے لیے ساحلِ بحرِ اٹلانٹک سے چھ سو میل دور کنٹکے میں ناکس کے مقام پر ایک مضبوط قلعہ تیار کیا ہے، اس کی تیاری میں اینٹوں کی جگہ مستحکم پتھر اور پانی کی جگہ فولاد سیال استعمال کیا گیا ہے۔ ذخیرہ کی حفاظت کے لیے بہترین اسلحہ اور فوجی انجنیروں کے دستے متعین ہیں۔

حکومت کی اس دولت کے علاوہ عوام کی دولت اعداد و شمار کی حدود سے متجاوز ہے اس کے علاوہ دنیا بھر کے دولتمند اپنا روپیہ امریکہ میں جمع کرا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ

آئندہ عالمگیر جنگ کے زمانہ میں امریکہ ہی ایسا ملک ہوگا جو اپنی ثروت کی بنا پر اپنی آزادی کی حفاظت کر سکیگا۔

آزادی اور ثروت

دنیا کو سیاسی آزادی سے زیادہ اقتصادی آزادی کی ضرورت ہے۔ روسو کا قول ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ساری دنیا میں پا بہ زنجیر غلام نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلامی دنیا میں موجود ہے، انسان غلام ہے اور اجتماعی حیثیت سے اس کی یہ غلامی زمین کی روشن پیشانی کا ایک سیاہ داغ ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی غلامی کے بنیادی اسباب میں قوموں کے افلاس اور ثروت کو خاص دخل ہے۔ اس زمانہ میں انسانوں کو انسان ہی غلام بناتے ہیں۔ غلام بنانے والوں کو شیطان کہا جائے یا انسان بہرحال ان کے ہر اقدام کی بنیاد دولت کی خواہش اور ثروت کے حصول پر ہے۔

آزاد قوموں کی آزادی کا انحصار اُن کی ثروت پر ہے اور آج کل نبرد و پیکار اور جنگ و جدال کی تمام قوتیں دولت و ثروت میں اضافہ ہی کے لیے ایک دوسرے کے مقابلہ میں نظر آرہی ہیں۔ اس زمانہ کی حکومتوں میں سے فرانس اپنی ثروت میں بہت نمایاں ہے۔ انگریزی حکومت کو اپنی قوم کی دولت پر اعتماد ہے۔ اٹلی اور جرمنی کفایت شعاری اور سائنٹفک اصولوں سے اپنے خزانوں کو بھر رہے ہیں۔ جاپان کی ثروت اس کی صنعت اور تجارت ہے اور روس کی دولت اس کے پانچ سالہ پروگراموں اور محنت کش مزدوروں کی اُمیدوں کا حاصل ہے لیکن ان تمام حکومتوں کے مقابلہ میں امریکہ سب سے زیادہ صاحب ثروت اور دولتمند ملک ہے۔

امریکہ کی ثروت

مجلس اقوام کے ایک جہانگرد ملازم نے ایک اخبار میں اقوام وملل کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اہل امریکہ کے خصائص کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:۔

ایک امریکن کروڑ پتی ہوتا ہے۔ دو امریکن ملتے ہیں تو لازماً شراب پیتے ہیں اور تین امریکن جمع ہوتے ہیں تو ہمزبان ہو کر ترک شراب کا وعظ کہتے ہیں۔ ہر امریکن کا کروڑ پتی ہونا آج کل ایک ایسی حقیقت ہو گئی ہے جس کے یقین کرنے میں کوئی خاص دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ایک زمانہ میں جنوبی امریکہ کی مملکت (پیرو) کے ایک لارڈ نے اجنبی استیلاء سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اہل ہسپانیہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر وہ پیرو کو آزادی دینے کو تیار ہوں تو وہ ایک ۲۰ فٹ مربع مکان قد آدم سونے سے بھر کر ان کو پیش کریگا لیکن آج اگر کوئی شخص حکومت امریکہ سے سونے کا مطالبہ پیش کرے تو وہ ایک بارہ منزل کی عمارت کو سونے سے بھر کر دے سکتی ہے۔

"ح"

نقد و نظر

"مسلمانون کا روشن مستقبل"

مولانا سید طفیل احمد صاحب (علیگ) ہندوستان کے اُن نامور بزرگوں میں سے ہیں جو اپنی ٹھوس اور پُر از معلومات تصنیفات کے ذریعہ ملک کی مفید اور تعمیری خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ابھی حال میں آپ کی گرانقدر تصنیف "مسلمانون کا روشن مستقبل" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ جو عام و خاص میں خلعت قبول و شہرت حاصل کر رہی ہے۔ ہم ذیل میں قارئین سے اس کا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔

یہ کتاب نظامی پریس بدایوں سے ۲۲×۲۹/۱۶ سائز پر ۶۰۸ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ اگرچہ کتابت و طباعت اوسط درجہ کی ہے لیکن معنوی خوبیوں کے لحاظ سے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہندوستان کا ہر نوجوان اس کا بنظر غائر مطالعہ کرے اور فاضل مصنف نے بڑی کدو کاوش اور محنت و مشقت کے بعد جو حقائق جمع کر دیے ہیں اُن کو ذہن نشین کرنے کے بعد اپنے آغاز و انجام پر ایک مبصرانہ نگاہ ڈالے۔

یہ کتاب دس ابواب اور متعدد فصول پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مستند انگریزی مورخین و مصنفین کے حوالہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ ہر قوم کے بنیادی حقوق کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں آپ نے دس حقوق شمار کرائے ہیں۔ باب دوم میں مسلمانوں کے دورِ آخر کا ایک حسرت انگیز خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اور مستند حوالوں سے بتایا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اقوامِ مفتوحہ کے یہ سب حقوق کس درجہ محفوظ تھے اور وہ کس طرح اہل ہند کی تعلیم، مذہب، تہذیب، شہری حقوق و مساوات اور حقوق ملکیت میں

آزادی وغیرہ کا خیال رکھتے تھے۔ تیسرے باب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ڈھائی سو سال کی مختصر مگر جامع تاریخ قلمبند کی گئی ہے اور مدلل طریقہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس طرح ہندوستان کو اپنی طمع زر وسیم کا شکار بنایا۔ اور کیونکر وہ سیاسیات ہند میں رفتہ رفتہ دخل انداز ہوکر ایک تجارتی کمپنی سے سیاسی جماعت میں منتقل ہوگئی اور بالآخر ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام واستقرار کا باعث ہوئی یہ باب بحد عبرت آفریں اور اثر انگیز ہے۔ یہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں بدنصیب ہندوستان اپنی شکل کے باریک سے باریک خط وخال بہت آسانی سے دیکھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ "مشاطۂ فرنگ" جس کو عروس ہند کی حنا بندی و زینت بخشی کے اتنے بڑے دعاوی ہیں اس نے دراصل اس صورت زیبا کو بنایا اور سنوارا ہے یا اُس کو بگاڑ کر اور اُس کے قدرتی حسن وجمال کو لوٹ کر اب اس قابل بنا دیا ہے کہ اُسے آئینہ میں خود اپنی صورت دیکھتے ہوئے شرم آنے لگی ہے۔ باب چہارم سے اُن تحریکات کا ذکر شروع ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک آزادی کے اثرات مابعد کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف نے باب چہارم کو چار فصلوں پر تقسیم کیا ہے جن میں سے فصل اوّل میں بعنوانِ "اصلاح معاشرت و مذہب کا پہلا دور" آپ نے حضرت مولانا سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک، سکھوں سے آپ کی جنگ کے اسباب اس جہاد کے انجام، مسلمانوں کی مذہب کے لیے قربانیاں اور کیرکٹر کی مضبوطی کی چند مثالیں بیان کرکے اس فصل کو بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز بنا دیا ہے۔

فصل دوم میں مسلمانوں کی قدیم تعلیم پر بحث کی گئی ہے اور اس کے ذیل میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، اور علمائے دہلی ولکھنؤ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اُس عہد کے نظام تعلیم، اور طلباء کی معاشرت پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ فصل سوم میں جدید تعلیم کی اشاعت، اس کے اغراض ومقاصد اُس کے اثرات ونتائج اور اُس تعلیم کو عام کرنے سے انگریزوں کا جو نقطۂ نگاہ تھا ان سب اُمور پر کسی قدر

بسیا تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ یہ باب اُن "فریب خوردگانِ ناظورۂ فرنگ" کی آنکھیں کھولنے کے لیے بہت کافی ہے جو اپنا سب کچھ لٹا چکنے کے بعد بھی اپنے آپ کو "سرمایہ دار" سمجھ رہے ہیں۔ اور جن کے نزدیک "تعلیم جدید" مائدۂ آسمانی سے کم نہیں ہے۔ فصل چہارم میں جدید تعلیم اور ملازمت میں مسلمانوں کی پسماندگی کی المناک مگر خرد افزا داستان بیان کی گئی ہے۔

باب پنجم سرسید احمد خان کی تحریک اور اُس کے مبادی و علل اور عواقب و نتائج کے ذکر کے لیے وقف ہے۔ اس باب میں فاضل مصنف نے ایک مقام پر بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ عام طور پر مشہور یہی ہے کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی رغبت دی تو علماء کرام نے اُن کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ سرسید احمد خاں پر کفر کے فتاویٰ لگانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ ایک عام اعتراض ہے جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے علماء پر کیا جاتا ہے لیکن مولانا طفیل احمد صاحب جو خود علی گڈھ کے پُرانے تعلیم یافتہ اور سرسید کے شاگردوں میں سے ہیں اس اعتراض کو غلط بتاتے ہیں اور حیات جاوید کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مگر کوئی اعتراض سرسید کے مخالفین کی طرف سے مطلق انگریزی تعلیم کے متعلق درج نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو زبان انگریزی کی تعلیم سے اختلاف نہ تھا۔ بلکہ اُس طرز معاشرت سے تھا جس کو سرسید بقول مولانا حالی کے تعلیم سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے تھے، اور جس سے مسلمان بھڑکتے تھے"[1]

پھر اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:۔

"مگر سب سے زیادہ مخالفت سرسید کی اس وجہ سے ہوئی کہ خود سرسید نے عربی مدارس کی تعلیم و تربیت پر سخت حملے کیے تھے۔

[1] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ۱۹۹۔

فرمائیے کیا اب بھی آپ سرسید کو بے گناہ و بے خطا، اور علماء ہی کو مجرم و گنا ہگار قرار دیتے ہیں؟

باب پنجم کی فصل دوم کا آغاز "اصلاح معاشرت و مذہب کا دوسرا دور" کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس میں اصلاح معاشرت و مذہب کے وجوہ اور انگریزی تمدن کے اثرات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد فصل سوم میں علیگڈھ کالج کا تعلیمی پروگرام، اور اُس کی مالی مشکلات اور اندرونی جھگڑے، کالج کا مالی غبن، اور مسلم یونیورسٹی کا قیام اور پھر جامعہ ملیہ دہلی کی تاسیس ان سب پر ایک عمیق نظر ڈالی گئی ہے۔ فصل چہارم بھی مسلمانوں کی جدید تعلیم سے متعلق ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات بیان کی ہیں۔ باب ششم، اور باب ہفتم، اور باب ہشتم میں ہندوستان کی سیاسی بیداری کی مکمل اور عبرت انگیز تاریخ بیان کی گئی ہے۔ جس میں انڈین نیشنل کانگریس۔ صوبۂ بنگال کی تقسیم، سرسید کا سیاسی مسلک۔ اور مسلم لیگ اور محمڈن پولیٹکل آرگنائزیشن کا قیام وغیرہ اہم مباحث پر دادسخن گستری دی گئی ہے۔ باب نہم میں مسلمانانِ ہند کے سیاسی کارناموں کا تذکرہ ہے جس میں تحریک خلافت، جمعیۃ علماء اور مسلم لیگ اور گول میز کانفرنس وغیرہ کی تفصیلی روئداد مندرج ہے۔ آخر باب دہم میں مسلمانوں کی سرگزشت کا خلاصہ اور جدید آئین کی روشنی میں بنیادی حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور پھر آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ آئندہ سیاسی جنگ میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہوگا؟ اور اس کے متعلق بہت کچھ اُمید افزا خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ پھر کتاب کے ضمیمہ جات میں سیاسی جماعتوں کی فہرست مع سال و مقام اجلاس اور نام صدر کے بہت مکمل دی گئی ہے۔

مولانا طفیل احمد صاحب کا یہ کارنامہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی انقلاب کے محرکاتِ اولیٰ کی صف میں شمار کیا جائیگا۔ حق یہ ہے کہ آج تک کو کسی ٹھوس اور خشک مضمون پر بہت زیادہ محققانہ کتاب کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ مذکورہ بالا جیسی اہم کتابوں کی ہے۔ جس طرح انقلاب

فرانس کی تاریخ کے ساتھ والٹیر (Voltaire) اور روسیو (Rousseau) اور
مونٹیسکیو (Montesquieu) کا نام زندہ ہے۔ اسی طرح ہندوستان کا مورخ جب
میں آنے والے عظیم الشان انقلاب کی تاریخ قلمبند کریگا تو اُس کے اسباب و محرکات میں
کے "روشن مستقبل" کے نامور مصنف کا نام جلی عنوان سے لکھیگا۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کا ایک
ایک نوجوان ہندو ہو یا مسلمان اس کتاب کو حرزِ جان بنا کر رکھے اور اس کا بامعان مطالعہ کرے۔

آخر میں ہم کو مصنف گرامی سے ایک شکایت بھی کرنی ہے، وہ یہ کہ مولانا اپ[illegible]
پر یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ دار العلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے مسلمانوں میں
جو عظیم الشان تعلیمی انقلاب پیدا کیا ہے وہ خود اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے۔ پھر دار العلوم نے مسلمانوں کی
مذہبی خدمات کے علاوہ جو شاندار سیاسی خدمات انجام دی ہیں وہ بھی ہندوستان کی کسی اسلامی سیاسی
جماعت کی خدمات سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

حقیقت بیں نگاہ سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے آغاز میں صرف حضرت شیخ الہند
رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تنہا ذات گرامی تھی جس نے اپنے عمل محکم سے ہندوستان کے خفتہ مسلمانوں
میں بیداری کی روح پیدا کی، اور آج جو کچھ سیاسی حرکت نظر آ رہی ہے وہ دراصل حضرت رحمۃ اللہ علیہ
کی ہی ذات ستودہ صفات کے مجاہدانہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ پھر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ علیگڈھ اور
مسلم لیگ وغیرہ کے لیے تو صفحے کے صفحے لکھ دیے جائیں اور دار العلوم دیوبند کا تذکرہ صرف چھ
سات سطروں میں ہی تمام کر دیا جائے۔ ہم کو قوی اُمید ہے کہ آئندہ اس کتاب کا جو ایڈیشن شائع
ہوگا مولانا اُس میں اس چیز کی پوری تلافی کر دینگے۔

"س"

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) ندوۃ المصنفین کا دائرۂ عمل تمام علمی حلقوں کو شامل ہے۔

(۲) ا۔ ندوۃ المصنفین ہندوستان کے اُن تصنیفی، تالیفی اور تعلیمی اداروں سے خاص طور پر اشتراکِ عمل کریگا جو وقت کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ملت کی مفید خدمتیں انجام دے رہے ہیں اور جن کی کوششوں کا مرکز دینِ حق کی بنیادی تعلیمات کی اشاعت ہے۔

ب۔ ایسے اداروں، جماعتوں اور افراد کی قابلِ قدر کتابوں کی اشاعت میں مدد کرنا بھی ندوۃ المصنفین کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔

محسنین۔

(۳) جو حضرات کم سے کم پچیس روپے (۲۵) سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے اُن کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارے کی طرف سے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی اور رسالہ بُرہان بطور نذر پیش کیا جائیگا۔

معاونین:۔

(۴) جو حضرات بارہ روپیہ سال پیشگی عنایت فرمائینگے اُن کا شمار ندوۃ المصنفین کے دائرۂ معاونین میں ہوگا۔ اُن کی خدمت میں بھی سال کی تمام تصنیفیں اور ادارے کا رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے) بلاقیمت پیش کیا جائیگا۔

احبار:۔

(۵) چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے حلقۂ احبار میں داخل ہونگے
ان حضرات کو ادارے کا رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور اُن کی طلب پر ادارے کی تمام تصنیفیں نصف
قیمت پر پیش کی جائینگی۔

(۶) معاونین اور احبار کے لیے یہ سہولت بھی رکھی گئی ہے کہ اگر کسی وجہ سے یکمشت بارہ
روپے یا چھ روپے ادا کرنا ممکن نہ ہو تو معاونین یہ رقم تین تین روپے کی چار قسطوں میں ہر سہ
ماہی کے شروع ہی میں عنایت فرمادیں اور احبار تین تین روپے کی دو قسطوں میں ہر ششماہی کی
ابتدا میں۔

چندہ سالانہ رسالہ برہان
پانچ روپے

خط وکتابت کا پتہ:۔

منیجر رسالہ "برہان" قرول باغ نئی دہلی

جید برقی پریس دہلی میں طبع کراکر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے
دفتر رسالہ برہان قرول باغ نئی دہلی سے شائع کیا

برہان

جلد اوّل — شمارہ (۲)

جمادی الاخریٰ ۱۳۵۷ھ مطابق اگست ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

نظرات

وردھا تعلیمی اسکیم

ہندوستان کے بچوں اور بچیوں کی ابتدائی تعلیم کی اسکیم جو وردھا تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہے ہماری وطنی حکومتوں کی ایک مستحسن کوشش ہے۔ اس اسکیم میں اخلاقی تربیت کے ساتھ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی عملی تجاویز کو شامل کیا گیا ہے۔ جہاں تک اس اسکیم کی افادی حیثیت کا تعلق ہو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسکیم لارڈ مکالے کے اُس خواب کا جواب ہے جو اُنہوں نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے جاری کرانے پر زور دیتے وقت ۱۸۳۵ء میں دیکھا تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر اس پر خلوص اور سچائی کے ساتھ عمل کیا گیا تو اس سے ہندوستان کے اخلاقی، اقتصادی اور معاشرتی حالات بہت کچھ خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

اس اعتراف کے ساتھ چند ایسی باتیں بھی ہیں جن کی طرف ہمیں ارکان کمیٹی کو متوجہ کرنا ہے۔ سب سے پہلی اور ضروری چیز یہ ہے کہ اس اسکیم کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کا جز ضرور شامل ہونا چاہیے۔ مذہبی تعلیم سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ بچوں اور بچیوں کو دینیات کی مکمل تعلیم دی جائے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ مذہب کی اعلیٰ تعلیم کو تو اسٹیٹ کی نگرانی اور اُس کے تصرف سے بالکل آزاد ہی ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر قوم اپنی اپنی ضرورت اور حوصلہ وہمت کے مطابق اُس کا انتظام خاطر خواہ طریقہ پر کر سکے۔ البتہ جہاں تک جبری

تعلیم کا تعلق ہے۔ مبادیات مذہب مثلاً مسلمان بچوں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کو ایک اہم جزء کی حیثیت سے اس کی اسکیم میں شامل ہونا چاہیے۔

ہندستان ایسے ملک میں جہاں مذہب ہی پر قومیت کا دار و مدار ہے، اور یہی سرمایۂ زندگی۔ کوئی ایسا نصابِ تعلیم تجویز کرنا جس میں مذہب کو شامل نہ کیا گیا ہو، اصلاح جسم کے ساتھ استکمال روح کو فراموش کر دینے کے مترادف ہے۔

گاندھی جی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں کہا ہے کہ مذہبی تعلیم اسکول کے اوقات کے علاوہ خارج وقت میں دیجائیگی اور ہر قوم اپنی ضرورت کے مطابق اپنا انتظام کریگی۔ لیکن کیا ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ موجودہ عہدِ تمدن میں جبکہ اسٹیٹ افرادِ قوم کی تعلیم و تربیت کا خود ذمہ لے رہا ہے، مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو سبکدوش رکھنا اور اس کو قوموں کے سپرد کر دینا نتائج کے اعتبار سے مذہبی اسپرٹ کو کم کر دینے کا باعث تو نہیں ہوگا؟ اس اسکیم کی رو سے جبری تعلیم کی مدت سات برس ہے، جو بچہ کی سات برس کی عمر سے شروع ہو کر اس کی چودہ برس کی عمر تک جاری رہیگی۔ ظاہر ہے کہ اگر چودہ برس کی عمر تک بچہ کو مذہب کی ابتدائی تعلیم بھی نہیں دی گئی تو کتنے ہی بچے ہونگے جو اپنے اقتصادی حالات کے باعث اور بالخصوص کوئی ہنر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ حاصل کر لینے کے بعد دوسرے مشاغل حیات میں لگ جائینگے، اور یہ جاننے کے باوجود کہ "خاص خاص باتوں میں تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہی ہے" وہ مسلمان یا ہندو ہو کر اپنے اپنے مذہب کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہونگے۔ رہا اس سات برس کی مدت میں اوقاتِ مدرسہ کے علاوہ خارج میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کا خیال! تو ہمیں ڈر ہے کہ غریب اور متوسط طبقہ کے بچے اپنے خصوصی احوالِ معاشرت و معیشت کے باعث اس کو عملی صورت

پر نہیں لا سکینگے۔ اسٹیٹ کا فرض ہے کہ جس طرح وہ اقتصادی مرفۃ الحالی کے لیے ایک ایسا مکمل لائحۂ عمل بنا رہا ہے۔ اُسے بچوں کی مذہبی تربیت دینے کا کام بھی اپنے ہی ذمہ لینا چاہیے۔ کسی اور سے کہنے کی بات نہیں۔ ہم ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے روشن خیال اور باخبر بزرگ سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ مثال کے طور پر علی گڈھ یونیورسٹی کو اپنے سامنے رکھیے۔ وہاں اسلامی دینیات کا مستقل شعبہ ہے۔ اور مشرقی زبانوں کے باقاعدہ محکمے قائم ہیں لیکن پھر کیا وجہ ہے ؟ کہ ایک ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے عربی زبان اور دینیات کے پروفیسروں سے تعلیم پانے والے طلبہ نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے ناآشنا رہتے ہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں وہ ان سے نفور بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ علوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی گرم بازاری سے وہاں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا ہے کہ طلبہ کی ذہنیت سرتاسر "دفتری" ہو کر رہ گئی ہے۔ اور دوسری چیزیں اُن کی توجہات پر اس طرح چھا گئی ہیں کہ مذہب اور عربی زبان کی طرف یا تو انہیں متوجہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اگر وہ متوجہ ہوتے بھی ہیں تو اس لیے کہ اُنہیں کسی کالج میں عربی کا پروفیسر بننا ہے یا آئی سی ایس کے امتحان میں انہیں عربی مضمون لینا ہے۔ پس اگر جبری تعلیم کی اس نئی اسکیم میں مذہب کے ساتھ بھی یہی "اچھوت پن" برتا گیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کل "اتحادِ مذاہب" کا سبق لینے والے طلبہ مذہب کی ابجد سے ناواقفیت کے باعث اُس کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کرینگے یا کم از کم وہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرینگے کہ زندگی کی شاہراہیں مذہب کی مشعل سے ہی منور ہونی چاہئیں۔

بہرحال ہماری درخواست ہے کہ مذہبی تعلیم اوقاتِ مدرسہ میں ہی ہونی چاہیے۔ اور دوسرے مضامین کی طرح کافی نگرانی اور احساسِ اہمیت کے ساتھ۔ ورنہ یہ سب طفل تسلیاں بیکار ثابت ہونگی، اور اس تغافل و تساہل کا خمیازہ سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑیگا۔

دوسری چیز مخلوط تعلیم کا مسئلہ ہے۔ لڑکیوں کے لیے اگرچہ یہ صراحت کر دی گئی ہے کہ اُن کے والدین انہیں بارہ برس کی عمر میں مدرسہ سے اُٹھا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لڑکیوں کے لیے مدرسے دو قسم کے ہونگے۔ ایک وہ جن میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پائینگی، اور دوسرے وہ جو صرف لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص ہونگے لیکن ہم بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں بھی مخلوط تعلیم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اِس لیے اس اسکیم میں اس کی صراحت ہو جانی چاہیے کہ مسلمان لڑکیوں کے لیے تعلیم گاہیں ایسی ہونگی جن میں صرف لڑکیاں ہی تعلیم پا سکینگی۔

ودیا مندر | نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اسی سلسلہ میں "صوبہ متوسط" کی ابتدائی تعلیمی اسکیم کا ذکر کریں اس اسکیم میں اُن مدرسوں کا نام جن میں یہ تعلیم دی جائیگی "ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے جو ایک بڑی حد تک قابل اعتراض ہے۔ جو اسکیم ہر مذہب و ملت کے بچوں کی تعلیم کے لیے بنائی جائے ضروری ہے کہ اس کے کسی جزو مشترک میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ایک قوم کے ساتھ کوئی مذہبی خصوصیت رکھتی ہو۔ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ آئندہ جو کتب خانے قائم کیے جائینگے اُن کا نام "بیت العلوم" ہوگا لیکن یہاں کسی قوم کو خوش کرنے نہ کرنے کا سوال نہیں بلکہ ایک اصول کو مرعی رکھنے کا سوال ہے۔ ان کتب خانوں کا نام "بیت العلوم" نہیں اگر "کعبۃ العلوم" بھی رکھ دیا جائے تو ہمیں اُس پر بھی وہی اعتراض ہوگا جو "ودیا مندر" کے نام پر ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا مسئلہ ناگپور یونیورسٹی کے نشانِ خاص کا ہے۔ یہ نشان ناگ کا بنایا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو بھی تبدیل ہونا چاہیے۔

یہ چند باتیں بہ ظاہر معمولی ہیں لیکن روزمرہ کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہی باتیں بسا اوقات نفسیات اقوام پر اثر انداز ہو کر ناخوشگوار نتائج کا باعث ثابت ہوتی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ سی، پی کی حکومت

اس پر غور کریگی۔

تخریج زیلعی اور فیض الباری | چند ماہ سے دیوبند کے دو نوجوان فاضل مولانا سید احمد رضا بجنوری ناظم مجلس علمی ڈابھیل۔ اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مصنف نفحۃ العنبر مجلس علمی ڈابھیل کی جانب سے قاہرہ (مصر) میں دو کتابوں کی طباعت کی غرض سے مقیم ہیں۔ ایک کتاب تخریج زیلعی ہے جس میں فقہ کی مشہور کتاب "ہدایہ" کی احادیث کی تنقیح و تخریج کی گئی ہے، اس کے مصنف مشہور فاضل علامہ یوسف بن عبداللہ بن یونس بن محمد جمال الدین زیلعی ہیں۔ جن کا حکم کسی حدیث کے متعلق حکم ناطق سمجھا جاتا ہے۔ اور جو حافظ ابن حجر کے بقول اپنی ثقاہت اور عدل وانصاف کے اعتبار سے ایک مرتبۂ بلند کے مالک ہیں۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے اُن زعماءِ اُمت میں سے ہیں جن کی علمی کوششیں آج بھی اسلامی علوم وفنون کی حیات وبقاء کی کفیل ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت ارباب علم پر پوشیدہ نہیں۔ ایک عرصہ ہوا کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی لیکن نہایت مسخ شدہ شکل میں۔ پھر اس پر نہ کوئی تعلیق تھی نہ حاشیہ۔ اب ہمارے یہ دو نوجوان فاضل اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ مجلس علمی کے خرچ پر قاہرہ میں چھپوا رہے ہیں اور اُس پر جو تعلیقات لکھی گئی ہیں وہ بھی بیحد مفید ہیں۔ مولانا احمد رضا صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ خود علماءِ ازہر اس کتاب کو چھاپنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اس مقصد کے لیے اُنھوں نے ایک کمیٹی بھی بنانی چاہی تھی لیکن یہ سعادت ہندوستان کی قسمت میں تھی کہ اُس نے سبقت کی۔ وَالْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّمِ!

موصوف نے تخریج زیلعی کے جو چند مطبوعہ صفحات مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے پاس صلاح و مشورہ کے لیے ارسال کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ان دوستوں کی یہ کوشش بہت زیادہ کامیاب ہوگی۔ اور بے شبہ یہ اسلامی فقہ وحدیث کی عظیم الشان خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ حسنِ قبول

عطا فرمائے

دوسری کتاب فیض الباری ہے، یہ کتاب حضرتنا الاستاذ العلام مولانا سید محمد انور شاہؒ کی اُن تقاریر کا مجموعہ ہے جو آپ درس بخاری میں ارشاد فرماتے تھے۔ حضرت اُستاذ بخاری شریف کے درس میں جو تقریر فرماتے تھے وہ خصوصاً علم حدیث و سیر اور اسماء الرجال والرواۃ اور عموماً تمام علوم وفنون کے دقیق مباحث پر مشتمل ہوتی تھی۔ طلبہ اُس کو لکھتے تھے، مگر مشکل یہ تھی کہ اس تقریر میں جن بے شمار مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کے حوالے ہوتے تھے اُن سے مراجعت و مطابقت کرنا ہر شخص کا کام نہ تھا اور پھر نفس تقریر جو قلمبند کی جاتی تھی وہ بھی خلط مباحث اور ازدیاد و حذف کے خرخشہ سے پاک نہ ہوتی تھی۔ ہمارے فاضل دوست، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے پانچ چھ برس تک برابر حضرت استاذ کے درس بخاری میں شرکت کی اور تقریر لکھی اور جہاں جہاں انہیں اشکال پیش آیا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کو دفع کیا اور پھر مختلف تقریریں جو متعدد ارباب علم نے لکھی تھیں، اُن سب کو بھی پیش نظر رکھا اور جن کتابوں کے حوالے تھے اُن کی طرف خود مراجعت کی، اور کئی سال کی محنت و جانفشانی کے بعد آپ نے اُس کو عربی زبان میں مرتب و مہذب کر دیا۔ اس کتاب کے صفحات ہزار سے زیادہ ہیں۔ بڑی تقطیع پر شائع ہوگی مجلس علمی ڈابھیل کی جانب سے انہی دونوں دوستوں کے اہتمام سے قاہرہ میں چھپ رہی ہے۔ اس کتاب کو بے شبہ علوم و معارف اسلامیہ کی مختصر انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے، اس کا شائع ہونا عہد حاضر میں حدیث کی بڑی اہم خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ علماءِ اسلام کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ چند ماہ کے قیام میں ہی مولانا سید احمد رضا اور مولانا محمد یوسف

نے مصر کے ارباب علم وادب سے دوستانہ روابط پیدا کر لیے ہیں اور ان کی وجہ سے علماءِ مصر کے دلوں میں پھر دارالعلوم دیوبند کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ موخرالذکر کے قلم سے ابھی حال میں مصر کے مشہور اخبار الفتح میں "النہضۃ العلمیۃ فی الہند" کے زیرِعنوان دارالعلوم دیوبند پر ایک مفصل و مبسوط مضمون شائع ہوا ہے جس میں دارالعلوم کی دینی و علمی اور تصنیفی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ ان دونوں کا قیام مصر جامع ازہر اور دارالعلوم دیوبند کے تعلقات کو مضبوط بنانے میں بہت کارگر اور مفید ثابت ہوگا۔

ادارۂ معارفِ اسلامیہ چھ سال ہوئے ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے اپنے رفقاء کی مدد سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ دو سال میں ایک مرتبہ تمام ہندوستان کے اربابِ تحقیق علماء ایک جگہ جمع ہو کر علوم و معارف اسلامیہ پر محققانہ مقالات پڑھیں اور مختلف اسلامی مسائل پر تبادلۂ خیالات کریں۔ اس غرض کی مناسبت سے ہی اس کا نام "ادارۂ معارفِ اسلامیہ" تجویز کیا گیا تھا۔ اب تک اس انجمن کے دو اجلاس لاہور میں منعقد ہو چکے ہیں اور ایک بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اب یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ انجمن کا تیسرا اجلاس امسال شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام دہلی میں منعقد ہوگا۔ دہلی ہمیشہ علوم اسلامیہ کا مرکز رہی ہے۔ اور اب بھی چشمِ تصور سے کام لیجیے تو یہاں کی خاک پاک کا ایک ایک ذرہ آئینۂ علم و فن نظر آئیگا۔ شاہ ولی اللہ محدثؒ اور ان کا پورا خاندان اسی سرزمین کی آغوش میں ..... ابدی سکون کے ساتھ سو رہا ہے حضرت نظام الدین اولیا، حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت حاجی باقی باللہ اور سینکڑوں مشائخ طریقت نے اسی جگہ تصوف و روحانیت کی شمع روشن کی، اور غالب، ذوق، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانجاناں، اور حضرت امیر خسرو ایسی طوطیانِ شیریں مقال نے اسی چمن میں داد زمزمہ پیرائی دی۔ اس بنا پر ادارۂ معارف اسلامیہ کے اجلاس کا یہاں منعقد ہونا نہایت مبارک اور خوش آئند ہے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی تشریح و توضیح

مولانا ابو القاسم محمد حفظ الرحمن

(۱)

مذہبی انحطاط کے اس دور میں سب سے زیادہ دل شکن، مایوس کن، اور قابلِ افسوس وہ تغافل ہے جو قرآنِ عزیز کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔ اُمتِ مرحومہ کے ارشاد و ہدایت، اور انسانیت کبریٰ کی نجاتِ ابدی و سرمدی کے لیے جو خدا کا آخری پیغام سنایا گیا۔ اخلاقِ کاملہ کی رفعت و بلندی، اور دین و دنیا کے ارتقاء و کمال کے لیے جس کو سرچشمۂ حیات بنایا گیا۔ بدقسمت مسلمان آج اس کلامِ معجز نظام اور اس آئین کامل سے یکسر غافل اور اُس کے معانی و مطالب، حقائق و دقائق، رموز و نکات اور سب سے زیادہ اُس کی علمی و عملی دعوت سے بے نیاز نظر آتا ہے عوام اور متوسطین کی غفلت کا شکوہ کیا کیجیے، جدید تعلیمیافتہ اور مغرب زدہ نوجوانوں کی دیدہ و دانستہ بے اعتنائی کا رونا کیوں روئیے، خود فضلاءِ علومِ شریعت، اور حاملانِ رموزِ حقیقت کتنے ہیں جو اس وادی میں گامزن ہیں یا گامزن ہونے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں؛

منطق و فلسفہ کے شیدائی، علمِ کلام کے شناور، معانی و بیان کے خبیث شناس، صرف و نحو کے حافظ، علمِ ادب کے متوالے علمی دنیا میں تلاش کیجیے تو کم نہ پائیگا کتنے ہونگے جنہوں نے عمرِ عزیز کا گرانقدر حصہ ان علوم کی تحصیل، تحقیق اور کد و کاوش میں گزارا ہوگا؛ میدانِ مسابقت میں کامیابی حاصل کی ہوگی۔ مرحبا و احسنت کی صداؤں سے حظ اٹھایا ہوگا۔

لیکن معدودے چند بزرگ ہستیوں کے علاوہ دینی و مذہبی اداروں میں بھی علوم قرآنی کا ذوق اور فہم کلامِ ربانی کا شوق رکھنے والے خال خال بھی نظر نہیں آتے۔

یہ نہ سمجھیے کہ کاتبِ سطور اس سے مستثنیٰ ہے اور یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے دوسروں ہی کے لیے ہے، حاشا! ایسا نہیں ہے۔ اپنا حال تو دوسروں سے بھی کہیں زیادہ زبون و ناقابلِ بیان ہے مگر حقیقت اپنی جگہ ناقابلِ انکار ہے اور واقعہ بہرحال واقعہ ہے۔ علماء کو عوام سے شکوہ ہے کہ وہ الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں، بدعات و سیئات کو ہدایات و حسنات سمجھتے ہیں، عوام کو گلہ ہے کہ علماء کے مواعظ اور نصیحتیں غیر موثر ہیں اور اُن کا ارشاد و ہدایت کا طریقہ ناکام ہے۔

شکوہ بھی دونوں کی ایک حد تک صحیح و درست، مگر تلخی نتائج کے دونوں ذمہ دار ہیں۔ مرض اور سوءِ مزاج کا اعتراف دونوں جانب یکساں ہے لیکن اسباب و مبادیاتِ مرض سے دونوں طرف غفلت برتی جا رہی ہے محققینِ علوم و معارف کے دم سے علم کی ضیا باریاں بھی ہیں، اور معارف پروری بھی، ذوقِ نظر بھی ہے اور سلیقۂ فکر بھی۔ اسی طرح تشنگانِ علوم میں طلب و جستجو بھی ہے اور جذبۂ صادق بھی، حصولِ حق کی تڑپ بھی ہے اور رموزِ صداقت کی شیفتگی بھی، لیکن زبانِ وحی ترجمان کے اُن پاک کلمات کو کون یاد دلائے کہ

خیرکم من تعلم القرآن و علمہ۔ (بخاری) تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآنِ عزیز سیکھے اور سکھلائے۔

ہم نے بہت کچھ سیکھا بھی اور سکھلایا بھی، اس وادی کے رہرو بھی بنے اور ہادی و رہنما بھی مگر منزل کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا اور سب کچھ سیکھنے اور سکھلانے کے بعد بھی آج تک تہی دامن ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اس فرمانِ ناطق کو بھول گئے اور افہام و تفہیم معانی قرآن کو نہ صرف ترک کر دیا بلکہ اس ترک و ہجر کی تاریک گھاٹی میں غفلت کے بادلوں نے ہم کو بالکل عاجز و درماندہ کر کے چھوڑ دیا۔

اور اب کبھی خیال بھی نہیں گزرتا کہ ان علوم میں مقصد و نصب العین کونسا علم تھا اور کن علوم

کو اس کے لیے آلات و اسباب کی حیثیت حاصل تھی۔

حسرت و یاس کا یہ کس قدر اندوہناک منظر ہے کہ آج علوم آلیہ نے مقصد اور منتہائے کار کی جگہ لے لی اور مقصد و نصب العین کو بھی علوم کی صف میں رکھ دیا گیا۔

یہاں عقیدہ سے بحث نہیں اس لیے کہ مجھے تسلیم ہے کہ میرا اور آپ کا عقیدہ اسلامی عقیدہ ہے جس میں قرآنِ عزیز کی تعلیمات کو ایمان کی پہلی صف میں جگہ حاصل ہے۔

لیکن کیا وہ عقیدہ ہماری زندگی میں مفید و کامیاب ہو سکتا ہے جس کی مطابقت کے لیے عملی زندگی اور جس کی کامیابی کے لیے عملی حیات موجود نہ ہو؟

قرآنِ عزیز کی تلاوت بھی ہے، چومنے اور سینے سے لگانے کے لیے قلبی عظمت و ارادت بھی ہے لیکن نہیں ہے تو تعلیم نہیں تفکر نہیں تدبر نہیں اور اس وادی میں فکر حقائق سے استغناء اور نظر مقاصد سے بے توجہی ہمارا عام شعار بن گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری تمام زندگی کے شعبوں میں فکر کی جگہ جمود تعقل و تدبر کی جگہ جہالت و دوں ہمتی کا دور دورہ ہے، حالانکہ اسی شمع ہدایت نے خدا کی ہستی، رسولوں کی رسالت و نبوت، وحی الٰہی کی صداقت، یوم آخرت کے وجود، غرض دنیا و دین کے تمام معاملات میں ہر جگہ افلا تعقلون، افلا تتفکرون، افلا تتدبرون کہہ کر عقل و فکر کو دعوت دی اور اسی کو صداقت و حقانیت کے پرکھنے کا معیار قرار دیا ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۔ (الآیہ)

کیا ان (مشرکین) نے قرآن میں تدبر نہیں کیا، اور اگر خدا کے علاوہ کسی اور کا کلام ہوتا تو یقیناً وہ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

ساڑھے تیرہ سو برس پہلے قرآنِ عزیز کی اس آیت کے مخاطب غیر مسلم تھے لیکن کیا آج

عدم تدبر فی القرآن کا یہی شکوہ خود قرآن کے ماننے والوں پر صادق نہیں آتا، اور کل جو چیز غیروں کے لیے کہی گئی تھی آج اپنوں پر پوری نہیں اترتی؟

مصیبت جب آتی ہے تنہا نہیں آتی بلکہ مصائب کے پہاڑ اپنے دامن میں لے کر آتی ہے پھر قدرت یہاں کیسے اپنے قانون کو بدل دیتی ہے فہم قرآن سے غفلت بھی ایسی شدید گمراہی تھی جس نے طاری ہو کر جہل وتاریکی کو ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مصداق بنا دیا اور ایک جانب کسی مدعی علم کو یہ سکھلایا کہ ہر شخص فقہ کے مسائل اور اس کی جزئیات کو معلوم کر سکتا ہے۔ حدیث کے اختلافی مطالب کے حل کو بھی جان سکتا ہے، معانی وبلاغت، منطق وفلسفہ کی موشگافیوں کو سمجھ لینے کی صلاحیت بھی رکھ سکتا ہے۔

لیکن قرآن عزیز کا سمجھنا، اس کے معانی ومطالب کا جاننا، حسب استطاعت اس کے احکام کو معلوم کرنا یہ سب اس کی دسترس سے باہر ہے۔

اس کو صوفی کے تصوف کی باریکیاں عقیدتمندی کے ساتھ سننی چاہئیں، قال فلاںؒ قال فلاںؒ کے مقولے سن کر سرِ نیاز جھکا دینا چاہیے لیکن قرآن عزیز کی کسی آیت کا مطلب، اس کا فہم اس کے مطالب کا ادراک یہ وہ شجر ممنوعہ ہے جس کے قریب نہ جانا ہی فلاحِ دنیا وصلاحِ آخرت کی بہترین کفالت ہے۔ یہ ہے آج ہمارا علمی نظریہ اور یہ ہے آج ہمارے ذوق علمی کا کمال!

اور دوسری جانب علوم جدیدہ کے علمبرداروں نے یہ صور پھونکا کہ دنیا کا کوئی فن، کوئی علم ایسا نہیں جو اپنے افہام وتفہیم میں غور وفکر کا محتاج نہ ہو اور صرفِ ہمت ووقت کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو لیکن صرف قرآن عزیز ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے سمجھنے اور جاننے کے لیے نہ علوم آلیہ کی ضرورت اور نہ صرفِ ہمت ووقت کی حاجت، نہ فکر ونظر کا داعیٔ نہ غور وخوض کا حامل یہاں جہالت ہی علم کی راہنما ہے اور ظلمت ہی نور کی ہادی۔ ساری عمر علوم جدیدہ کے حصول میں صرف کیجیے اور پھر روایات صحیحہ ودرایات صالحہ سے جہالت اور علوم عربیہ سے ناواقفیت

بہرحال دونوں کا حاصل ایک ہی نکلا کہ افراط و تفریط کی اس کشمکش میں قرآن و علوم قرآن سے نہ یہ عہدہ برآ ہوسکا اور نہ اُس کو توفیقِ فہم نصیب ہوئی۔ دعویٰ علم دونوں کو حاصل مگر علوم قرآنی کی رشد و ہدایت کے ابلاغ و تبلیغ سے دونوں غافل۔

وہاں الحاد و زندقہ کی وبا نے رُوح کی زندگانی کو گھن لگا دیا اور یہاں فارابی و بوعلی کی موشگافیوں نے غفلت و جمود کے پردے ڈال ڈال کر نور سے بے نور بنا دیا۔ فیا حسرتا و وا اسفاہ۔

مگر ان حوصلہ شکن حالات و واقعات کے باوجود اس جدید دور میں چند باہمت اشخاص ایسے بھی ہیں جنہوں نے انفرادی طور پر ترجمہ، فوائد اور تفسیر القرآن کی خدمت کو انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں اور تحریر و تقریر کے ذریعہ اس نیک مقصد کی طرف متوجہ ہیں۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء

تاہم یہ خدمت اتنی اہم ہے کہ مساعی مسطورہ بالا کے باوجود ہنوز تشنہ ہے اور زیادہ سے زیادہ جد وجہد کی محتاج، اور ضرورت ہے کہ قرآنِ عزیز کی تعلیم کو مختلف حیثیتوں سے اس قدر عام کیا جائے کہ ہر ایک شخص اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق استفادہ کرسکے۔

ندوۃ المصنفین کے پیشِ نظر جو سب سے بڑا اور اہم مقصد ہے وہ یہی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے رسالہ "برہان" میں بھی جستہ جستہ قرآنِ عزیز کی آیات کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ خصوصاً اُن آیات کے حلِ مشکلات کی طرف توجہ کی جائے جو تاویل و تفسیرِ قرآنی میں علماءِ ربانی کے نزدیک معرکہ آرا سمجھی گئی ہیں اور جدید اہلِ قلم نے بھی اُن میں سے بعض آیات کے متعلق قلم فرسائی کی ہے۔

ایک عرصہ ہوا کہ میں حضرت اُستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضر تھا، مختلف علمی مسائل پر حضرت اقدس روشنی ڈال رہے تھے، درمیان میں مسئلہ زیرِ بحث بھی آگیا۔ آپ نے فرمایا کس قدر حسرت کا مقام ہے کہ اہلِ علم ہر قسم کی تدقیقات و تحقیقات میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں لیکن قرآنِ عزیز کی خدمت کی طرف بہت کم توجہ ہے، حالانکہ اس فتنہ کے زمانہ

میں بھی دنیا کی نظریں اسی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ قرآنی علوم سے براہ راست زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ اور آج ہر گمراہ، ملحد اور زندیق بھی اپنی گمراہی وضلالت کو اسی کتاب اللہ کے مقدس دامن میں تفسیر وتاویل کے نام سے چھپانے کی سعی کر رہا ہے

ضرورت ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ کم از کم ان مشکلات قرآنی ہی کو حل کردے جو علماء ربانیین کے نزدیک معرکۃ الآراء ہیں اور حلِ مشکلات میں خصوصی توجہ کی محتاج۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت والا ہی اگر توجہ فرمائیں اور اپنے مخصوص اندازِ تحریر یا عربی میں ان آیات کا حل فرمادیں تو علماء اور طلبہ کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے، اور اُن کے ذریعہ سے متوسطین اور عوام بھی فائدہ اُٹھا سکیں۔

اُس وقت تو آپ خاموش رہے لیکن اُسی سال کے رمضان المبارک میں آپ نے اُس طرف توجہ فرمائی اور فوائد (نوٹس) کے طور پر متعدد آیات کو حل فرمایا، اور ایک دوسری مجلس میں ہم کو بشارت دی کہ الحمد للہ میں نے ایک حد تک اس خدمت کو انجام دے دیا ہے۔

چونکہ حضرت اقدس کا اندازِ تحریر اجمال واختصار کی طرف مائل تھا اس لیے ضرورت تھی کہ اُس کی تکمیل وترتیب یا ایضاح وتفصیل کی طرف توجہ کی جائے۔

مجلس علمی ڈابھیل قابل مبارکباد ہے کہ اُس نے اس تکمیل کی خدمت کو انجام دیا جو عنقریب کتاب کی شکل میں طبع ہو کر شائع ہونے والی ہے

خدائے قدوس سے دعا ہے کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ قرآنِ عزیز کی خدمت عزیز کو حسب استطاعت انجام دے سکیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

آج ہم اس سلسلہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی تشریح کرنی چاہتے ہیں جو بجائے خود ایک مستقل بحث ہے:۔

(۲)

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ (الآیۃ)

اور داؤد (علیہ السلام) نے خیال کیا کہ ہم نے اُسے جانچا پھر اُس نے بخشش چاہی اپنے رب سے

حضرت داؤد (علیہ السلام) ایک جلیل القدر اسرائیلی پیغمبر ہیں۔ خدائے قدوس نے سورۂ انبیاء سورۂ قصص اور بعض دوسری سورتوں میں اُن کی رسالت و نبوت، اور انبیاء و رسل میں اُن کی جلالتِ قدر کا تذکرہ فرمایا ہے لیکن جس آیت کو ہم نے عنوان بنایا ہے یہ سورۂ ص کی آیت ہے اس کے متعلق عوام و متوسطین میں تو کیا بعض اربابِ تصنیف خواص میں بھی عجیب عجیب قسم کی روایات مشہور ہیں جو ہفوات و خرافات کا ایک ذخیرہ ہیں، اور جو اسرائیلیات سے منقل ہو کر کتبِ تفاسیر میں روایات کی حیثیت سے داخل کرلی گئی ہیں۔ اگرچہ علماء محققین، متقدمین و متاخرین برابر اُن کی تردید کرتے چلے آتے ہیں لیکن کتبِ تفسیر میں مسلسل نقل ہوتے رہنے کی وجہ سے کوتاہ بیں اصحاب نے اُن کو شہرت دینے اور قبول عام کی سند دلانے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔

متعصب اور تنگ نظر مستشرقین اور عیسائی علماء نے بھی اُن کے ساتھ اپنے شغف کا کافی ثبوت دیا اور تحقیق و علمی کاوش کے پردہ میں اُن روایات کو زیادہ سے زیادہ علمی جگہ دینے کے لیے سعی بلیغ کی۔ تاکہ جب عہدِ قدیم "تورات" اور عہد جدید "انجیل" کی اُن موجودہ ہفوات و خرافات پر بجا نکتہ چینی کی جائے جو معصوم نبیوں اور پیغمبروں کے متعلق مذکور ہیں تو اُن کو جواب کے لیے بآسانی یہ کہنے کا موقع ہاتھ آجائے کہ مسلمانوں کی تعلیم بھی ان عجوبہ کاریوں سے خالی نہیں ہے اور اسلام کا پاک دامن بھی عیاذاً باللہ اس قسم کی تلویث سے ملوّث ہے۔

واقعہ | بہرحال اس مقام پر قرآنِ عزیز حضرت داؤد کے فضائل بیان کرتے ہوئے ان کے فصلِ خصومات

سے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ حضرت داؤد عبادت خانہ میں مشغولِ عبادت تھے کہ دو معاملے والے دیوار کود کر عبادت خانہ میں داخل ہوئے اور انہوں نے بے تکلف اپنا قضیہ بیان کرنا شروع کر دیا۔

مدعی نے کہا میرے اس بھائی (مدعی علیہ) کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور مجھ غریب کے پاس صرف ایک دُنبی ہے لیکن یہ اس کو بھی نہیں دیکھ سکتا اور مجھ کو مجبور کرتا ہے کہ میں اپنی ایک دنبی بھی اس کے حوالے کر دوں۔ حضرت داؤد نے فرمایا کہ تیرے رفیق کا یہ طرزِ عمل سخت ظالمانہ اور نامنصفانہ ہے اور اس کو کوئی حق نہیں کہ وہ اس معاملہ میں تجھ پر جبر کرے اور اسی کے ساتھ دنیا کی ظلم پسندی کے اس عام طریقہ پر اظہار ناپسندیدگی فرماتے ہوئے ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور اعمال صالحہ کے حامل ہیں اور یقیناً وہ بہت کم ہیں اُن کے علاوہ یہی ہو رہا ہے کہ اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں اور ہر قوی ضعیف کو مغلوب و مجبور کرتا رہتا ہے۔

حضرت داؤد نے فیصلہ تو کیا لیکن فوراً احساس ہوا کہ اس معاملہ (فصلِ خصومات) میں حق تعالیٰ کی جانب سے میرا امتحان لیا گیا ہے، اس احساس کے پیدا ہوتے ہوئے وہ درگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو گئے اور دعائے مغفرت کرنے لگے۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اُس کو بخش دیا، معاف کر دیا۔ اور ہمارے پاس اُس کے لیے مرتبہ اور اچھا ٹھکانا ہے۔

من گھڑت افسانے یہ مختصر سا واقعہ ہے جس سے فطری طور پر ایک سوال کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اُس کے جواب میں ہی گمراہی اور ضلالت کے وہ افسانے گھڑے جاتے ہیں جن کا اسلام کے مقدس دامن سے دور کا بھی تعلق نہیں بلکہ قرآنی شہادتیں اور صادق و مصدوق نبی معصوم کی روایات صحیحہ اُن کے برعکس اس قسم کی افترا پردازیوں کا پردہ چاک کرتی ہیں

اِن اسرائیلی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت داؤد کی نظر اتفاقاً اپنے ایک خاص مصاحب یارکنِ دولت اوریا کی عورت پر پڑ گئی اور اس اتفاقی نظر نے حضرت داؤد کے دل میں اُس کی جگہ

پیدا کردی۔ مگر چونکہ وہ شادی شدہ عورت تھی اس لیے حضرت داؤد خاموش ہو گئے اور مناسب وقت کے منتظر رہے۔ اب یہاں سے ان راویانِ کذب بیان نے دو راہیں اختیار کیں، ایک کہتا ہے کہ حضرت داؤد نے حیلہ کر کے اوریا کو میدانِ جہاد میں بھیجدیا اور اس کے شہید ہو جانے کے بعد اُس کی عورت سے شادی کر لی۔ اور دوسرا کہتا ہے کہ مناسب موقعہ دیکھ کر اوریا سے طلاق کے طالب ہوئے اور اپنے زعم باطل میں حضرت داؤد کی عصمت و عفت کا محافظ بنتے ہوئے یہ بھی تصریح کرتا ہے کہ اُس زمانہ کے دستور کے مطابق اس قسم کا مطالبہ مروت اور اخلاقی ملکات کے خلاف نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ایک دوسری روایت اس طرح ہے کہ جس عورت پر اچانک نظر پڑی تھی وہ اوریا کی منسوبہ تھی، ابھی نکاح کی نوبت نہیں آئی تھی اور پھر سابق کی طرح یا اوریا کو قتل کرا کے اُس عورت کو حضرت داؤد کی بیوی بناتے ہیں اور یا بغیر قتل ہی اوریا کی منسوبہ کو اس کی اجازت سے حضرت داؤد کی منسوبہ بنا دیتے ہیں۔ اور تسع وتسعون (۹۹) کے عدد کو نبھانے کے لیے اس واقعۂ نکاح سے قبل حضرت داؤد کی ننانوے بیویاں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ الآیہ۔ اعاذنا اللہ من ہذہ الخرافات والہفوات!

یہ اور اسی قسم کے بیہودہ افسانوں کو موضوع روایات اور من گھڑت بیانات کی شکل میں بیان کیا گیا ہے اور حیرت یہ ہے کہ جب ان خرافات کی مصنوعی چادر میں معصوم نبی و پیغمبر کا قدِ زیبا کسی طرح موزوں نظر نہیں آتا تو طرح طرح کی رکیک تاویلات اور لچر توجیہات بیان کر کے سعی کی گئی ہے کہ کسی طرح ظلمت کی یہ چادر صادق و مصدوق پیغمبر پر مڑھ دی جائے۔

خدا کی پناہ کس قدر گستاخانہ جرأت ہے۔ قتل، طمع و حرص، خواہشاتِ نفسانی اور بداخلاقی کا کونسا گوشہ ہے جو یہودیوں اور اسرائیلیوں کی ان خرافات میں خدا کے سچے رسول اور حق و صداقت

کے لیے، اخلاقِ کاملہ کے معلّم اور رشد و ہدایت کے نور مجسم کے لیے وضع نہ کیا گیا ہو۔ اور غضب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے اپنے گھر کی بیز محض نقل ہے کے قصور میں آج مسلمانوں کی امانت سمجھی جانے لگی اور بعض اپنے نادان دوستوں کی سہل انگاریوں کی بدولت علمارِ یورپ اور متعصب مستشرقین نے اُن کو ہمارے یہاں سے نقل کر کے ثابت کرنے کی سعی لاحاصل شروع کر دی گویا کہ یہ بیچارے آج اسلامی روایات کی بنا پر ہی ان ہفوات و خرافات سے واقف ہوئے ہیں، ورنہ ان کا اپنا دامن اس سے پاک ہے۔ حالانکہ اسلام اور قرآن کی نگاہ میں انبیار و رسل کی معصومیت، جلالتِ قدر اور اخلاقِ کاملہ کے لیے اسوہ ہونا ایک ایسا صریح اور یقینی مسئلہ ہے جس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں پھر کس طرح ممکن ہے کہ ان اسرائیلیات و ہزلیات کے لیے ایک معمولی گوشہ بھی اسلامی تعلیم میں نکل سکے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۔ (بقرہ)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں سے جو تم پر ہماری آیات پڑھتا ہے اور تم کو پاک بناتا ہے اور تم کو کتاب سکھاتا ہے اور حکمت اور وہ باتیں بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (بقرہ)

لوگ پہلے سب ایک ہی دین (گمراہی) پر تھے پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب بھی تاکہ فیصلہ کرے لوگوں میں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۔ (بقرہ)

یہ سب رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ان میں وہ بھی ہیں جن کو کلیم اللہ کا شرف عطا ہوا اور بعض کو بہت ہی بلند رتبے دیے۔

اور اسی سورۂ ص میں داؤد علیہ السلام ہی کے لیے نیابتِ الٰہی کا جو سب سے بڑا شرف اور

مجدد خلیفۃ اللہ فی الارض" ہے اس طرح بیان فرمایا :-

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ. اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنا کر بھیجا ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں اُن کی رفعت و جلالتِ شان کا اس طرح اظہار فرمایا :-

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ وَكُنَّا فٰعِلِیْنَ. ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا جو تسبیح پڑھتے ہیں، اور یہ سب کچھ ہم نے ہی کیا تھا۔

حقیقتِ واقعہ بات یہاں سے چلی تھی کہ آخر اس واقعہ میں کون سی ایسی چیز تھی جس کے لیے حضرت داؤد کو یہ احساس ہوا کہ خدائے قدوس نے اس ذریعہ سے میرا امتحان لیا اور وہ کون سی خطا تھی جس کے لیے حضرت داؤد کو استغفار کی نوبت آئی۔

مفسرینِ امت ابن کثیر، خازن، آلوسی صاحب روح المعانی، ابوحیان، رازیؒ، وغیرہم نے اس سوال کے حل میں بہت سی توجیہات نقل کی ہیں اور یہ واضح کر دیا ہے کہ اس سلسلہ میں جو افسانے بیان ہوئے ہیں اُن کا اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے اور نبی معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس سلسلہ میں کوئی روایت بھی ثابت نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین فرماتے ہیں :-

قد ذکر المفسرون ھھنا قصۃ اکثرھا ماخوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیھا عن المعصوم حدیث یجب اتباعہ

مفسرین نے اس موقع پر کچھ افسانے بیان کیے ہیں جو اسرائیلیات سے لائے گئے ہیں، اور اُن کے متعلق نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت ثابت نہیں جس کا اتباع ہمارے لیے ضروری ہو

امام رازی کا قول ہے

حاصل القصۃ یرجع الی السعی فی قتل الرجل مسلم بغیر حق والی الطمع فی زوجتہ وکلاھما

اس افسانہ کا حاصل تو یہ ہوا کہ ناحق ایک مسلمان کا قتل، اور اُس کی بیوی کے متعلق بے جا طمع اور یہ دونوں چیزیں بدترین

منکر عظیم فلا یلیق لعاقل ان یظن بداؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

معصیت ہیں تو کوئی عقلمند خدا کے نبی داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ایسا گمان کس طرح قائم کر سکتا ہے۔

اور قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں۔

لا یجوز ان یلتفت الی ما سطرہ الاخباریون من اهل الکتاب الذین بدلوا وغیروا ونقلہ بعض المفسرین ولم ینص اللہ تعالیٰ علی شیٔ من ذلک ولا ورد فی حدیث صحیح

قصہ گویان کتاب نے حضرت داؤد کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اُس پر توجہ کرنا بھی جائز نہیں، اس لیے کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر قسم کی تبدیل و تحریف پر کمر باندھ لی ہے بعض مفسرین نے بھی اس کو نقل کر ڈالا حالانکہ نہ خدائے تعالیٰ نے اس کے بارہ میں کوئی نص اُتاری اور نہ حدیث رسول میں اس کا پتہ:-

اور خازن کہتے ہیں:-

اعلم ان من خصہ اللہ تعالیٰ بنبوتہ و اکرمہ برسالتہ وشرفہ علی کثیر من خلقہ وائتمنہ علی وحیہ وجعلہ واسطۃ بینہ وبین خلقہ لا یلیق ان ینسب الیہ ما لو ینسب الی احاد الناس لاستنکف ان یحدث بہ عنہ فکیف یجوز ان ینسب الی بعض اعلام الانبیاء والصفوۃ الامناء

معلوم رہے کہ جس شخص کو خدا نے اپنی نبوت سے نوازا ہو اور شرف رسالت سے مشرف کیا ہو اور خدا کی مخلوق میں سے بے شمار انسانوں سے برگزیدہ بنایا ہو، اپنی وحی کا امین مقرر کیا ہو، اور خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان ایلچی ہو اس کی طرف ایسی خرافات کی نسبت کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ اگر معمولی انسان کی جانب بھی ایسے امور کی نسبت کی جائے تو اُس کو سخت ناگوار گزرے۔ کجا یہ ہزلیات اور کجا خدا کا برگزیدہ امین رسول۔

اور آلوسی صاحب روح المعانی اور ابو حیان صاحب بحر المحیط کا قول ہے:-

ویعلم قطعاً ان الانبیاء علیہم السلام

اور یہ یقینی طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام خطاؤں

معصومون من الخطایا لایمکن وقوعهم	سے بالکل معصوم ہیں اور اُن کا دامن کسی خطا میں ملوث
فی شئ منها ضرورة ان لوجوزنا علیهم	نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شریعت بالکل
شیئاً من ذلک بطلت الشرائع ولم نثق	باطل ہو جاتی اور ان کے کسی قول پر اعتماد ناممکن ہو جاتا۔
بشئ مما یذکرون انه اوحی الله به	لہذا حضرت داؤد کے واقعہ میں خدائے تعالیٰ نے جس قدر
الیهم فما حکی الله تعالی فی کتابه	بیان کیا ہے وہی ہمارے لیے دلیل راہ ہے اور افسانہ
علی ما اراده تعالی وما حکی القصاص	گویوں نے منصب نبوت کی حرمت کی جو ہتک کی ہے۔
مما فیه نقص من منصب النبوة	وہ پھینک دینے کے قابل ہے۔

طرحناه[عہ] الخ

اور کیوں نہ ہو جبکہ نبوت، صداقت ہے، عفت و عصمت ہے، طہارت و نجابت ہے تو پھر اس میں بطالت اور اخلاق ردیہ و ذمیمہ کی تلویث کو کیا دخل؟

اِن تصریحات کے بعد وہ توجیہات مذکور ہیں جو اصل سوال کے متعلق بیان کی گئی ہیں "چھوٹا منہ بڑی بات" شاید یہ مثل مجھ پر صادق نہ آئے اگر میں یہ گذارش کروں کہ ان توجیہات میں بھی بعض رکیک ہیں جیسا کہ خازنؒ نے کیا ہے کہ جس افسانہ کی پُرزور تردید کی ہے اسی کا ایک ایسا ٹکڑا اس خیال سے لے لیا ہے کہ اس سے استغفار داؤد علیہ السلام کی وجہ بھی پیدا ہو جائے اور عصمت نبوت پر بھی زد نہ پڑے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھیے تو بات وہیں لوٹ کر آجاتی ہے۔ صرف فرق کم و بیش کا پڑ جاتا ہے، جو زیادہ مفید نہیں۔ اور بعض تاویلات میں اس قدر تکلف اختیار کیا گیا ہے کہ طبع سلیم اُس کے ماننے کو تیار نہیں ہوتی جیسا کہ ابوحیان نے کہا ہے۔ اور بعض مفسرین نے صرف رطب و یابس نقول کو جمع کر دینے ہی پر اکتفا کی ہے اور صحیح وسقیم توجیہات کے نقد و تبصرہ کو نظرانداز کر دیا ہے

عہ روح المعانی جلد ۲۳ طبع جدید، بحر المحیط جلد،

حافظ ابن کثیر الغبۃ اپنی محدثانہ عادت کے مطابق اس سوال کے حل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے آثار نقل فرماتے ہیں تاکہ صاحب ذوقِ روایت ودرایت کے اعتبار سے جس اثر کو چاہے اختیار کرلے اور قرآن عزیز کے اس موقع کو حل کرے۔ چنانچہ علمائے محققین نے ان آثار سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ذوق کے مطابق اس آیت کی توجیہہ میں کام لیا لیکن میری نظر نے اب تک اس سلسلہ میں جس قدر مطالعہ کیا ہے اُس سے معاملہ کے واشگاف ہونے میں وہ حیثیت وکیفیت نظر نہیں آتی جس سے یہ کہا جاسکے کہ قرآنِ عزیز کا سیاق وسباق خود اس طرف رہنمائی کرتا ہے اور اگر یہ آثار وروایات سامنے بھی ہوں تب بھی نظمِ قرآنی سے حضرت داؤد کی معصومانہ صفات کے مطابق خود اس مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے ممکن ہے میری نظر کی کوتاہی ہو لیکن صورت حال بظاہر یہی ہے، تو اب ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس کے جس اثر کو میں اپنے لیے دلیلِ راہ بناتا ہوں اُس کو پیش کروں اور قرآنِ عزیز کی اس آیت کے سیاق وسباق پر بحث کرکے بتاؤں کہ اگرچہ قرآن عزیز نے اس موقعہ پر اجمال سے کام لیا تاہم وہ اس سوال کے حل کرنے میں بطورِ خود امام ہے اور اُس کی شہادت تمام شہادتوں سے اعلیٰ وارفع ہے اور اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ کے اثر سے ہوتی ہے۔

معاملہ کی اصل صورت یہ ہے کہ اس سورۂ (ص) میں حضرت داؤد کا ذکر اس طرح شروع کیا گیا ہے:-

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ ۔ — اور یاد کر ہمارے بندے داؤد صاحب قوت کے واقعہ کو یہ (داؤد) خدا کی طرف بہت رجوع ہونیوالا تھا۔

اور پھر اُن کے کمالات عبودیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ — ہم نے اس کے ساتھ صبح وشام تسبیح کرنے کے لیے پہاڑ کو مسخر اور

بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً ۚ كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ ۝ اور پرندوں کو جمع کر دیا۔ یہ سب خدا کے آگے رجوع رہتے۔

یہاں تک اُن کی عبودیت، تسبیح و تہلیل اور اُس سلسلہ میں اُن کی عظمت و جلالت کا تذکرہ تھا۔ اب اس کے بعد ان کے ایک دوسرے شرف و مجد کا تذکرہ ہے جو درحقیقت اُن کا طغرائے امتیاز ہے۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝ اور ہم نے اس کی سلطنت و مملکت کو قوت دی اور بہت مضبوط کیا اور اسکو دانائی و تدبیر اور قوت فیصلہ بخشی۔

حکمت، تدبیر، صلیب ہو یا منصب نبوت دونوں کو شامل ہے اور اُن جامع الفاظ میں سے ہے جو اس قسم کے تمام ملکات کو وسیع و حاوی ہے۔

اسی لیے یہاں عطاءِ مملکت، نبوت و حکمت، اور قوتِ فیصلہ کے اس شرف کا اظہار فرمایا جو نیابت و خلافت الٰہی کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ مگر حضرت داؤد نے اپنے خیال میں ان ہر دو قسم کے مجد و شرف کا منشاءِ الٰہی یہ سمجھا کہ مجھ کو اپنی زندگی کے اوقات کو دو حصوں پر اس طرح تقسیم کر لینا چاہیے کہ ایک کا تعلق عبادات سے ہو اور دوسرے کا تعلق معاملات سے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک دن خالص عبادتِ الٰہی کے لیے مقرر کیا اور دوسرا دن خالص فیصلۂ معاملات اور منصب خلافتِ الٰہیہ کے انصرام کے لیے، اور پھر عبادات و معاملات کی اس تقسیم میں بھی دونوں پہلوؤں انفرادی اور اجتماعی کو جُدا جُدا اوقات میں بانٹ دیا۔ اور ان چار حصوں کو اس طرح الگ الگ کر دیا۔

ایک دن صرف عبادتِ الٰہی میں مشغولیت کا، دوسرا دن بنی اسرائیل میں خشیتِ الٰہی کے لیے وعظ و تذکیر کا، اسی طرح ایک دن اپنے اہل و عیال کے معاملات کی درست کاری کا اور دوسرا دن اُمت کے معاملات کے فیصلوں کا۔[1] لیکن خدا کے ساتھ نبی و رسول کا معاملہ عام صلحاء و مقربین کے معاملہ کی طرح نہیں ہے۔ یہاں تو ہر حرکت و سکون پر نظر ہے اور قطعاً اجازت نہیں

[1] وكان عليه السلام كما روى عن ابن عباس جزء زمانه اربعة اجزاء يوما للعبادة ويوما للقضاء ويوما للاشتغال بنفسه ويوما لجميع بنى اسرائيل فيعظهم ويبكيهم (روح المعانی)

کرکسی معاملہ میں خواہ وہ عبودیت سے متعلق ہو یا نظم حکومت سے، انفرادی ہو یا اجتماعی بغیر اطلاعِ وحی کے کچھ بھی کریں۔ وہاں مرضیات کو کیا دخل؟ وہاں تو جو کچھ بھی ہے وہ سب وحی الٰہی کا فیضان ہے اور بس!

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (والنجم) اور یہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہتے یہ جو کچھ بھی ہے خدا کی وحی ہے جو اُن پر نازل ہوئی۔

ہوائے نفس سے الگ وحی الٰہی کے زیر اثر نطق و گویائی کچھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر نبی و رسول کی یہی شان ہے اور یہی ہونی چاہئے تو ایسی حالت میں حضرت داؤد کی شانِ نبوت سے یہ بات مستبعد تھی کہ وہ مرضیٔ الٰہی حاصل کیے بغیر اپنے اوقات کا اس طرح مستقل نظامِ عمل بنائیں، اور عبادت و خلافتِ الٰہیہ کی انجام دہی کے لیے جُدا جُدا ایام مقرر فرمائیں۔

بیشک نہ یہ معصیت تھی نہ خطاء، گناہ کے کسی شعبہ کا اس میں دخل نہ تھا لیکن بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" یہ پیرہن نبوت و رسالت کے جسم پر موزوں نہ تھا، اس لیے کہ عبادت الٰہی تخلیق انسانی کا مقصد عظمیٰ سہی اور یہ بھی درست کہ اس نور کے فیضان سے تقرب الی اللہ کی راہیں کھلتی ہیں لیکن بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ پر لانے والے بندوں کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو خدا کے ساتھ جوڑنے والے اخلاق کاملہ کے ہادی، اور اُمت کے رہنما کے لیے سب سے بڑی عبادت و ریاضت اسی میں ہے کہ وہ مخلوق کے معاملات کو درست کرے اور اُن کو راہِ کج سے ہٹا کر راہِ مستقیم پر لائے۔

وہ بیشک تسبیح و تہلیل، ذکر و اشغال سے مستغنی نہ ہو۔ عبادتِ الٰہی میں سرشار ہو لیکن اس طرح نہیں کہ دن کے کسی گوشہ میں بھی منصبِ نبوت کی کارفرمائی نہ ہو اور صرف منصبِ ولایت ہی بروئے کار آئے، یہ نبی و رسول کی حیات کے لیے کیسے موزوں ہو سکتا ہے؟

لہذا مشیتِ الٰہی نے اس سہو پر متنبہ کرنے کے لیے ایک لطیف صورتِ حال پیدا کردی اور

خاص اُس روز جبکہ وہ عبادتِ الٰہی کے لیے خلوت نشین تھے اچانک ایک عجیب واقعہ سے اُن کو دوچار ہونا پڑا

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ۝ إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۝ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ

کیا تجھ کو دعوے والوں کا وہ قصہ معلوم ہے جب وہ دیوار کود کر عبادتخانہ میں گھس آئے۔ جب داؤد کے پاس پہنچے تو داؤد اُن کو گھبرایا۔ وہ کہنے لگے گھبراؤ نہیں ہم دو قضیے والے ہیں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے سو فیصلہ کر دے ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ اور حد سے نہ گزر اور ہم کو سیدھی راہ بتا دیجیے۔ قضیہ یہ ہے کہ یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دُنبی ہے۔ پھر کہتا ہے کہ ایک دُنبی بھی میرے حوالہ کر دے اور مجھ کو گفتگو میں غالب تیز زبان ہے۔ داؤد نے کہا یہ بے انصافی کرتا ہے کہ تجھ سے تیری ایک دُنبی بھی اپنی دنبیوں میں ملانے کے لیے مانگتا ہے۔ اور اکثر شریک ایک دوسرے پر زیادتی ہی کرتے ہیں سوا اُن لوگوں کے جو یقین لاتے ہیں اللہ پر اور کام کیے ہیں نیک اور وہ بہت تھوڑے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام خلوتگاہ میں عبادت میں مشغول ہیں، اچانک دو آدمیوں کا اس بُری طرح سے گھس آنا، اور حضرت داؤد کا ناگواری اور گھبراہٹ محسوس کرنا ایک فطری اور بشری تقاضہ تھا اس کے لیے باب تاویل کیوں کھولا جائے اور رکیک احتمالات کیوں پیدا کیے جائیں؟

دو شخصوں کا عبادت کے اس مخصوص دن میں اس طرح جرأت کے ساتھ مخل انداز ہونے اور پھر بیباکانہ طرز و انداز میں قضیہ کو پیش کرنے سے حضرت داؤد کو اپنے معاملہ کا نقشہ صاف صاف نظر آنے لگا، سمجھ گئے کہ حق تعالیٰ کو یہ ادا پسند نہیں آئی تب ہی یہ اجنبی صورتِ حال پیدا کی گئی۔

اسی طرح معاملہ والوں کو تو ان کا معاملہ سمجھا دیا اور نبوت کے منصبِ دعوت وارشاد کے پیشِ نظر یہ بھی بتا دیا کہ دنیا میں یہی ہو رہا ہے کہ ہر قوی ضعیف کو پنپنے نہیں دیتا اور ظلم و زیادتی کی یہ رسم اسی طرح جاری ہے ہاں البتہ نیک عمل بندے اس سے مستثنیٰ ہیں جو بہت تھوڑے ہیں۔

اور پھر اپنے معاملہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۝	اور داؤد کے خیال میں آیا کہ ہم نے اس کو جانچا پھر بخشش چاہنے لگا اپنے رب سے اور گر پڑا سر نیاز جھکا کر اور رجوع ہوا۔ پھر ہم نے اس کو معاف کر دیا یہ معاملہ۔ اور اس کے لیے ہمارے پاس مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا۔

حضرت داؤد نے اقرار کیا کہ بیشک مجھ سے لغزش ہوئی کہ میں نے نبوت کے اہم امور فصلِ معاملات کو وہ جگہ نہ دی جو اس کو ملنی چاہیے تھی۔ یقیناً اس طرح امت کی ضروریات و حاجات میں سخت حرج واقع ہوا اس لیے کہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک دن خالص عبادت کیلئے وقف کیا جائے اور امت کو مشکوٰۃ نبوت کے فیضان سے محروم رکھا جائے۔

حضرت داؤد جلیل القدر نبی تھے لطیف اشارہ کو پہچان گئے اور اپنی اس معمولی سی لغزش کو بھی گناہ تصور کرتے ہوئے جناب باری میں عذر خواہ ہوئے، وہاں کیا دیر تھی، توفیقِ الٰہی کا مقصد ہی یہ تھا فوراً معافی ہو گئی اور دوسروں کو بھی بتا دیا کہ داؤد کے استغفار اور ہمارے قبولِ مغفرت سے کہیں یہ دھوکا نہ کھانا کہ داؤد نے کوئی گناہ کیا تھا یا اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا تھا جو انسانی نگاہوں میں مروت و اخلاق کے خلاف ہو نہیں

اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ اس کے لیے ہمارے پاس یقیناً رتبہ (رتبۂ نبوت) اور بہترین جگہ ہے۔

اس کے بعد اس لطیف پیرایۂ بیان کی تشریح یا اس اجمال کی تفصیل نہایت خوبی سے حض

داؤد کو مخاطب کرکے اس معجزانہ انداز میں کر دی :-

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ — اے داؤد ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے - لہذا

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ — لوگوں پر انصاف کے ساتھ حکومت کر

اس سے زیادہ حقیقتِ حال کی وضاحت اور کیا ہوسکتی تھی کہ نیابتِ الٰہی اور خلافتِ خداوندی کا اہم مقصد خلوت گاہ کی عبادت میں نہیں بلکہ خلق اللہ کی خدمت، رشد و ہدایت اور مبنی بر انصاف حکومت میں ہے۔ اور اے داؤد یہی تمہارا امتیازی نشان ہے۔

یہ رب العٰلمین کے لطیف پیرائیہ بیان کی لطافت اور معجزانہ کمال ہی کا حصہ تھا کہ ایک زاہد کے زہد و عبادت جیسی اعلیٰ صفت کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے منصبِ نبوت کے احساسِ فرض کی طرف اس اچھوتے انداز سے حضرت داؤد کو متوجہ کیا اور صرف ایک جملہ کہہ کر حقیقت کے تمام پردے چاک کر دیے

اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک دوسرے معاملہ کی طرف بھی نظر ڈال لیجئے سورہ بقرہ میں حضرت آدم کے خلیفہ بنائے جانے کے متعلق خدائے برتر اور فرشتوں کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے اس پر غور فرمائیے۔

ملائکۃ اللہ اس بشارت کے بعد بھی کہ آدم خلیفۃ اللہ ہیں یہی محسوس کرتے رہے کہ آدم کو یہ شرف کیوں دیا جاتا ہے جبکہ تقدیس و تسبیح میں ہم کہیں اس سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ خلافت کثرتِ تقدیس و تسبیح سے نہیں ملتی بلکہ اس کے لیے علم و حکمت کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ سے نیابتِ الٰہی کا صحیح حق ادا ہوسکے، تب فرشتوں کو بھی کہنا پڑا :-

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا — پاکی تیرے ہی لیے زیبا ہے ہمیں واقعی اس سے زیادہ علم نہیں جتنا کہ تو نے ہم کو سکھایا

اب حضرتِ آدم کے اعلانِ خلافت کے بعد یہ دوسرا موقعہ ہے کہ حضرت داؤد کو مخاطب کرکے کہا جاتا ہے کہ تو خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ موقعہ کے مناسب

اور مقام کے حسب حال اس سے بہتر دوسرا تخاطب ممکن ہی نہیں تاکہ داؤد علیہ السلام کے پیش نظر یہ حقیقت خوب واضح ہو جائے کہ اُن کی ہستی اور ان کا وجود یا اُن کی بعثت کا مقصدِ اعظم کیا ہے؟ ایک عابد و زاہد کی طرح خانقاہ میں تسبیح و تہلیل میں مشغولیت یا اُمت کے رشد و ہدایت اور فصلِ معاملات کی کشتی کی ناخدائی!!

اب اس طویل بحث کے بعد ایک مرتبہ آپ خود تمام معاملہ پر نظر ڈالیے اور پھر قرآن کے سباق یعنی واقعہ کے تذکرہ سے پہلے کی آیات اور سیاق یعنی واقعہ کے تذکرہ کے بعد کی آیات کیا بتا رہی ہیں؟ اس پر گہری نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ

کہنے والے نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کہا قرآنِ عزیز کا سیاق وسباق خود اس کا شاہد ہے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت اُس کے لیے دلیلِ راہ۔

ناانصافی ہوگی اگر اس آخری آیۃ کے تمہ کے متعلق مضمون کو تشنہ چھوڑا جائے اور فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ کے بعد وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى کے متعلق بھی سابق آیات کی طرح جو بیسیوں احتمالات اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ کسی طرح استغفارِ داؤد کے ساتھ لا تتبع الھوٰی کا جوڑ بھی لگ جائے اور ساتھ ہی منصبِ نبوت پر حرف گیری بھی نہ ہو سکے اور اس سعی میں ضعیف اقوال اور بعید احتمالات کو اختیار کیا گیا ہے، اِس کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اور نظمِ قرآنی سے جو کچھ بے تکلف ظاہر ہوتا ہے اُسی کو مستند سمجھا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت داؤد کو یہ بتا دیا گیا کہ تمہارا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ تم خلیفۃ اللہ فی الارض ہو، اور خدمتِ خلق اور قیامِ عدل و نصفت تمہارا سب سے بڑا فرض ہے تو حق تعالیٰ نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ مختصر طور پر اس کے بنیادی اصول کو واضح اور اس راہ کے خطرات کو ظاہر فرما دے۔ ارشاد فرمایا:-

ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ (اور دیکھو کسی حالت میں) خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ پھر وہ اللہ
ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم کی راہ سے تجھ کو بے راہ کردے یقیناً جو لوگ بے راہ ہو جاتے ہیں
عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب۔ اللہ کی راہ سے ان کے لیے سخت عذاب ہے اس بات پر کہ انھوں نے بھلا دیا حساب کا دن

اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضرت داؤد ہوائے نفس میں مبتلا ہو گئے تھے اور پھر اب ان کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ اس میں تو دراصل متوجہ کرنا ہے اس اصل الاصول کی جانب جو نیابتِ الٰہی وخلافتِ خداوندی کے لیے ازبس ضروری ہے

اب آپ ہی اندازہ کیجیے کہ بات کہاں تھی اور کہاں پہنچ گئی۔

پھر قطع نظر اس بات سے کہ اس سلسلہ کی داستانیں روایۃً ودرایۃً سب غلط ہیں اور ہزلیات وخرافات ہیں، خود نظمِ قرآنی کب ان لغویات کو متحمل ہوتا ہے۔ شروع آیات میں حضرت داؤد کی منقبت ومدح سرائی ہو رہی ہے اور پھر آخر میں مدح وستائش کا بلند سے بلند رتبہ "خلافت" عطا کیا جا رہا ہے، مگر درمیان میں ایک ایسے فعلِ شنیع کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے جو اخلاق رذیلہ کے پست سے پست درجہ میں شمار ہوتا ہے۔ قرآنِ عزیز کی معجزانہ ترتیب تو کجا کسی معمولی فصیح وبلیغ کلام میں بھی یہ بے سلیقگی ناممکن ہے

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس آیت کے سلسلہ میں جس قدر توجیہات کتبِ تفسیر وکلام میں منقول ومسطور ہیں، اگر ان کے ساتھ بیان کردہ توجیہ کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو آپ کو خود اندازہ ہو جائیگا کہ نظمِ قرآنی سے قریب تر بلکہ بے غل وغش، سیاق وسباق کے ٹھیک مطابق یہی توجیہ ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

البتہ ان تمام احتمالات وتوجیہات سے جدا حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے اس سلسلہ میں ایک روایت منقول ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور اس کے صحیح الاسناد ہونے پر حکم بھی لگایا ہے۔ یہ روایت خود اپنی جگہ اپنا مرتبہ رکھتی ہے اور اسی لیے بیان کردہ

توجیہات پر بحث و تبصرہ کرنے کے بعد صرف اس کا نقل کر دینا ہی کافی ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال ما اصاب داؤد ما اصاب بعد القدر الا من عجب عجب بہ من نفسہ ذلک انہ قال یا رب ما من ساعۃ من لیل ولا نہار الا و عابد من آل داؤد یعبدک یصلی لک او یسبح او یکبر و ذکر اشیاء فکرہ اللہ ذلک فقال یا داؤد ان ذلک لم یکن الا بی فلولا عونی ما قویت علیہ وجلالی لاکلنک الی نفسک یوما قال یا رب فاخبرنی بہ فاصابتہ الفتنۃ ذلک الیوم۔	حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد کو تقدیر الٰہی سے جو پیش آیا اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے دل میں خود پسندانہ نازکی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، اس میں خدا سے مناجات کے وقت کہنے لگے خدایا دن اور رات کی ایک گھڑی بھی خالی نہ تھی جس میں داؤد اور آل داؤد میں سے کوئی ایک تیری عبادت، نماز یا تسبیح و تہلیل میں مشغول نظر نہ آتا ہو، اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کی یہ ادا پسند نہ آئی اور ارشاد فرمایا، داؤد یہ سب کچھ میری توفیق کی وجہ سے ہے، میری مدد نہ ہوتی تو آل داؤد میں یہ قدرت کب تھی؟ اپنی عزت و جلال کی قسم میں تجھ کو کسی دن تیرے نفس کی سپرد کر دونگا (یعنی توفیق ہٹا لونگا) حضرت داؤد نے عرض کیا بار الٰہا جس دن ایسا ہو مجھ کو اطلاع ہو جائے پس اسی دن آزمائش میں مبتلا ہوگئے۔
مستدرک جلد۲ کتاب التفسیر ص۴۳۳	

حضرت ابن عباسؓ کے اس اثر کا مطلب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے "فتنہ" اور آزمائش کا معاملہ اس سے زیادہ نہ تھا کہ ان کو اپنی اور اپنے خاندان کی عبادتِ شب و روز پر ایک قسم کا ناز ہوا جس کو انہوں نے ایک دن خدا کے سامنے بھی ظاہر کیا، حق تعالیٰ کو ان کی یہ ادا پسند نہ آئی اس لیے کہ نبی کی عظمتِ شان کے وہ سب نامناسب ہے جو ابرار و مقربین کے لیے غیر موزوں نہیں لہٰذا ان کی عبادت میں قدرت نے رخنہ اندازی کرا دی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ عبادت کا یہ نظم بھی خدائے برتر ہی کی توفیق کی بدولت ہے۔ بقول شاعر:۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی

منت شناس ازو کہ بہ خدمت گذاشتت

بالآخر حضرت داؤد کو اس کا احساس ہوا اور مغفرت کے طالب ہوئے۔ رحمت الٰہی جوش میں آئی اور فغفرنا لہ ذلك و ان لہ عندنا لزلفی و حسن مآب کی بشارت سنا کر ان کو بامراد کیا!

اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت مشہور ہے۔ اگرچہ بقول صاحب روح المعانی حافظ زین الدین عراقی محدث نے اس کی صحت نسبت سے انکار کیا ہے۔ مگر علامہ خفاجی جو محقق محدث ہیں وہ اس روایت کو نقل کر کے اس کے انکار و اقرار سے سکوت اختیار کرتے ہیں۔

شیخ محمود آلوسی لکھتے ہیں:۔

ولذا قال علی کرم اللہ وجہہ ما فی بعض الکتب من حدث بحدیث داؤد علیہ السلام علی ما یرویہ القصاص جلدتہ مائۃ و ستین الخ (روح المعانی جلد ۲۳)	اس لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بعض کتابوں میں روایت مذکور ہے۔ انھوں نے فرمایا جو شخص اس حدیث داؤد علیہ السلام کو روایت کریگا جس کو فسانہ گو یوں بیان کیا ہے تو میں روایت کرنے والے کو ایک سو ساٹھ کوڑے لگاؤنگا۔

سحر و صابئیت تاریخ کی روشنی میں

(از مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی فاضل دیوبند)

(۲)

جدید نظریۂ تحقیق کے اصول کے مطابق کسی قدیم قوم و مذہب یا علم و فن کی تاریخ سے بحث کرنے کے لیے سب سے زیادہ سہل اور یقینی دو طریقے ہیں۔

۱۔ اس کے نام اور وجہ تسمیہ کی لغوی تحقیق کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟ سب سے پہلے کس قوم نے اس لفظ کو استعمال کیا اور کب اور کس بنا پر استعمال کیا؟

۲۔ آثار قدیمہ اور حفریات۔

پہلا طریق علمی ہے اور دوسرا عملی، بتوفیق الٰہی ہم علی الترتیب ان دونوں طریقوں پر سحر و صابئیت کی تاریخ سے بحث کرینگے

صابئیت کی لغوی تحقیق (۱) "صَبَأَ" عربی لغت میں ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ صَبَأَ الرجل مال من دین الی دین (قاموس، لسان العرب وغیرہ) صَابِئِیْ وہ شخص جو اپنا پہلا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرلے، اس بنا پر ابتداء اسلام میں مشرکین عرب نے اسلام میں داخل ہونے والوں کو صَابِی اور صُبَاۃ کا لقب دیا تھا کیونکہ وہ اپنا قدیم مذہب بت پرستی چھوڑ کر توحید و رسالت کی طرف آرہے تھے۔

صابئین نے توحید و رسالت، جو دین فطری آدم و نوح علیہما السلام کی اولاد میں قدیم الایام

سے چلا آرہا تھا اس کو چھوڑ کر روحانیات اور کواکب کی پرستش اختیار کی تھی اس لیے اُن کو "صابئی" کہا گیا یا یوں کہیے کہ اس عہد کی گمراہ اقوام عاد و ثمود وغیرہ کے مذہب بت پرستی کو چھوڑ کر انہوں نے ہیا کل سماویہ (سیارات) اور ارواح کی پرستش شروع کی تھی اس لیے اُن کو "صابئی" کہا گیا۔ بہرحال موحدین و مشرکین دونوں کے نقطۂ نظر سے وہ "صابئی" یعنی مرتد تھے۔ کیونکہ روحانیات اور ستاروں کی پرستش دونوں کے لحاظ سے ایک نیا مذہب تھا۔

(۲) اس لفظ کا ایک اور تاریخی اشتقاق بھی ہے۔ عربی لغت میں صَبَأَتِ النُّجُومُ اِذَا طَلَعَتْ "ستاروں کا طلوع ہونا" بھی اس لفظ کے معنے آتے ہیں اُدھر سامی زبان زبان میں لفظ صَبَا کے معنی تارے کے ہیں۔ عبرانی میں بھی صبا جماعتِ سیارگان کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ تو عربی، عبرانی اور سریانی تینوں زبانوں میں اس لفظ کا مفہوم کوکب سے متعلق ہے لہذا کہا جا سکتا ہے کہ کوکب پرستی کی وجہ سے ان کو تینوں زبانوں میں "صابئین" کہا گیا۔

(۳) مذہب صابئیت کا جزو اعظم روحانیات سے غایت قرب و تعلق اور اُن سے عشق و محبت پیدا کرنا ہے، اور عربی میں صَبَأَ الرَّجُلُ اِلٰی فُلَانٍ کے معنے کسی کی طرف مائل ہونے اور محبت کرنے کے بھی آتے ہیں اسی مادہ سے "صَبْوَۃٌ" بمعنی عشق و محبت اور "صُبَاۃٌ" بمعنی عشاق مستعمل ہے "صَبِیٌّ" بچہ کو اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر شخص کی طبیعت اُس کی طرف مائل ہوتی ہے۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ انبیاء مرسلین کے دامن کو چھوڑ کر روحانیات سے رشتہ جوڑنے اور اُن سے عشق و محبت پیدا کرنے کی وجہ سے اُن کو "صابئی" کہا گیا۔

(۴) بعض مورخین کا خیال ہے کہ نوح علیہ السلام کے والد لمک کے ایک بھائی کا نام "صابی" تھا۔ صابئین اس کی طرف منسوب ہیں[1]۔

---

[1] تاریخ ابن جریر و ابن اثیر جلد اول۔

(۵) صابئہ مدعی ہیں کہ صابئیت کے بانی صابی بن شیث ابن آدم علیہ السلام ہیں، اسی لیے ان کو صابئی کہا جاتا ہے۔ شیث کو صابئہ عاذیمون یا عاذیموت کہتے ہیں[۱]۔

صابئیت کا اجمالی خاکہ

صابئیت دنیا کا سب سے پرانا اور عالمگیر مذہب ہے۔ ابتدا میں یہ مذہب خالص وحدانیت پر مبنی تھا۔ روحانیین یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عالم علوی و سفلی کے نظام کا مدبر اور حوادث کونیہ میں کارفرما سمجھتے تھے۔ سیارات و کواکب اور اجرام علویہ یعنی آسمانوں، اور ان کی حرکات اور طلوع و غروب کو اسباب کے درجہ میں عالم کے اندر موثر مانتے تھے۔ بت پرستی سے بیزار تھے۔ روحانیین اور سیارات و اجرام کو صرف عظمت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے مگر مرور ایام کے ساتھ ساتھ اس عظمت و احترام میں بھی ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ ہیاکل سماویہ یعنی سیارات کے لیے ارواح تجویز کیں اور انہی ارواح و روحانیات کو تقرب الٰہی اور قضاء حوائج کا ذریعہ قرار دے کر نبوت و رسالت کا انکار کر دیا اور حنیفیت کے مدمقابل بن گئے۔ اب صابئیت و حنیفیت دو مقابل مذہب ہو گئے اول الذکر ایک کسابی کمال انسانی تھا جس کا مدار صرف ریاضت اور انسانی جدو جہد پر تھا، اور ثانی الذکر کا مدار محض موہبت الٰہی اور نبوت و رسالت پر تھا۔ مابہ الامتیاز دونوں مذہبوں میں یہ تھا۔

صَابِئِیَّت: التعصب للروحانیین۔ روحانیت کی طاعت و حمایت اور انہی کو ذریعہ نجات سمجھنا، صابئیت ہے۔

حَنِیْفِیَّت: التعصب للبشر الجسمانیین۔ بشر جسمانی یعنی انبیاء کرام کی اطاعت و حمایت اور اسی کو ذریعہ نجات سمجھنا، حنیفیت ہے۔ (ملل و نحل شہرستانی)

علامہ عبدالکریم شہرستانی نے "ملل و نحل" میں حنیفیت اور صابئیت کو کما حقہٗ ممتاز کرنے کے لیے مناظرۂ صابئہ و حنفاء لکھا ہے جو علامہ موصوف کا شاہکار اور کتاب مذکور کی قابل قدر بے نظیر

---

[۱] تاریخ ابوالفدا۔ جلد اول۔

بحث ہے۔

اسی طرح اور ذرا زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد ہیاکل سماویہ اور اجرام علویہ کی یہ دوری ناگوار معلوم ہونے لگی لہٰذا ان کے نام کے مجسمے اور بت بنوا کر رکھ لیے اور اب کواکب پرستی کے ساتھ بت پرستی بھی بروئے کار آگئی۔

علامہ ابن حزم اپنی کتاب "الفصل بین الملل" میں صابئیت کے ابتدائی عہد کے متعلق فرماتے ہیں :۔

صابئین جس مذہب کے مدعی ہیں وہ دنیا کا سب سے پرانا اور روئے زمین پر سب سے زیادہ غالب مذہب تھا، یہاں تک کہ صابئین نے اس میں نئی نئی باتیں (کواکب پرستی و بت پرستی وغیرہ) پیدا کر دیں اور اس کے احکام کو بدل ڈالا، جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

علامہ طنطاوی جوہری صابئین کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا مصداق قرار دیتے ہیں جن کی ہدایت کے لیے وہ مبعوث کیے گئے تھے، اور اس مذہب صابئیت کی ابتدائی نشاۃ پر ذیل کے الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

صابئین ایک قوم ہے جو اپنے آپ کو روحانیات کی طرف منسوب کرتی ہے۔ ان کے عقائد و اعمال کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم الایام اور امم فانیہ میں اس فرقہ کے اسلاف اور ربانیین کا مذہب پاکیزگی، طہارت، تزکیۂ نفس اور مقامِ اعلیٰ تک ترقی کرنا اور فرشتوں سے مماثلت پیدا کرنا تھا، چنانچہ قاعدہ ہے کہ ہر مذہب جب ابتداءً رائج ہوتا ہے اور لوگ اس کو قبول کرتے ہیں تو وہ آغاز میں محض ہدایت اور فطرۃ کے موافق، اپنے متبعین کے لیے مفید اور قبول کرنے والوں کے لیے نافع ہوتا ہے مگر مرور ایام کے بعد وہ جہالت اور گمراہی کے گڑھے میں گر جاتا اور انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ بن کر رہ جاتا ہے، یہی حال صابئیت کا ہے۔ چنانچہ

ابتدا میں صابئین کا عقیدہ تھا کہ عالم کا ایک پیدا کرنے والا ہے جو خود مخلوق کی صفات سے منزہ ہے اور اس کے فرشتوں کا ایک گروہ ہے، یہی فرشتے عالم علوی وسفلی اور زمین وآسمان کے منتظم اور کار فرما ہیں"۔

صابئیت کی ابتداء اور اصل حقیقت | مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ گو صابئین بعثت انبیاء اور رسالت بشری کے شدید منکر ہیں مگر اس کے باوجود اعتراف کرتے ہیں کہ عاذیمون وہرمس صابئیت کے معلم اول ہیں۔ روحانیین اور ان کے کمالات سے سب سے پہلے انھوں نے ہی ہیں روشناس کرایا ہے۔ ابن ندیم کتاب "الفہرست" میں بیان کرتے ہیں کہ صابئیت کے معلم اور بانی تین ہیں:۔

۱۔ ارانی، ۲۔ اغاثا ذیمون (عاذیمون) ۳۔ ہرمس۔

شہرستانی صابئہ کے ایک فرقہ "حربانیہ" کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: "یہ لوگ اپنے معتقدات و اقوال عاذیمون۔ ہرمس۔ اعیانا۔ اور اواذی ان چاروں کی جانب منسوب کرتے ہیں"

معلوم ہوتا ہے کہ ابن ندیم نے اواذی اور عاذیمون کو ملا کر اغاثا ذیمون ایک شخص بنا دیا ہے درحقیقت یہ دو شخص ہیں۔ اسی طرح ارانی اور اعیانا ایک ہیں۔

بہرحال ہرمس اعظم اور عاذیمون کو صابئہ کے تمام فرقے اپنا معلم اول تسلیم کرتے ہیں۔

تمام مورخین ومحققین مذاہب اور خود صابئہ اس پر متفق ہیں کہ عاذیمون سے حضرت شیث اور ہرمس سے حضرت ادریس مراد ہیں۔ صابئہ اپنے معتقدات کی صحت وحقانیت کی سب سے بڑی سند یہی پیش کرتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کی تعلیمات اور ان کے عہد کی تحقیق کی جائے تاکہ صابئیت کی ابتدائی تاریخ سامنے آجائے۔

عاذیمون یا عادیموت | عاذیمون یا عادیموت کے متعلق اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مورخین اور خود صابئہ ان کو شیث کہتے ہیں اور انہی کے بیٹے صابی بن شیث کی نسبت سے خود کو "صابی" کہتے ہیں

ہرمس | ہرمس اعظم اور اُس کی تعلیمات کے متعلق تاریخ میں کافی مواد موجود ہے جس سے فرقہ صابئہ کی ابتدا اور تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔

شہرستانی "ملل ونحل" میں ہرمس اعظم کی تعلیمات ووصایا اور اُن کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں وصایاء ہرمس اس لیے نہیں بیان کرتا کہ وہ۔ لعیاذ باللہ صابی تھے بلکہ میرا منشاء اس سے صرف یہ ہے کہ ہرمس کی حکیمانہ باتیں صابئیت کے خلاف ہیں اور مذہب حنیفیت کی تائید کرتی ہیں اور اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت ورسالت اصلِ کمالات ہے۔ انبیاء ومرسلین ہی ہر قسم کے کمال کا مرجع ہیں اور شرائع الٰہیہ کی پیروی لازم ہے"۔ ہرمس اعظم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ہرمس پسندیدہ اقوال اور قابل تعریف وتوصیف آثار وافعال کے ساتھ موصوف ہیں، انبیاء کبار میں سے شمار ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ادریس نبی علیہ السلام وہی ہیں۔ بروج وکواکب اور سیاروں کے نام سب سے پہلے انہوں نے ہی تجویز کیے، سیارات کی بروج میں ترتیب اور ان کے لیے شرف ووبال، اوج وحضیض، مناظر ثلاثہ تثلیث وتربیع وتسدیس مقابلہ مقاربہ، رجعت اور استقامت کو اول اول اُنہوں نے ہی ثابت کیا اور کواکب کی تعدیل وتقویم بیان کی۔"

شہرستانی کی طرح دوسرے مورخین بھی ہرمس اعظم کا مصداق ادریس علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں علامہ فرید وجدی "دائرۃ المعارف" میں لفظ "ہرمس" کے تحت میں لکھتے ہیں:۔

"یہ ہرمس اول کا نام ہے اس لفظ کا اصلی تلفظ "ارمس" ہے جو عطارد کا نام ہے۔ یونانی ہرمس کو "اطرسمین" کہتے ہیں اور عرب "ادریس" اور عبرانی "اخنوخ"۔ یاردبن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہم السلام کے بیٹے ہیں اور مصر کے شہر منف میں پیدا ہوئے۔

اس کے بعد فرید وجدی نے مبشر بن فاتک سے انکا حلیہ اور اخلاق بالتفصیل نقل کیے ہیں جو بالکل انبیاء سے ملتے جلتے ہیں۔

مشہور منجم ابو معشر بلخی کتاب الالوف میں لکھتا ہے کہ ہرمس تین گزرے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہرمس اول ہیں جن کا زمانہ طوفان سے پہلے ہے۔ ہرمس دراصل قیصر و کسریٰ کی طرح ایک لقب ہے۔ اہل فارس ان کو "الجد" یعنی خداوند عدل کہتے ہیں۔ صابئہ کا فرقہ حرانیہ ان کی نبوت کا مدعی ہے اہل فارس کہتے ہیں کہ یہ کیومرث یعنی آدم کے پوتے ہیں۔ عبرانی میں ان کو اخنوخ اور عربی میں ادریس کہتے ہیں۔ اس کے بعد ابو معشر لکھتا ہے کہ یہ کائنات علویہ اور حرکاتِ کواکب کے سب سے پہلے معلم ہیں ان کے دادا کیومرث یعنی آدم نے دن رات کے گھنٹے ان کو بتلائے۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے عبادت خانے بنائے اور اُن میں خدا کی عبادت کی۔"

اس کے بعد ابو معشر ذرا تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح تمام علوم و فنون ایجاد کیے اور کس کس طریق پر اُن کو طوفان کی دست برد سے بچانے کے لیے محفوظ کیا۔ اور پھر لکھتا ہے:-
علمائے سلف یعنی علماء اسلام سے ایک اثر میں مروی ہے کہ یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتابوں کو پڑھا پڑھایا اور علوم و فنون ترتیب دیے۔ اللہ پاک نے تیس صحیفے اُن پر نازل کیے۔ سب سے پہلے کپڑے سی کر اُنہوں نے ہی پہنے اور اللہ پاک نے اُن کو بلند مقام پر اُٹھالیا:

ابن الندیم کتاب الفہرست میں کندی سے نقل کرتے ہیں:-
"کندی نے صابئہ کے پاس ایک کتاب دیکھی جس کی وہ بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں یہ توحید پر ہرمس کے مقالات ہیں جو اُس نے اپنے بیٹے کے لیے لکھے ہیں۔ مسئلہ توحید پر اس قدر مستحکم اور ٹھوس مقالات ہیں کہ بڑے سے بڑا فیلسوف بھی حد درجہ جانفشانی اور تعب نفس کے باوجود ان مقالات سے درگزر نہیں کر سکتا اور ان کے قبول کرنے پر مجبور رہے"

ابن اثیر اخنوخ کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

"اخنوخ بن یرد بن مہلائیل بن قینان بن نوش بن شیث بن آدم علیہم السلام یہی ادریس علیہ السلام ہیں یہ اولاد آدم میں سب سے پہلے شخص ہیں جن کو نبوت دی گئی، انہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھنا ایجاد کیا اور علوم نجوم وحساب میں سب سے پہلے انہوں نے کلام کیا۔ یونانی حکماء ان کو "ہرمس حکیم" کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے، ان پر تیس صحیفے نازل ہوئے تھے انہوں نے ہی سب سے پہلے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا۔"

ابن اثیر کا یہ تمام بیان طبری سے ماخوذ ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں مرتب ہے اور وہاں پراگندہ۔

علامہ طنطاوی جوہری نے حضرت ادریس کے متعلق لکھا ہے:-

"انہی کو (تورات کی زبان میں) "اخنوخ" کہتے ہیں۔ ادریس دراصل اِذْرِیس یا اِسْوِرِیس کی تعریب ہے یہ نام مصری آثار میں موجود ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"ہمارے علمائے مفسرین متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا، کپڑے سیے اور سی کر پہنے، سب سے پہلے ہتھیار بنائے اور علم حساب ہندسہ ایجاد کیا۔ یہ ہمارے مفسرین کا بیان ہے جو قدماءِ مصریین کے بیان سے بالکل مطابق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قدماء مصریین اپنے تمام علوم وفنون اور صنائع وحرف کو انہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔"

امام رازی نے بھی وَاذْکُرْ فِی الْکِتَابِ اِدْرِیْسَ کے ذیل میں حضرت ادریس کو نوح علیہ السلام

کا پردہ اٹھایا ہے۔

قرآن حکیم حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر صرف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا — اور اے پیغمبر کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کر۔ بلاشبہ وہ بھی مجسم سچائی اور نبی تھا۔ اور ہم نے اسے بڑے ہی اونچے مقام تک پہنچا دیا تھا۔

نبوت کے ساتھ لفظ صدیق ان کے شخصی ممیزات پر دال ہے۔

علامہ طنطاوی جوہری لکھتے ہیں:۔

"صدیق کے معنی ہیں کثیر الصدق والتصدیق اور علوم وفنون تصدیقات کے مجموعہ ہی کو کہتے ہیں لہذا علوم حقہ واقعیہ کی کثرت تدوین وتصنیف اور اُن پر اطلاع دینے کی وجہ سے ان کو صدیق کہا گیا ہے"۔

رازیؒ نے لفظ ادریس کی وجہ تسمیہ کثرت درس وتدریس بتلائی ہے۔

رفعت مکانی کے متعلق مفسرین مختلف ہیں بعض رفع حسی کے قائل ہیں کہ آپ کو زندہ یا بعد الموت آسمان پر اٹھا لیا گیا لیکن اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ رفعت مکانی سے رفعتِ علمی مراد ہے

الغرض ہرمس اعظم اور حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیمات اور احوال اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ ان کی بنا پر مورخین اور صابئہ کے اس بیان کی صحت میں کوئی شک نہیں رہتا کہ ہرمس اعظم سے ادریس علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

لہذا معلوم ہوتا ہے کہ ادریس علیہ السلام نے احکام الٰہیہ اور نوامیس شرعیہ کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے دنیا کو کائناتِ علوی کے اسرار، نظام عالم سفلی کے رموز اور قدرت وعنایتِ الٰہیہ کے پوشیدہ رازوں سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی معصوم مخلوق فرشتوں اور تدبیر عالم سے متعلق ان کی مفوضہ خدمات سے جن کو وہ بامر الٰہی انجام دیتے ہیں، مطلع کیا۔ جس کو تنزیلِ عزیز میں فرشتوں کی زبان

سے اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

وَمَا مِنَّا اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ — اور جو بھی ہم میں سے ہے اس کا ایک مقرر ٹھکانا ہے۔

اور اللہ پاک ان کی شان میں ارشاد فرماتے ہیں :

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ — جو اللہ نے حکم کیا اُس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو حکم دیا جاتا ہے۔

اسی طرح اجرام سماویہ اور سیارات اور اُن کی حرکات کے خواص و اثرات سے مطلع کیا۔ بروج اور کواکب کے جملہ احوال اور اُن سے متعلق انقلابات و تاثرات سے آگاہ کیا۔ علم نجوم، ریاضی و ہندسہ بلکہ تمام علوم و فنون اور صنائع و حرف سے اُن کو واقف بنایا، انسانی تمدن اور اصول معاشرت کی بنیاد ڈالی تاکہ اشرف المخلوقات اپنے خالق و پروردگار کی قدرت و عظمت سے واقف ہو کر سر نیاز اس کی بارگاہ ربوبیت میں خم کر دے اور اُس کے فرستادہ انبیاء و مرسلین کی لائی ہوئی شرائع اور احکام کی پیروی کر کے فلاح دارین حاصل کرے۔

اب اس کے بعد آپ صابئیت کے عقائد و اعمال اور روحانیات یعنی ملائکہ کے متعلق ان کے بیانات کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابئیت حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیمات کی مسخ شدہ صورت ہے اس عہد کے کسی شقی ازلی شخص یا گروہ نے اپنی اغراض و اہواء کی بنا پر یا شیطان کے اغوا اور فریب نفس سے نبوت او بعثت بشری کا انکار کیا اور دانستہ یا نادانستہ طور پر روحانیین یعنی ملائکہ کو قرب الٰہی اور قضاء حوائج کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا نظام عالم اور حیات انسانی کے ۔۔۔ ہیاکل سماویہ اور اجرام علویہ کو فاعل اور مؤثر حقیقی گردانا۔ ریاضت و مشق، تزکیہ و تجلیۂ نفس اور تشبہ بالروحانیات کے بعد انبیاء و مرسلین کے ساتھ مساوات بلکہ ترفع کا دعویٰ کیا۔ قضاء حوائج اور حصول مقاصد کے لیے ہیاکل سماویہ اور روحانیات کا دامن تھاما اور جبین نیاز خالق حقیقی کی جناب ربوبیت کے بجائے اُس کی ادنیٰ مخلوق کے

سلطنت ختم کردی اور وہی بدبخت انسان جو کل مسجودِ ملائک تھا اور ملائکہ اس کے خدام تھے۔ آج خود فرعون کے سامنے سجدہ ریز بن گیا۔ "احسن تقویم" کی بلند چوٹیوں سے "اسفل السافلین" کے تاریک گڑھے میں جا پڑا۔ یہ ہے صابئیت کی حقیقت اور اس کی ابتدائی نشأت کی تاریخ۔

صابئیت کا پہلا دور، طوفان نوح سے پہلے

طوفانِ نوح علیہ السلام سے پہلے کی تاریخ بالکل تاریکی میں ہے کیونکہ عہد حاضر میں اقوام عالم کی تاریخ کے ماخذ دو ہیں، ایک آثار قدیمہ و حفریات، یہ عملی ہے مگر طوفان سے پہلے کی تاریخ پیش کرنے سے بالکل عاجز و درماندہ چنانچہ اب تک حفریات اور آثار قدیمہ سے جو تاریخ مدون ہوئی ہے وہ صرف امم سامیہ تک پہنچتی ہے اور بس۔ دوسرا طریقہ علمی ہے اس سلسلہ میں عرب مورخین کے پاس قرآن کریم اور آثار صحیحہ کے بعد تاریخ عالم کا سب سے بڑا ماخذ تورات ہے، گو وہ صرف سامی سلسلہ کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ اہل فارس مدعی ہیں کہ ان کا سلسلۂ تاریخ نام بنام اور عہد بعہد بالکل محفوظ ہے، مگر مورخینِ عرب اس پر چنداں اعتبار نہیں کرتے اور پھر علماء علم الانساب کے بیانات میں اس قدر اختلافات ہوتے ہیں کہ کسی یقینی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کریم میں امم ماضیہ کے واقعات صرف اسی حد تک لیے گئے ہیں جہاں تک کہ بعثت انبیا اور ان کی دعوتِ حق کا تعلق ہے قرآن حکیم کا منشا موعظت و اعتبار ہے نہ کہ تاریخ اقوام و امم بیان کرنا۔

لہٰذا صابئیت کے اس دور کی تاریخ تفصیل سے تو نہیں بیان کی جا سکتی ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ صابئیت اس عہد میں حنیفیت یعنی نبوت و رسالت کے حریف مقابل کی حیثیت سے ضرور بر روئے کار آ چکی تھی۔

علماء اسلام اور مورخین کا اس پر اتفاق ہے اور آثار صحیحہ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آدم و نوح علیہما السلام کے درمیان صرف دو نبی گزرے ہیں، ایک شیث اور دوسرے ادریس

علیہما السلام۔ ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں موجود ہے اور ذریتِ آدم میں سب سے پہلے انہی کو نبیؐ کے لقب سے یاد کیا ہے، مگر گمراہ اقوام میں سب سے پہلے جس قوم کا ذکر کیا گیا ہے وہ قوم نوح ہے۔ قوم نوح اگر ایک طرف بت پرستی پر بشدت مُصر ہے:-

فَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا — اُنہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو مت چھوڑو۔ نہ ود کو چھوڑو نہ سواع کو نہ یغوث کو نہ یعوق کو اور نہ نسر کو۔

تو دوسری طرف بعثت بشری اور نبوت کی بھی اسی طرح منکر ہے:-

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ۔ — تو اُن کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا یہ تو تم ہی جیسا ایک انسان ہے (یہ نبی کیسے ہو سکتا ہے) یہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔ اگر اللہ پاک نبی بھیجنا چاہتا تو فرشتے بھیجتا۔ ہم نے تو ایسی بات اپنے آباواجداد میں سُنی نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی کے ساتھ ساتھ یہ قوم بعثت بشری اور رسالت کی منکر ہے۔ بجائے انسان کے ملائکہ کی رسالت جائز الوقوع سمجھتی ہے ولو شاء اللہ لانزل ملٰئکۃ صاف لفظوں میں بشر کے مقابلہ میں ملائکہ کی فضیلت اور اثبات کمال کا دعویٰ ہے اور صابئیت کا مدار بھی اثبات کمال فی الروحانیین اور انکار رسالت پر ہے باقی رہی کواکب پرستی اور بت پرستی تو یہ روحانیات کی عبادت پر مرتب شدہ ایک اثر ہے جو مرورِ ایام سے رونما ہوا، لہٰذا قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح جس کی ہدایت کے لیے حضرتِ نوح مبعوث ہوئے تھے وہ صابئی تھی، صرف صابئیت کا ایک جزو یعنی عبادت کواکب و سیارات قوم نوح کے کردار میں اس طرح نمایاں نظر نہیں آتا جس طرح قوم ابراہیم علیہ السلام کے عقائد و اعمال میں نمایاں ہے لیکن سورۂ نوح کی مذکورۂ ذیل آیات پر غور کیا جائے

أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ — کیا تم نے نہیں دیکھا؟ اللہ پاک نے کس طرح ساتوں آسمان تو تو پیدا

طباقاً، وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔ کیے اور اُن میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔

اجرام سماویہ اور مشہور ترین سیارات یعنی شمس و قمر جن کی حرکات و اوضاع کے ساتھ بیشتر نظام عالم منسلک و وابستہ ہے۔ ان کی تخلیق پر اللہ کا نبی خاص طور پر اس گمراہ قوم کو متوجہ کرتا ہے اور ان کے مخلوق اور قابلِ عبادت نہ ہونے پر متنبہ کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احترامِ سماوات و سیارات ابھی تک عبادت کی حد تک نہیں پہنچا تھا مگر اندیشہ تھا کہ کہیں مرورِ ایام کے بعد ایسا نہ ہو کہ یہ گمراہ قوم انبیاء و رسل کا دامن چھوڑ دے اور سیارات و ارواح کی پرستش شروع کر دے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

پھر مورخین قومِ نوح علیہ السلام کے متعلق ایک قول یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ وہ صابئی تھے[1]۔

ابن اثیر قومِ نوح علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"نوح علیہ السلام جس گمراہ قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اُس کے متعلق علماء مختلف ہیں:۔

۱۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک گمراہ قوم تھی جو طاعتِ الٰہیہ کو چھوڑ کر ارتکاب فواحش کفر و شرک اور انہماک فی الشہوات وغیرہ پر اصرار کرتی تھی۔

۲۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ قوم بیوراسپ (ضحاک) کی متبع تھی جس نے سب سے پہلے مذہب صابئیت کو پھیلایا اور اس کی طرف دعوت دی۔

۳۔ قرآن عزیز بتاتا ہے کہ وہ بت پرست تھی۔

ابن اثیر کہتے ہیں: میرے نزدیک اِن تینوں اقوال میں کچھ تعارض نہیں بلکہ بلا کسی قسم کے شک و شبہ کے حق یہ ہے کہ یہ لوگ بت پرست تھے۔ قرآنِ حکیم کے بیان کے مطابق بتوں کی پرستش

---

[1] دیکھو طبری جلد اول۔

کرتے تھے اور صابئہ کے ایک گروہ (اصحاب اشخاص) کا مذہب بھی بت پرستی ہے اس لیے کہ صابئہ کا اصل مذہب روحانیین کی عبادت ہے تاکہ وہ اُن کو اللہ پاک سے قریب کردیں وہ اقرار کرتے ہیں کہ عالم کا ایک پیدا کرنے والا ہے اور وہ حکیم وقادر ہے (ہر قسم کے نقائص وعیوب سے) پاک ہے مگر کہتے ہیں کہ ہمارے ذمہ صرف یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین کریں کہ اس کی معرفت جلال تک پہنچنے سے ہم عاجز ہیں اور ہمارے واسطے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اس خدا سے ان واسطوں کے ذریعہ سے قرب حاصل کریں جو ہمیں خدا تک پہنچانے والے ہیں اور وہ وسائط روحانیین ملائکہ ہیں اور چونکہ روحانیین آنکھوں سے نظر نہیں آتے تھے، اس لیے ان سے قرب ہیاکل یعنی سیارات سبعہ کے ذریعہ سے حاصل کیا کیونکہ یہ ہیاکل اُن کے نظریہ کے موافق اس عالم کے منتظم ومدبر ہیں۔ پھر ان میں سے ایک گروہ یعنی اصحاب اشخاص (بت پرستوں) نے جب دیکھا کہ ہیاکل کبھی طلوع ہوتے ہیں کبھی غروب، رات کو نظر آتے ہیں، دن کو نظر نہیں آتے تو انہوں نے ان ہیاکل کے موافق بت تجویز کیے، تاکہ وہ ہر وقت ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں اور اُن کے ذریعہ سے ہیاکل سے قرب حاصل کریں اور ہیاکل کے ذریعہ روحانیین سے اور روحانیین کے ذریعہ صانع عالم سے یہیں سے بت پرستی کی ابتداء ہوتی ہے۔ چنانچہ آج تک عرب کے بت پرست اپنی بت پرستی کی وجہ جواز یہی پیش کرتے ہیں۔"

امام رازی قوم نوح علیہ السلام کی بت پرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ابوزید بلخی کتاب الرد علی عبادۃ الاوثان" میں لکھتا ہے: بت پرستی دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت سے بہت پہلے سے بت پرستی موجود تھی اور اس وقت تک برابر اطراف عالم پر محیط ومسلط رہی ہے حالانکہ ایک لکڑی یا پتھر وغیرہ کے ٹکڑے کا خالق ارض وسما اور لائق ستائش ہونا،

ایک بدیہی چیز ہے اس لیے اس کے جواز کے لیے یقیناً ایسے وجوہ ہونے چاہئیں جو عقل کے نزدیک قابل قبول ہوں چنانچہ اس سلسلہ میں چند وجوہ پیش کیے گئے ہیں۔

۱۔ ابومعشر بلخی لکھتا ہے کہ بت پرستی نظریۂ تجسیم یعنی اِس عقیدہ سے پیدا ہوئی، کہ اللہ پاک جسم ہے اور مکان میں ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کے لوگ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نور ہے اور سب سے بڑا نور ہے اور جو فرشتے اس کے عرش کے چاروں طرف مصروف عبادت ہیں وہ اس کی بہ نسبت چھوٹے چھوٹے نور ہیں۔ لہٰذا اس عقیدہ کی بنیاد پر ایک سب سے بڑا بُت خدا کا اور بہت سے چھوٹے بڑے بُت ملائکہ مقربین کے اُنھوں نے بنائے اور اس اعتقاد کے ساتھ اُن کی پرستش شروع کردی کہ ہم خدا اور اس کے فرشتوں کی عبادت کر رہے ہیں۔ لہٰذا بت پرستی عقیدۂ تجسیم سے دنیا میں پیدا ہوئی ۔

۲۔ صابئہ کا گروہ عقیدہ رکھتا تھا کہ خدائے اعظم نے ان سیارہ اور غیر سیارہ کواکب کو پیدا کیا اور اس عالم سفلی کی تدبیر انہی کواکب کے سپرد کردی لہٰذا انسان ستاروں کے بندے ہیں اور ستارے خدائے اعظم کے۔ پس بندوں پر ان ستاروں کی عبادت واجب ہے۔ یہ ستارے کبھی نکلتے ہیں اور کبھی غروب ہوتے ہیں لہٰذا اُنھوں نے ان کی شکلوں پر بت بنوائے اور اُن کی عبادت شروع کردی۔ مگر ان کا اصلی مقصد ستاروں کی عبادت تھا۔

۳۔ زمانۂ قدیم میں لوگ منجم تھے، اصحاب احکام کی طرح ہر قسم کی سعادتوں اور نحوستوں کو سیارات کی جانب منسوب کرتے تھے۔ جب کبھی آسمان پر کوئی عجیب شکل کسی عجیب طلسم کے لائق ظاہر ہوتی اس پر طلسم بنالیتے اور اس سے عجیب و غریب قسم کے آثار ظاہر ہوتے۔ اس طلسم کی وہ ہمیشہ تعظیم و تکریم اور عبادت و پرستش کرتے تھے۔ ہر طلسم خاص ستارہ اور خاص برج کی شکل کے مطابق بناتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ وِدّ آدمی کی شکل

پر تھا اور سُواع کی شکل عورت کی تھی اور یغوث شیر کی اور یعوق گھوڑے کی اور نسر گدھ کی شکل پر بنا ہوا تھا۔"

بت پرستی کی ان تینوں وجوہ کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستی ایک نتیجہ ہے جو احوال ملائکہ کی معرفت، سیارات و اجرام علویہ اور اُن کی حرکات و تاثرات سے واقفیت اور علم نجوم سے آگاہی پر مرتب ہوا، اور یہ ظاہر ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت سے کئی سو سال پیشتر ادریس علیہ السلام دنیا کو ان تمام علوم حقہ سے آگاہ کر چکے تھے، لہٰذا بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم صابئیت کی متبع اور بت پرست تھی اور ان کی بت پرستی صابئیت کی رہینِ منت ہے۔

سحر و صابئیت کا سب سے پہلا داعی

تاریخ عالم میں ہمیں سحر و صابئیت کا سب سے پہلا داعی بیوراسپ نظر آتا ہے جس کو عرب ضحاک اور اہل فارس "دہ آک" اور "اژدہاق" بھی کہتے ہیں۔

مورخین عرب و عجم اور علماء علم الانساب اس پر متفق ہیں کہ سحر و صابئیت کو سب سے پہلے اسی ضحاک نے رائج کیا۔ طهمورث کی سلطنت کے پہلے ہی سال میں، جو سلاطین فُرس کے سلسلہ کا تیسرا بادشاہ تھا، اُس نے اس بدعت صابئیت کو پھیلانا شروع کیا۔

مسعودی ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے:-

"طهمورث کی سلطنت کے پہلے ہی سال میں ایک شخص پیدا ہوا جس کو ابوراسف کہتے ہیں اُس نے مذہب صابئہ ایجاد کیا اور دعویٰ کیا کہ شرف و مجد اور عظمت و جلال کے اعلیٰ مدارج اور حیات جاوید کا معدن یہ اونچی چھت یعنی بلند آسمان ہے اور کواکب ہی اس عالم کے مدبر اور نظم و نسق کا مرجع ہیں انہی کی حرکات اور اتصالات و انفصالات سے عالم سفلی کے تمام واقعات، عمروں کا کم و بیش ہونا بسائط عنصریہ کی ترکیب اور مرکبات کی تحلیل، صور اشیا کی تکمیل، دریاؤں کا نمودار ہونا اور خشک ہونا انہی سیارات و کواکب

کی حرکات فلکیہ اوران کے مختلف دوروں اور قرب و بعد، اتصال و انفصال سے ظہور میں آتے ہیں۔ اور کہتا ہے کہ عالم کی تدبیر اکمل صرف ان سیارات سے وابستہ ہے جو اپنے اپنے آسمانوں میں گردش کرتے ہیں۔ ناقص الرائے لوگوں کی ایک جماعت نے اس شخص کی پیروی کی۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ مذہب صابئیت کا سب سے پہلا منبع ہے۔"

طبری اور ابن اثیر کی تصریحات کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیوراسپ ہے جس کو عرب ضحاک اور ایرانی "دہ آک" اور اہل فارس "بیوراسپ" کہتے ہیں۔ ضحاک کے حالات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

ضحاک دنیا کا سب سے بڑا ظالم وجفا کار اور بے رحم انسان تھا مظالم کی کوئی نوع ایسی نہ تھی جو اُس نے خلق خدا پر روا نہ رکھی ہو۔ جادوگر تھا، جادو کے زور سے لوگوں کو مقہور کرکے جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ یہ خاندان سلطنت یعنی ہوشنگ و جمشید کی نسل سے نہ تھا بلکہ ایک ادنیٰ درجہ کا حاکم تھا جمشید پر اس نے خروج کیا اور اُس کو آرہ سے چیر کر ہلاک کر دیا اور خود تخت سلطنت پر قبضہ کر لیا اور اپنے ظلم وستم سے تمام دنیا پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، آخر پیمانۂ ظلم وستم لبریز ہو گیا اور فریدوں نے اُس کو گرفتار کرکے "دنباوند" نامی پہاڑ پر قید کر دیا۔ چنانچہ اہل فارس کا عقیدہ ہے کہ وہ اب تک جبال دنباوند میں مقید ہے اور لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتا ہے۔

ضحاک کی سلطنت کا زمانہ بہت دراز ہوا ہے نسابینِ فُرس کہتے ہیں ایک ہزار سال تک سلطنت کی۔ اقالیم سبعہ پر اس کی حکومت تھی۔

بیوراسپ یعنی ضحاک کس زمانہ میں تھا اس کی تعین بہت مشکل ہے۔

یہ ایک مُسلّم حقیقت ہے کہ کیومرث (جیومرث) اہلِ فارس کا جدِ اعلیٰ ہے اور اہل فارس کے

پاس کیومرث سے لے کر یزدجرد تک تمام سلاطین کی تاریخ نام بنام اور عہد بعہد مرتب اور منضبط موجود ہے ان کا دعویٰ ہے کہ کیومرث ہی آدم علیہ السلام ہیں بلکہ بعض نسابین فرس اس طرح تطبیق دیتے ہیں:-

ہوشنگ بن افراوال بن سیامک بن منشا بن کیومرث۔

مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم۔

ابن خلدون کے بیان کے موافق محققین مورخین اہل فارس کے اس بیان کی تردید کرتے ہیں بلکہ وہ اہل فارس کو سامی النسل قرار دیتے ہیں اور سام بن نوح کے کسی بیٹے ارفخشد یا لادو ذیا غیلم کی نسل سے بتلاتے ہیں اور بعض حضرات کی رائے ہے کہ کیومرث دراصل جامر بن یافث ہے۔

طبری کا رجحان خاطر اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس کی تاریخ کے متعلق نسابین فرس کے بیان پر اعتماد کیا جائے۔ ہر قوم اور ملک کی تاریخ کے متعلق اسی کے بیان پر اعتماد کرنا چاہیے چنانچہ وہ ہشام کلبی کے اس بیان کو پسند نہیں کرتے کہ "ہوشنگ" کا عہد سلطنت دراصل نوح علیہ السلام سے دو سو سال بعد تھا اہل فارس نے اس کو آدم کے دو سو سال بعد کر دیا" اور کہتے ہیں کہ ہوشنگ اہل فارس کے ہاں ایسا ہی مشہور ہے جیسا کہ اہل اسلام کے ہاں حجاج بن یوسف۔ لہٰذا انہی کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے، بہرحال ہم اس کا تصفیہ نہیں کرنا چاہتے کہ بیوراسپ کا زمانہ کونسا ہے، طوفان سے پہلے ہے، جیسا کہ ایک جماعت کی رائے ہے اور وہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کی قوم بیوراسپ کی تبع تھی یا طوفان کے بعد ہے، جیسا کہ دوسری جماعت کی رائے ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بیوراسپ ہی ابراہیم علیہ السلام کا نمرود ہے یا نمرود بیوراسپ کا ماتحت عراق کا بادشاہ ہے ہمارا مطمح نظر صرف یہ ہے کہ صابئیت کا داعیٔ اول ہیں۔ اہل فارس کی تاریخ میں بیوراسپ ملتا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص تاریخ عرب و عجم میں ایسا نہیں جس کی جانب اختراع و دعوت صابئیت کی نسبت کی گئی ہو۔

اسی طرح تاریخ عالم میں صابئیت کی پیرو سب سے پہلی قوم قومِ نوح ہے۔ لہذا اگر بیوراسپ کا زمانہ قبل الطوفان ہے تو صابئیت کے دورِ اول میں اس کو مخترع اور موجد کا مقام حاصل ہے۔ اور اگر بعد الطوفان ہے تو دورِ ثانی میں اس کو صابئیت کی حمایت واشاعت کا رتبہ حاصل ہے۔

صابئین کے اس دورِ اول کی تاریخ ہم فیلسوف تاریخ علامہ ابن خلدون کے بیان پر ختم کرتے ہیں۔

"مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ تک آدم علیہ السلام کی اولاد سطح روئے زمین نسلاً بعد نسلٍ آباد رہا شیث اور ادریس وغیرہ انبیاء بھی ان میں مبعوث ہوئے بہت سے بادشاہ بھی ان میں پیدا ہوئے۔

کلدانیین وسریانیین وغیرہ مذہب کے نام سے مشہور قومیں بھی پیدا ہوئیں (کلدانیین کے معنی ہیں موحدین اور سریانیین کے معنی ہیں مشرکین)

اور یہ مورخین مدعی ہیں کہ صابئی اقوام بھی ان ہی میں سے ہیں۔ یہ صابئی ہیں ملک بن اخنوخ کی نسل سے ہیں۔ سیارات وکواکب کی عبادت اور اُن کی روحانیات کی تسخیر پر ان کے مذہب کا انحصار ہے۔ اور کلدانیین یعنی موحدین بھی انہی صابئین میں سے ہیں۔

مشہور کاتب ابو اسحاق صابی نے صابئین کے نسب اور مذہب کے متعلق ایک مقالہ لکھا ہے۔ سریانیین کے مورخ داہر نے اور بابا صابی حرانی نے بھی ان کے حالات بیان کیے ہیں اور صابئیت کی ہمہ گیری اور روئے زمین پر صابئین کے تسلط کی تفصیلات نیز اُن کے مذہبی آئین ورسوم مفصل بیان کیے ہیں۔ اور یہ کہ یہ قومیں دنیا سے مٹ چکیں اور اُن کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔"[1]

[1] کتاب العبر۔ جلد ثانی

مسلمانوں کے تعلقات غیر قوموں کے ساتھ

قرونِ اولیٰ میں

(۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی زندگی کے تیرہ برس مکہ میں بسر کیے اور دس برس مدینہ طیبہ میں۔ آپ نے جتنے بھی غزوات کیے وہ سب ان اخیر کے دہ سالہ کارناموں کا ہی دلآویز مرقع ہیں۔ عرب میں مشرکوں اور یہودیوں کی طاقت اس قدر مضبوط اور پھیلی ہوئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدنی زندگی کے ان دس سالوں میں کہیں باہر جانے کی فرصت ہی نہیں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات تک اسلام کا دائرہ جزیرۃ العرب تک محدود رہا۔ آپ نے عرب سے باہر مختلف حکومتوں کے ساتھ نامہ و پیام کی سلسلہ جنبانی ضرور کی اور اُن کو دعوتِ اسلام بھی بھیجی لیکن اسلامی فتوحات کے قدم جزیرۂ عرب سے باہر نہ پہنچ سکے۔

آپ کی وفات کے بعد اسلام کا دائرۂ عمل واقتدار اور زیادہ وسیع ہونا شروع ہوا۔ اور مسلسل فتوحات نے مسلمانوں کو غیر قوموں کے ساتھ اختلاط وارتباط کا موقع بہم پہنچایا۔ عراق فتح ہوا تو وہاں ربیعہ و مضر کے کچھ عربی قبیلے آباد تھے۔ اور اصلی باشندگانِ ملک کے ماسوا کچھ ایرانی لوگ بھی رہتے تھے۔ جن میں سے بعض مذہباً عیسائی تھے اور بعض مزدکی تھے اور بعض زردشت کے پیرو تھے۔ یہیں عراق میں عربوں نے کوفہ و بصرہ دو شہر بسائے[۱]۔ عراق کی فتوحات

[۱] تفصیل کے لیے دیکھو فتوح البلدان بلاذری باب تمصیر الکوفہ و تمصیر البصرہ۔

ئے سلسلہ میں جب حضرت عمر نے دیکھا کہ مدائن اور قادسیہ کی آب وہوا عربوں کے مزاج کوموافق نہیں ہے، تو آپ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کو اپنی سکونت کے لیے ایک ایسے مقام پر شہر آباد کرنے چاہئیں جو خشکی یا تری کے ذریعہ جزیرۃ العرب سے بالکل جُدا نہ ہو... آپ کے اس حکم کی تعمیل میں ۱۵ھ میں بصرہ اور ۱۷ھ میں کوفہ کی تعمیر وقوع میں آئی۔

ایران فتح ہوا تو یہاں ایرانی آباد تھے۔ اور کچھ یہودی اور کچھ رومی بھی جو ایران وروم کی جنگ میں گرفتار ہو کر آئے تھے یہاں رہتے تھے۔

پھر جب مسلمانوں کے قدم شام میں پہنچے تو اُن کو یہاں متعدد قدیم تہذیبوں اور تمدنوں کی یادگاریں ملیں شام میں "فینیقی" اور "کنعانی" تہذیب وتمدن کا دور دورہ رہ چکا تھا۔ اور مصریونان روم اور غسانی عرب کے بادشاہ اس پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ آخر میں یہ روم کی حکومت کے زیرنگین تھا اور یہاں کے باشندے مذہبًا عیسائی تھے۔

مسلمانوں نے جب شام کو فتح کیا تو اس وقت یہاں کے شہروں میں اصل باشندگان ملک کے سوا جو سوری کہلاتے تھے ارمنی، یہودی، اور کچھ رومی بھی آباد تھے۔ ان کے علاوہ چند عربی قبائل بھی حصہ جنوبی میں زیادہ اور شمالی گوشہ میں کم بستے تھے جس میں سے بعض مشہور قبائل کے نام یہ ہیں: غسان، لخم، جذام، کلب، قضاعہ اور تغلب۔ یہ قبائل کہنے کو عرب تھے لیکن جو زبان بولتے تھے وہ عربی اور آرامی کی معجون مرکب تھی۔ ان کے اور عرب حجاز کے درمیان صرف تجارتی تعلقات قائم تھے ورنہ قومی اعتبار سے یہ لوگ اپنے آپ کو شامی ہی سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں اور رومیوں میں جنگ ہوئی تو اُنھوں نے مسلمانوں کے برخلاف ہمیشہ رومیوں کی حمایت واعانت کی[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مادۂ شام۔

مصر فتح ہوا تو یہ بھی ایک قدیم تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہ چکا تھا، جہاں قدیم مصریوں یونانیوں اور رومیوں کی یادگاریں باقی تھیں۔ مصر کی قدیم تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دورِ جاہلیت اس کے آغاز کا پتہ نہیں ۵۰۰۰ قبل مسیح پر منتہی ہوتا ہے۔ دورِ خاندانِ مصری ۵۰۰۰ ق م سے شروع ہوکر ۳۳۲ ق م پر تمام ہوجاتا ہے۔ تیسرا دور ۳۳۲ ق م سے شروع ہوکر تیس سال قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد مصر کے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے جس کی مدت تیس سال قبل مسیح سے مسلمانوں کے تسلّط و استیلا یعنی ۶۴۰ء تک ممتد ہے۔

اِن فتوحات سے فارغ ہوکر مسلمانوں نے مغرب کی طرف توجہ کی اِس سلسلہ میں ٹیونس، الجزائر، مراکش، سے لے کر جبل الطارق (جبرالٹر) تک تمام شہروں کو فتح کرڈالا۔

ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ، بخارا، خوارزم، سمرقند اور کاشغر فتح ہوئے۔

ان مختلف ممالک کی فتوحات ہی مسلمانوں اور غیر قوموں میں اختلاط وارتباط کی بنیاد ہیں مسلمانوں نے جس کسی ملک کو فتح کیا وہاں کی مفتوحہ قوم کے ساتھ گھل مل کے رہے۔ اُن کو اپنے تہذیب و تمدن کی دولت سے مالا مال کیا۔ اور خود مفتوحہ اقوام میں جو محاسن پائے جاتے تھے خُذ ما صفا ودع ما کدر کے مطابق اُن کو قبول کیا۔

اس اختلاط کے اصل اسباب تین ہیں۔

(۱) فتح ممالک کے وقت تعلیمات اسلام۔

(۲) بلادِ مفتوحہ کا کثرت سے مسلمان ہوجانا۔

(۳) عرب اور غیر عرب میں رہائشی تعلقات۔

ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق مختصراً کچھ لکھتے ہیں۔

فتح کے وقت اسلامی تعلیمات اسلامی تعلیمات کی رو سے جب مسلمان کسی شہر کو فتح کرنے کا ارادہ کریں تو

اُن پر ضروری ہے کہ وہاں کے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیں وہ اُس کو قبول
کرلیں تو پھر مسلمانوں میں اور اُن میں کوئی فرق نہیں ہوگا لیکن اگر وہ اس دعوت پر لبیک نہ کہیں
تو پھر اُن سے مطالبہ کیا جائے کہ جزیہ[1] ادا کریں اور ذمی ہو کر رہیں۔ اس صورت میں یہ لوگ اپنے مذہب
پر باقی رہینگے۔ ان کی جانیں، مال اور عزت و آبرو بالکل مسلمانوں کی جانوں اور مالوں کی طرح
محفوظ ہونگی۔

اگر وہ ان دونوں میں سے کسی ایک صورت کو بھی اختیار نہ کریں تو پھر مسلمانوں کو اجازت
ہے کہ اُن سے جنگ کریں۔ مگر اُس کے لیے خاص خاص شرائط و قواعد ہیں جن کا پابند رہنا
ضروری ہے، جنگ کے اختتام پر جو لوگ گرفتار ہو کر آئینگے اُن کے لیے قرآن مجید میں صاف حکم ہے۔
فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً ان کو یا تو احسان کرکے چھوڑ دو یا کسی فدیہ کے بدلے میں رہا کردو۔

لیکن عرب اور دوسرے ممالک میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنا لینے کا دستور قدیم
زمانہ سے تھا۔ اِس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض وقتی مصالح کے پیش نظر اس رواج
کو یک قلم موقوف نہیں کیا، بلکہ اُس میں چند در چند مفید اور موثر اصلاحیں کردیں۔

عام طور سے غلاموں اور باندیوں سے ناروا سلوک کیا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا "یہ تمہارے بھائی ہیں، ان کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، اور وہی پہناؤ جو تم
خود پہنتے ہو"[2]۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکوں کے لوگ جو جنگ میں گرفتار ہو کر آتے تھے اور غلام بنا
لیے جاتے تھے، مرد اور عورت مسلمانوں کی گھریلو زندگی میں دخیل ہوگئے۔ اور فیملی ممبر کی حیثیت سے

---

[1] جزیہ ایک ٹیکس ہے جو فی کس وصول کیا جاتا ہے، اور وہ بھی عورتوں اور بچوں سے نہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں مالدار، متوسط اور غریب ان تین طبقات کے اعتبار سے تین ٹیکس تھے۔ امیروں سے ۴۸ درہم (تقریباً بارہ روپے) متوسط لوگوں سے ۲۴ درہم (تقریباً چھ روپے) اور غریبوں سے ۱۲ درہم (تقریباً تین روپے) سالانہ لیے جاتے تھے (دیکھو فتوح البلدان بلاذری)

[2] غلامی کے مسئلہ کی پوری وضاحت ہم نے اپنی کتاب "الرِّق فی الاسلام" میں کی ہے جو ندوۃ المصنفین کی جانب سے عنقریب شائع ہوگی۔

اُن کے ساتھ رہنے سہنے لگے۔ پھر جتنی جتنی مسلمانوں کی فتوحات بڑھتی گئیں غلاموں اور باندیوں کی کثرت میں بھی اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ مسعودی کا بیان ہے کہ زبیر بن عوام کے پاس ایک ہزار غلام اور ایک ہزار باندیاں تھیں۔

اس سے زیادہ عجیب وہ روایت ہے جو ابن عبد ربہ نے العقد الفرید میں نقل کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت معاویہ نے رومی اور ایرانی غلاموں کی کثرت دیکھی تو فرمایا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ رومی اور ایرانی غلام بڑھتے جاتے ہیں، اور مجھ کو خوف ہے کہ کہیں کسی روز موقعہ پاکر یہ سب کے سب اہلِ عرب پر حملہ نہ کر بیٹھیں اور اُن پر اقتدار حاصل نہ کرلیں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان میں سے بعض لوگوں کو قتل کردوں اور بعض کو زندہ چھوڑ دوں تاکہ وہ بازاروں میں کام کریں یا راستے بنانے کی خدمت انجام دیں"[1]۔

حضرت معاویہ نے اپنے اس خیال پر عمل نہیں کیا، اور پھر بعد میں اس سے منحرف ہوگئے۔ اس روایت کی صحت کے متعلق کوئی وثوق ظاہر نہیں کیا جاسکتا لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ کے زمانہ میں ہی روم اور ایران کے لوگ کثرت سے عرب میں آبسے تھے۔ اور اُسی زمانہ سے مسلمانوں اور غیر قوموں میں اختلاط پیدا ہوگیا تھا۔

ولاء غلاموں اور باندیوں کو اپنے آقاؤں کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہوجاتا تھا جو اُن کے آزاد ہونے کے بعد بھی باقی رہتا تھا۔ اس تعلق کو شریعت کی زبان میں "ولاء" کے نام سے پکارا گیا ہے اس تعلق کا حاصل صرف یہ تھا کہ آزاد کردہ غلام اپنے آقا کے خاندان میں شمار کیا جائیگا جیسا کہ بخاری میں فرمایا گیا ہے :۔

مولی القوم من انفسھم — کسی قوم کا غلام اُنہی میں سے سمجھا جائیگا۔

---

[1] العقد الفرید جزء ۲ ص ۹۰۔

اور غلام کے مرنے کے بعد اُس کا جو ترکہ ہوگا آقا بھی اُس میں شریک ہوگا۔ اسی تعلق کی بناء پر غلام آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آقا کے خاندان کے ساتھ ربط ضبط رکھتا تھا۔ اور دونوں میں ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے کے تعلقات قائم رہتے تھے۔

بلادِ مفتوحہ کا مسلمان ہوجانا | دوسرا سبب بلادِ مفتوحہ کا مسلمان ہوجانا ہے۔ مسلمان جہاں کہیں گئے اُن کے دینِ قیم کی فطری کشش اور اُن کے اخلاق و شمائل کی جاذبیت نے غیر قوموں کو بھی اُن کا ہم مذہب بنا دیا۔

جنگ ایران میں شاہ ایران کے چار ہزار غلام اور خواص تھے جو ہر وقت اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ قادسیہ میں ان لوگوں نے رستم کے ساتھ شریک ہوکر مسلمانوں سے زبردست جنگ کی تھی لیکن جب پرویز قتل کردیا گیا۔ اور آتش پرست شکست کھاگئے، تو ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ ہمارے حالات مجوسیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اور ہمارے لیے کوئی جائے پناہ بھی نہیں ہے اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کے مذہب کو قبول کرلیں اور اس طرح عزت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔

یہ رائے قائم کرنے کے بعد یہ سب مجوسیوں کی صف سے الگ ہوگئے حضرت مغیرہ بن شعبہ نے با ایما حضرت سعد بن وقاص ان لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے آپ کو اصل معاملہ کی خبر دی اور کہا کہ ہم سب آپ کے دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں حضرت سعد کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے سب کو امن دیا۔ اور یہ سب لوگ مسلمان ہوگئے۔ اور ایسے پختہ کار ثابت ہوئے کہ حضرت سعد کی زیر قیادت جنگ مدائن میں شریک ہوئے۔ اور جلولاء کی لڑائی میں بھی شریک ہوکر انہوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ اس سے فارغ ہوکر کوفہ واپس آگئے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے لگے[1]۔ تاریخ میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، البتہ

[1] فتوح البلدان بلاذری، ص ۲۸۰۔

لوگوں کے قبولِ اسلام کی وجوہ مختلف تھیں۔ ان میں اکثر و بیشتر تو وہ تھے جو اسلام کی حقانیت و صداقت پر دل و جان سے ایمان لے آئے تھے۔ اور اُس کو حیاتِ ابدی کا حقیقی ذریعہ سمجھتے تھے اور کچھ وہ بھی تھے جو یہ سمجھ کر مسلمان ہوتے تھے کہ اس طرح وہ اسلام کی تیغِ کفر شکن کی زد سے محفوظ و مامون رہ سکتے اور امن و عافیت کی زندگی گزار سکتے ہیں، اور کچھ وہ تھے جو مسلمان ہو کر دنیوی اعزاز و منصب حاصل کرنا چاہتے تھے۔

غرض یہ ہے کہ لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ عہدِ بنی اُمیہ میں ایسے افراد بہت کم رہ گئے جن پر غیر مسلم ہونے کی وجہ سے جزیہ ادا کرنا ضروری ہو۔ حجاج بن یوسف کے عُمّال کو خیال ہوا کہ بہتیرے لوگ جزیہ سے ڈر کر مسلمان ہو رہے ہیں۔ اُنھوں نے حجّاج کو شکایۃً لکھا کہ "خراج کم ہو گیا ہے، اور جو ذمی تھے وہ مسلمان ہو گئے ہیں اور شہروں میں جا بسے ہیں"۔ حجاج نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ایسے لوگوں سے مسلمان ہونے کے باوجود جزیہ وصول کیا جائے۔ بصرہ کے علماء نے حجاج کی اس درشتی اور سخت گیری کو دیکھا تو رو پڑے۔ اور اُنھوں نے اس طرح کے جابرانہ حکم پر سخت بیزاری کا اظہار کیا۔[۹]

ایک ساتھ رہنا سہنا مسلمانوں اور غیر قوموں میں اختلاط کا تیسرا سبب ایک ہی جگہ رہنا سہنا تھا۔ مسلمان جہاں کہیں گئے تھوڑے بہت وہاں آباد بھی ہو گئے اور عراق کے بعض شہر تو ایسے ہیں جن کو عربوں نے اپنا دائمی وطن اور مسکن بنا لیا۔ اگرچہ ان کا داخلہ بحیثیت ایک فاتح کے ہوتا تھا لیکن معاشرتی معاملات میں اُنھوں نے دوسری قوم کے لوگوں کے ساتھ کبھی تفوق اور برتری کا معاملہ نہیں برتا۔ بلکہ بھائی بندوں اور اپنے ہی کنبہ قبیلہ کے لوگوں کی طرح آپس میں گھل مل کے رہتے تھے اور اجتماعی اور اقتصادی امور میں ایک دوسرے کے برابر کے شریک تھے۔ عراق میں عربوں

[۹] ابن الاثیر جزو ۴ ص ۱۷۹

نے کوفہ کو آباد کیا تو اُس کی آبادی کا یہ حال تھا کہ مسٹر ولھوسن (Wellhausen) کے قول کے مطابق نصف آبادی فاتح عربوں پر مشتمل تھی اور نصف اہلِ عجم پر جن کو عرب اپنی اصطلاح میں موالی کہتے تھے۔ یہ لوگ یہاں طرح طرح کی صنعت و حرفت کے کام کرتے تھے اور اس کے علاوہ تجارتی کاروبار میں بھی زیادہ تر انہی کا دخل ہے۔ یہ لوگ جنگ میں اسیر کرکے کوفہ لائے گئے تھے اور اسلام لے آئے تھے۔ ان کے مالکوں نے انہیں آزاد کر دیا۔ اور اب یہ بحیثیت موالی کے یہاں رہنے سہنے لگے۔

کوفہ کی طرح اور شہروں کا بھی حال یہی ہوا۔ فارس، شام، مصر اور مغرب۔ ان میں سے ہر جگہ عرب غیر قوموں کے ساتھ اختلاط رکھتے تھے، یہاں تک کہ خود جزیرۃ العرب جزیرۂ عرب نہیں رہا۔ مدینہ طیبہ جو خلافتِ راشدہ کا دار الخلافت تھا، غیر قوموں کی آمد و رفت کی وجہ سے عربوں اور عجمیوں کا مرکزِ اجتماع تھا۔ حضرتِ عمر کے عہد میں یہاں مختلف ملکوں کے سفراء اور دوسرے اربابِ حاجت و ضرورت آتے تھے۔ اور پھر ان کے علاوہ جو غیر مسلم جنگوں میں گرفتار ہوتے تھے اُن کی نسبت حضرتِ عمرؓ کا حکم تھا کہ مدینہ سے باہر اُن کے ساتھ کوئی معاملہ نہ کیا جائے چنانچہ تمام اموالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ مدینہ لے جائے جاتے تھے۔ اور یہاں حضرتِ عمرؓ کے حکم کے مطابق اُن کے ساتھ مختلف قسم کے معاملے کیے جاتے تھے۔ مدینہ میں عجمیوں کا کثرت سے آنا جانا، یہاں اُن کی مستقل بود و ماند، عربوں کے ساتھ اُن کا اختلاط، یہ سب وہ ابتدائی اسباب ہیں جن کو حضرتِ عمرؓ کی شہادت میں دخل ہے۔ ورنہ حضرت عمر ایسے جلیل القدر اور بارعب خلیفۂ وقت کو خود اُس کے دار الخلافت میں شہید کرنے کی جرأت ایک فارسی النسل غلام ابو لولو کو کس طرح ہوسکتی تھی۔

الغرض یہ وہ تین اسباب ہیں جن کے باعث ابتداءِ اسلام میں مسلمان عربوں کو غیر قوموں

کے ساتھ ملنے جلنے اور اختلاط کرنے کا موقعہ ملا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس امتزاج سے مسلمانوں نے دوسری قوموں میں تہذیب وتمدن، معاشرت اور طریق معیشت میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا کیں اور خود اُنھوں نے غیر قوموں کے اثرات کہاں تک قبول کیے۔ غیر قوموں سے معاشرت کے بعد اُن کے رجحانات طبع میں کتنا تغیر پیدا ہوا۔ اور یہی بحث دراصل اس مضمون کا مقصد ہے لیکن اس سے قبل ہم کو یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے مسلمانوں کو غیر قوموں کے ساتھ کس حد تک مختلط ہونا چاہیے، اور غیر قوموں کی تہذیب وتمدن سے کن کن چیزوں کو لیا جا سکتا ہے۔

علمی روزنامچہ

از مولانا حکیم سید ابوالنظر رضوی

مولانا حکیم سید ابوالنظر صاحب رضوی امروہی اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کے علم کو ذاتی دولت و ثروت کے باعث کسی مدرسہ کے مہتمم یا کسی انجمن کے سکریٹری کے سامنے باج ملازمت ادا کرنا نہیں پڑتا۔ آپ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور امروہہ کے رئیس کبیر بھی۔ آپ نے دیوبند سے صرف سند فراغ حاصل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ اب بھی برابر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے ذوق علم وادب کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ مختلف مباحث پر کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت جو خیالات اور تاثرات آپ کے دماغ میں پیدا ہوئے آپ اُنہیں ناتمام مضامین کی صورت میں ایک جگہ لکھتے رہے یہاں تک کہ اُن سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب تیار ہوگئی جس کو آپ "علمی روزنامچہ" قرار دیتے ہیں۔ آپ نے از راہ کرم برہان کے لیے اُس کے جستہ جستہ اقتباسات دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آج ہم موصوف کے شکریہ کے ساتھ علمی روزنامچہ کی پہلی قسط شائع کرتے ہیں۔

اس طرح کے ناتمام مضامین میں بعض ایسی کام کی باتیں مل جاتی ہیں جو ایک عرصہ تک ورق گردانی کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوتیں اور پھر موصوف ہندوستان کے خوش فکر ادیب، بلند خیال شاعر، اور عربی و فارسی کے فاضل ہیں ہمیں توقع ہے کہ برہان کے ناظرین اس سلسلہ کو پسند کریں گے اور ان مضامین کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں گے۔

۱۴ - دسمبر ۱۹۳۶ء

موسیقی اور روحانیت

علماء اسلام، متصوفین کے اس نظریہ کو غلط اور ناقابلِ تسلیم خیال کرتے ہیں کہ شعر و موسیقی کو استعداد روحانی کے بیدار کر سکنے سے ایک غیر محسوس سماوی ارتباط ہے اور اس بنا پر اسے نماز و روزہ یا دیگر اعمالِ روحانی کی اہمیت دی جا سکتی ہے، چنانچہ صوفیہ کی ایک کثیر جماعت نے جہاد و تبلیغ کے بجائے شعر و موسیقی ہی کو اختیار کر لیا کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ روحانیت کو بیدار کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی۔

شیخ اکبرؒ نے فتوحاتِ مکیہ میں شعر کو ایک مخصوص حضرتِ الٰہیہ کا فیضان ظاہر کر کے اور امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں موسیقی کا روح سے غیر محسوس اور ناقابلِ فہم ارتباط بتا کر اس نظریہ کا سنگِ بنیاد رکھا کہ "شعر و موسیقی روحانیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے" اور بعد میں آنے والے صوفیہ نے اُس پر ایک عظیم الشان قصر تعمیر کر دیا حالانکہ اسلام نے ہرگز اس کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ اُس نے شعراء کو ایک ایسی جماعت میں شمار کیا تھا جس کا نہ کوئی نظریۂ حیات ہے، نہ کوئی دائرۂ عمل۔ علیٰ ہذا موسیقی کو بھی "مزامیرِ شیطان" سے ہی تعبیر کیا گیا یعنی موسیقی کے نغمے شہوانی جذبات کو بیدار کرنے کی بنا پر مادۂ حیوانیت اور غیر روحانی ریکارڈ کی سوئی تو کہلا سکتے ہیں لیکن حقائقِ روحانیہ کے اکتشافات کر سکنے والی استعداد کو موسیقی سے منسوب کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حُسنِ سیم پارہ سے محبت رکھنے والے شعر و موسیقی کے محرکات سے اثر پذیر ہو کر وجد و رقص اور حال و قال کی اُس ہی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں صوفیہ کو دیکھا جاتا ہے۔ اگر موسیقی کو جذباتِ انسانی کے بجائے تجلیاتِ روحانیہ سے مناسبت ہوتی تو عام حیوانی فطرت کو اُس سے کوئی مناسبت نہیں ہو سکتی تھی۔ باہمی ارتباط کسی ایسی مشابہت کے توسط سے ہی ہو سکتا ہے جو دونوں کی فطرت کا مشترک جزء ہو۔ کیا یہ ہو سکتا

ہے کہ روحانی اور مادی دونوں قسم کے حقائق سے موسیقی کو ایسی مشاکلت ہو جو دونوں کی باہم دگر متضاد یا متغائر حقیقت کا ایک جز ہوسکے؟ اگر ایسا ہے تو پھر مادیت اور حیوانیت بلکہ سادہ اور سلیس تعبیر میں شہوت پرستی کو بھی خدا پرستی سے ایک خاص مناسبت ہوسکتی ہے اور اگر نہیں ہوسکتی تو مجھے بتایا جائے کہ شہوت کے محرکات کو روحانیت کے موثرات میں کیونکر شامل کیا جاسکتا ہے۔ اگر صوفیہ کا نظریہ درست ہوتا تو موسیقی ہر مادی تمدن کے ارتقاء کا ایک جزو نہ ہوتی۔ کیا کوئی ایسا مادی تمدن گذرا ہے جس نے موسیقی کے تار پر رقص کرنے کو زیادہ سے زیادہ اہمیت نہ دی ہو؟ کیا مغربی تمدن کی موسیقی سے لبریز فضا میں روحانیت کی ایک جھلک بھی پیدا ہوسکی؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تمدن کا سیلاب بڑھتے بڑھتے جب روم، ایران اور ہندوستان کی مدنیت سے ٹکرا کر ایک حد تک اُس کے اثرات اپنے رگ و پے میں جذب کرنے لگا تو غیر اسلامی مدنیت کی دیگر خصوصیات کے ساتھ اُس نے موسیقی کی ایک اہم خصوصیت کو بھی جذب کرلیا۔ صوفیہ جو عرب کی ریگ و سنگ والی دنیا سے دور، تر اور عجم کی سرسبز و یکسر نغمہ وادیوں، جذبات میں ارتعاش پیدا کرنے والے آبشاروں اور بادِ سموم کی جگہ نسیم صبحی کے نشہ آور جھونکوں میں گم ہوتے جارہے تھے اُس مدنیت کی گود میں گداز حیات کی لذت حاصل کرنے لگے جو قدرت نے اُن کو سپرد کی تھی ترنم خیز فضا میں موسیقی کے ترنم سے محروم رہنا گناہ محسوس ہوا اور اُنہوں نے بجائے اپنے ربطِ حیات کے گونا گوناگوں نغمات سے کائنات کو بھر دینے کے اپنی بے کیف روح کو کائناتی نغمات سے تازہ کرنے کا سبق حاصل کرلیا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے بعض صوفیہ کا جن کے دل و دماغ میں بچپن سے ہی موسیقی اور روحانیت کے غیرفانی ربط و تعلق کے نظریات جذب تھے، اپنے پاکیزہ جذبات موسیقی سے اثر پذیر ہوتے ہوئے دیکھ کر یقین قوی تر ہوگیا کہ ضرور "بزرگوں" نے موسیقی کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اُس کا فلسفہ ہی دوسرا تھا۔ انسانی جذبات جب کسی محرک سے متاثر

ہو کر اُبھرتے، پھیلتے اور نکھرتے ہیں تو شہوانیت کا ساحل نہ پاکر روحانیت کی لہروں سے ٹکرانے اور اُن کو بھی بیدار کر دیتے ہیں لیکن یہ بیداری موسیقی کے بالذات روحانیت سے قریب تر ہونے کی دلیل میں نہیں پیش کی جاسکتی۔ انسان کی شہوانی قوتوں کے لیے اگر کوئی مادی مطمع نظر نہ رہے تو ہمیشہ وہ اپنے آپ کو روحانیت کے سپرد کر دینا چاہتی ہیں آپ کتنے ہی دہریہ کیوں نہ ہوں اگر سرمادی طاقت آپ کی مدد کرنے سے انکار کردے تو آپ کو یقیناً خدا یاد آئیگا۔ اگر آپ اپنے شہوانی جذبہ کو کسی طرح پورا نہ کرسکتے ہوں تو یقیناً نماز پڑھنے کو طبیعت چاہنے لگیگی۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہو گئے کہ شہوانیت بھی روحانیت کا زینہ ہے؟ اس میں شک نہیں کہ وہ تمام قدیم مذاہب جو ارتقاءِ روحانی کی تکمیل سے کسی نہ کسی حد تک محروم تھے اور جن کے علم میں وہ روحانی وسائل اور حقیقی ذرائع نہ تھے جو بلاواسطہ خدا تک پہنچا سکیں۔ اُنہوں نے موسیقی کی اجازت دیدی اور اس حد تک اُن کی مجبوریوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے، لیکن اسلام جو مکمل قانون کی روشنی میں دنیا کے لیے زندگی کی شاہراہ تیار کر رہا ہے ایسے تاریک، پُرخطر اور غیر یقینی راستہ کے انتخاب کو گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ جس کو موسیقی سے روحانیت حاصل کرلینا کہتے ہیں، موسیقی کے ترنم سے اُس بے کیف روح کو غذا حاصل کرنے کی ضرورت ہوسکتی ہے جو روحانی لذت سے محروم ہو لیکن جس کی روح "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے نغمے سے ہر لمحہ مست و بیخود ہو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اُسے کیونکر موسیقی کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے۔ محتاط صوفیہ کا قول ہے کہ ارتقائی مراحل سے گذر جانے والے صوفی ہی کو موسیقی سے لذت اندوز ہونا چاہیے خاص حالات میں کسی چیز کا صرف جواز اُس کے محاسن پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ موسیقی اگر کسی پاکباز انسان کے لیے جائز ہو تو کیا بہتر بھی ہوسکتی ہے؟ جس شخص کو مذہب نے بہتر حقائق سے روشناس کر دیا ہو اُس کا صرف جائز امور پر ہی توجہ مبذول رکھنا نہ معلوم کس حد تک بدقسمت ہونے کا ثبوت کہلایا جائیگا۔ مادی نغمات سے روح میں وجد و بیخودی جذب کرنے کی سعی روحانیت کے بلند طبقات

ست کوئی نسبت نہیں رکھتی روحانیت تو اپنے ابدی نغموں سے کائنات کو بھر دینا چاہتی ہے نہ کہ خود اُس کے سایہ میں طمانیت وسکون کی تلاش کرنا۔

یہاں اُس ہندو قوم کے ایک فلاسفر کا نظریہ نقل کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس کے مذہب کا دارومدار ہی زیادہ تر موسیقی پر ہے۔ اربندو گھوش نے حال ہی میں ایک مضمون "فنونِ لطیفہ اور روحانیت" کے عنوان سے لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ "فن شاعری اور موسیقی کو روحانیت (یوگ) سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، روحانیت سے ان کا تعلق اسی قدر ہے جس قدر کہ فلسفہ یا سائنس کا، یعنی ان میں سے کسی کو بھی بذات خود اُس کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس امر میں جدید ذہنیت کی ایک عجیب صلاحیت دیکھنے میں آتی ہے یعنی روح کو ذہن سے امتیاز کرنے کی نااہلیت اور ذہنی اخلاقی اور جمالیاتی مطمح پرستیوں کو روحانیت سے منسوب کرنا اور اُن کے کمتر درجات کو روحانی قدر وقیمت دینا حالانکہ یہ محض ایک صداقت ہوتی ہے نہ کہ الہام"

یہ اُس قوم کے فلاسفر کا قول ہے جس کے ہاں عبادت وموسیقی مترادفات میں شامل ہیں، جہاں "توجہ الی اللہ" قائم کرنے اور غیر اللہ کا تصور دور کرنے کے لیے سنکھ کی گونج گھنٹی کا شور اور بربط وعود کے نغموں کی اُتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ اسلام میں حضورِ قلب کے لیے اُن روحانی نغموں کی جن کو ایمان کا نور اور اُس کی برقی شعاعیں چھیڑتی ہیں، خارجی ماحول کا زائیدہ حضورِ قلب وہ پائندہ تابناکی اور احساسات کی لطیف وشیریں بیداری ہرگز پیدا نہیں کر سکتا جو روحانی قوتوں کے زیر اثر نصیب ہو سکتی تھی تخیل کی لطافت اور عمل کے ہنگامہ کو کسی خارجی حقیقت کے ذریعہ پائندہ وتابناک بنانا ہرگز اُس عملی اور ذہنی ارتقاء کا باعث نہیں ہو سکتا۔ جو خود فطرتِ انسانی کی طبعی استعداد کی بیداری سے ممکن ہے۔ ماحول کا زائیدہ ارتقاء عارضی اور مضمحل ہوگا اور روح کی زائیدہ علویت پائدار یقیناً ایسا ماحول پیدا کر دینا جو توجہ کو ایک ہی طرف کر دے ایک بہتر چیز ہے لیکن اُس کو خارجی

ذرائع کا تابع کر کے اتنی اہمیت دیدینا کہ بغیر اِن کے مذہبی عبادت اجتماعی مراکز میں نہ کی جا سکے یا بغیر اُن کو تسلیم کیے ہوئے قانونِ الٰہی مکمل نہ ہو سکتا ہو حقائق کی نسبت وسائل پر زیادہ زور صرف کر دینے کے ہم معنی ہوگا اور یہ ہی وہ چیز اور یہ ہی وہ نکتہ تھا جس پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا وہ خدا تک پہنچنے کے لیے کسی وسیلہ کو ایسی اہمیت دینا گوارا نہیں کرتا جو عام انسانی ذہنیت کو وسیلہ اور حقیقت میں کوئی فرق نہ ہونے یا بہت ہی خفیف فرق ہونے کا مغالطہ دے سکے۔

کفارِ عرب اصنام کو یقیناً خدا نہیں سمجھتے تھے بلکہ جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے خدا تک پہنچنے کا ذریعہ لیکن چونکہ اُس راستہ نے منزل کی جگہ حاصل کر لی تھی اس لیے اُس کو شرک قرار دیا گیا۔ رہبانیت مرضیاتِ الٰہی حاصل کرنے کے نقطۂ نظر سے کوئی جرم نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ اُس سے کائناتِ انسانی کی عملی قوتیں مضمحل اور جہاد و تبلیغ کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں اس لیے اسلام نے "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ آج ہمارے صوفیہ نے بھی رہبانیت کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قوالی، سماع اور وجد و رقص کو پاکیزگی، معرفتِ الٰہی اور اعمالِ حسنہ کا وہ درجہ سپرد کر دیا ہے جو نماز، روزہ کو بھی بمشکل ہی دیا جا سکیگا۔ علی العموم دیکھا جاتا ہے کہ نماز کے اوقات تک کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ مزامیر کے زیر و بم پر رقص جاری رہتا ہے اور نماز با جماعت کا وقت گذر جاتا ہے۔ بلکہ صوفیہ کا ایک بڑا طبقہ نماز، روزہ سے اتنی روحانیت جذب کر سکنے کا قائل ہی نہیں جتنی کہ اُس کے نزدیک محفلِ سماع سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسلام نے کائنات میں عملی قوتوں کے مظاہر پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ جہاد کو جسم کی تبلیغ قرار دیا تھا اور تبلیغ کو روح کا جہاد۔ مگر صوفیہ ایک بے عمل، مضمحل اعصاب اور ماؤف ذہنیت رکھنے والے عاشق کی طرح ایثار و قربانی اور دیگر مظاہرِ محبت سے حسن کے دل میں جگہ حاصل کرنے کی بجائے تڑپنے، لوٹنے اور مست و بیخود رہنے ہی کو محبت کا اصل مظاہرہ سمجھنے لگے حالانکہ شعر اور موسیقی کی مرکب فضا میں حال لے لینا

محبت کا اتنا بہتر مظاہرہ نہیں کہا جا سکتا جتنا کہ کائنات کی دشوار زندگی کو سہل تر بنا سکنے کے لیے ایک مژہ کا کشاد و بند۔ اس راز کو اسلام نے پالیا اور اسی لیے اس نے مسلمانوں سے ہمیشہ ٹھوس خدمات کا مطالبہ کیا۔ وہ تلوار کے سایہ میں رقصِ بسمل کا تماشہ دیکھنا اور دکھانا پسند کرتا ہے اگر اس کی غرض "اعلاءِ کلمۃ الحق" ہو لیکن ہارمونیم پر ایک حسین مغنیہ کے آتشیں نغموں کو خواہ اس کا نتیجہ درجاتِ معرفت طے کرنا ہی بتایا جائے، ٹھوکر لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔ محبت کی ایک آہ سے زخم کی ایک کراہ زیادہ سخت ہوتی ہے"۔ یہ نظریہ اُن صوفیائے کرام کو دیکھ کر قائم کیا گیا ہے جو اپنی کسی سانس کو خدا کی یاد سے خالی نہیں بتاتے لیکن اس کی راہ میں خون کا ایک قطرہ بھی گرانے اور قید خانہ کی ایک زنجیرِ محبت بھی پہننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ محبت یقیناً ایک بہتر جذبہ ہے لیکن وہ ہی جس کو بیدار کرنے کے لیے نغمہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ وہ خود عمل کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر سکے جس محبت کو حسن چٹکیاں لے لے کر جگانے پر مجبور ہو وہ محبت ہی کیا ہوئی۔ محبت تو وہ ہوتی ہے جو حسن کے نگاہ اٹھاتے ہی تڑپ کر جاگ اٹھے جو اس طرح نہیں جاگ سکتا اُسے ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہیے جو محبت کہ خال و خد اور آب و رنگ پر ہی فریفتہ ہو اور اُس کے معنوی محاسن سے جذبِ انبساط کر سکنے کے ناقابل وہ محبت نہیں فریب ہے اور مغالطہ!

بعض صوفیہ وظائفِ روحانی میں موسیقی کے پہلو بہ پہلو "تصورِ شیخ" کے بھی قائل ہیں، حالانکہ یہ ایک مسلمان کی ذہنی بت پرستی ہوگی۔ اگر عملی بت پرستی کی اجازت نہیں ہے تو ذہنی بت پرستی کی بھی مخالفت ہونی چاہیے۔ "تصورِ شیخ" بت پرستی کا پہلا قدم ہے۔ جب ہمیں خدا تک پہنچنے کے لیے ایک ذہنی بت پرستی سے چارہ نہیں تو اُن عام انسانی بھیڑوں کے لیے جن کے ذہنی قوئی تصورات کی اہمیت محسوس کرنے سے قاصر ہیں کیوں ایک مجسم بت سامنے رکھنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ ذہنی تصورات سے ایک علمی ذوق رکھنے والا ہی لذت اندوز ہو سکتا ہے لیکن ایک

جاہل کی بہرہ اندوزی کے لیے مجسم تصور کی ضرورت ہوگی میں سمجھتا ہوں کہ بُت پرستی کی تعمیر "تصور شیخ" ہی کے سنگ بنیاد پر قائم کی گئی ہوگی۔ اصنام بھی حقیقت میں وہ ہی شیوخِ روحانی یا اجرام فلکی ہیں جن میں لوگوں نے مخفی قوتوں کو دیکھا تھا۔ اگر شیوخ روحانی کا تمثیلی بُت تراشا جا سکتا ہے تو اُس ہی نمونہ کا سنگین بُت عبادت گاہ میں رکھ دینا بھی کوئی بدعت نہ ہوگی۔ وسائط کو جب کبھی حقائق کی جگہ دی جائیگی نتیجہ ہمیشہ وہ ہی ہوگا جو ہوتا رہا ہے۔ ایسی حالت میں صداقت کی لطافتیں یکسر گم ہوکر انسانی زندگی کو ایسے راستہ پر ڈال دیتی ہیں جو دوزخ کی طرف جا رہا ہو۔ لہذا ذہن، وجدان اور روح کے درمیان فرق نہ کر سکنے والوں کی پیروی کرتے ہوئے کبھی جمالیاتی حقائق کو روحانی حقائق کے نام سے یاد نہیں کرنا چاہیے۔ شعر و موسیقی جمالیاتی وجدان کو ضرور بیدار کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہو سکتے کہ روحانیت اور جمالیاتی احساس کو محض لطیف حقائق میں سے ہونے کی بنا پر یکساں حیثیت سپرد کی جا سکے۔ شعر و موسیقی سے جذبات انسانی میں ضرور ارتعاش پیدا ہوکر طوفان سا اُٹھنے لگتا ہے۔ مگر اس کو روحانیت کا ساحل نہیں فرض کر لینا چاہیے ورنہ اُن اعمال و حرکات کی کشتی جو قانون الٰہی میں ترمیم و اضافہ کا مطالبہ کرتے ہوں آپ کو ایک ایسے بھنور میں لے جاکر غرق کر دیگی جہاں سے دوبارہ نکل آنے کا تصور کرنا بھی بے وقوفی ہوگا۔

خواطر و سوانح

علامہ ابنِ جوزی

از مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

چھٹی صدی ہجری کے معمورہ علم وعمل میں جو تابناک شخصیتیں آسمانِ شہرت کا آفتاب ماہتاب بن کر چمکیں، اُن میں ایک نہایت بلند پایہ شخصیت علامہ ابوالفرج جمال الدین عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ المتوفی ۵۹۰ھ کی ہے۔

ایک عظیم وجلیل محدث اور خطیب ذی شان کی حیثیت سے علامہ موصوف کا شمار نہ صرف چھٹی صدی کے اکابر واعیان میں سے ہے بلکہ آپ کی عظمت وجلالتِ شان کا ہر دور میں اعتراف کیا گیا ہے۔

مشہور حافظِ حدیث اور ناقدِ فن رجال علامہ شمس الدین ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے:-

ما علمت ان احداً من العلماء صنف ما صنف ھٰذا الرجل (۱)	مجھے معلوم نہیں علماء اُمت میں کسی کی تصنیفیں اس شخص کے برابر ہوں۔

ایک دفعہ کسی نے خود علامہ سے ان کی تصانیف کی تعداد کے متعلق دریافت کیا، فرمایا:-

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴

زیادۃ علی ثلاث مائۃ واربعین مصنفاً منہا ما ھو عشرون مجلداً (۱)	تین سو چالیس سے زیادہ جن میں بعض کتابیں بیس بیس جلدوں میں ہیں۔

موفق عبداللطیف کا قول ہے:۔

کان فی التفسیر من الاعیان وفی الحدیث من الحفاظ (۲)	ابن جوزی فن حدیث میں بہت بڑے حافظ تھے اور علوم قرآن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔

مقدسی کہتے ہیں: ابوالفرج ابن جوزی خطابت و وعظ میں اپنے زمانہ کے امام تھے (۳)

حافظ ذہبی برملا اقرار کرتے ہیں:۔

وحصل لہ من الحظوۃ فی الوعظ مالم یحصل لاحد قط (۴)	حسن بیان اور انداز خطاب کے کمال کا جو ملکہ قدرت نے ابن جوزی کو عطا کیا تھا کسی کو میسر نہ ہوا۔

اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں:۔

مازلت اعظ الناس واحرضھم علی التوبۃ والتقوی فقد تاب علی یدی الی ان جمعت ھذا الکتاب اکثر من مائۃ الف رجل واسلم علی یدی اکثر من مائۃ الف (۵)	میں لوگوں کو نصیحت کرتا رہا اور توبہ و تقوی اور انابت الی اللہ کی طرف بلاتا اور ترغیب دیتا رہا یہاں تک کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت تک ایک لاکھ سے زیادہ انسان میرے ہاتھ پر توبہ کر چکے ہیں ایک لاکھ سے زیادہ اسلام کے دامن رحمت میں آچکے ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ میں سبط ابن جوزی (ابن جوزی کے پوتے) کا قول نقل کیا ہے:۔

میں نے اپنے دادا ابن جوزی سے سُنا وہ سرِ منبر فرما رہے تھے:۔

---

(۱) شذرات الذہب عماد حنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ (۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ (۳) شذرات الذہب جلد ۴۔
(۴) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ (۵) شذرات الذہب جلد ۴، نقلاً عن کتاب القصاص لابن الجوزی۔

کتبت باصبعی الفی مجلداً میرے قلم سے دو ہزار جلدیں نکلی ہیں

موفق عبداللطیف کے بیان کے مطابق ابن جوزی کا اوسطِ تحریر چار جزو یومیہ تھا اور سالانہ اوسط تقریباً پچاس ساٹھ ضخیم جلدیں[1]۔

اسی کے ساتھ شہرت اور حسن قبول کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی مجلس علم و تقویٰ میں ایک ایک لاکھ کا اجتماع ہوتا تھا[2]۔ اس اجتماع میں امراء، اعیان سلطنت یہاں تک کہ خلیفۂ وقت استفادہ کی غرض سے شریک ہوتے تھے[3]"

ارباب تصوف محدث موصوف کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے ان کے تشدد اور سخت گیری کی شکایت کرتے ہیں اور یہ واقعہ ہے۔ علامہ کا لب ولہجہ اس باب میں اس درجہ تند و تیز ہے کہ اہل تصوف کی یہ شکایت ایک حد تک بجا بھی ہے۔ تاہم موصوف کے زہد و اتقا اور حزم و احتیاط کا یہ عالم تھا:

کان زاھداً فی الدنیا متقللاً منھا وما مازح	دنیا سے بے لاگ، قانع، فضول باتوں سے مجتنب، کوئی ایسا
احداً قط ولا اکل من جھۃ لایتیقن حِلّھا	ذریعہ معاش اختیار نہ کرتے تھے جس کے حلال اور قابل اطمینان
ومازال علیٰ ذٰلک الاسلوب الیٰ ان توفاہ	ہونے کے متعلق یقین نہ ہو وفات کے وقت تک انکی زندگی
اللہ تعالیٰ[4]	کا یہی انداز رہا۔

زیادہ کیف طاری ہوتا تو زبان پر یہ الفاظ جاری ہوتے:۔

الٰھی لا تعذب لساناً یخبر عنك ولا عیناً	میرے معبود معرفت و توحید کی خبر دینے والی زبان، دلائل توحید
تنظر الیٰ علوم تدل علیك ولا قدماً تمشی	پر نظر رکھنے والی آنکھ، خدمت حق کے لیے منزلیں قطع کرنیوالے

(۱) یکتب فی الیوم اربع کراریس وترفع لہ فی کل سنۃ من کتابتہ ما بین خمسین مجلداً الی ستین۔ شذرات الذہب جلد ۴
(۲) تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ (۳) شذرات الذہب جلد ۴ (۴) شذرات الذہب جلد ۴۔ مختلف تذکروں میں ہے:۔ ورای من القبول والاحترام مالا مزید علیہ۔

لی خدمتك ولا یدا تکتب حدیث — قدم پیغمبر برحق کی حدیثیں لکھنے والے ہاتھ کو اپنی گرفت اور عذاب
رسولك۔ (شذرات الذہب) — سے محفوظ رکھ۔

ان شہادتوں کی روشنی میں اس ایمان افروز تاریخی حقیقت کی صداقت پر کیوں مہر تصدیق ثبت کیجائے
کہ "محدث ابن جوزی کی میت کے غسل کے لیے جو پانی استعمال کیا گیا وہ ان کی وصیت کے مطابق قلم کے
تراشوں کے اُس ذخیرے سے گرم کیا گیا تھا، جسے اسی مقصد سے جمع کیا گیا تھا"
بیان حیرت میں ڈال دینے والا ہے، چودھویں صدی کے دماغ اسے پڑھ کر استعجاب وحیرت کے
سمندر میں غرق ہونے لگینگے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری کے عام اصول
اس بیان کو قبول کرتے ہیں اور ان اصول کے پیش نظر اس پر استعجاب اور اس سے انکار کی کوئی وجہ
نہیں ہوسکتی۔ ساٹھ ستر سال تک کتاب وسنت کے حقائق کو بطونِ اوراق میں جمع کرنے والے قلم کے تراشے
اسی احترام کے مستحق تھے۔ رہا تراشوں کی مقدار کا معاملہ تو اس میں کیا تردد ہوسکتا ہے کہ سالہا سال کے
جمع شدہ تراشوں کی مقدار اتنی ہوسکتی تھی جس سے بقدر غسل پانی گرم کیا جاسکے۔

بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہمیں کہنا یہ تھا کہ اسی شہرۂ آفاق محدث کی ایک نہایت لطیف ونفیس
کتاب "صید الخاطر" ہے، اس کتاب کے متعلق اپنے رسالہ "لفتۃ الکبد الی النصیحۃ الولد" میں بیٹے کو خطاب کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:-

وتلمح کتاب صید الخاطر فانك تقع بواقعات — "صید الخاطر مطالعہ میں رکھو اور غور سے پڑھو اس میں تم کو بہت سی
تصلح لك امر دینك ودنیاك" — ایسی باتیں ملینگی جو دین و دنیا کے معاملات میں ہنا کا کام دینگی۔

جہاں تک کتاب کے حجم کا تعلق ہے علامہ ابن جوزی کی بڑی بڑی تصنیفوں کے مقابلہ میں اس کی
کوئی اہمیت نہیں، صرف چار سو صفحوں کی کتاب اُس شخص کے قلم کے اعجاز کے سامنے کیا حقیقت رکھتی
ہے، جو کم سے کم چار جزو یومیہ لکھنے کا عادی ہو۔

یہ چھوٹی سی کتاب جس وجہ سے اہمیت وعظمت اور شہرت وقبول کے مقامِ بلند پر پہنچی وہ یہ ہے کہ اس کا ہر ہر لفظ بے تکلفانہ وارداتِ قلب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی ہر ہر سطر مصنف کے دل کی گہرائیوں کی آئینہ دار ہے، کیونکہ کتاب کا تعلق جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے کسی خاص موضوع اور کسی خاص مضمون سے نہیں بلکہ مختلف وقتوں، مختلف حالتوں اور مختلف اسباب سے مؤلف کے آئینۂ دل پر جو حقائق روشن ہوئے اور جن رجحانات وخیالات کا عبور وخطور ہوا ان کو قلمبند کرلیا اور شدہ شدہ یہ مجموعہ کتاب کی صورت میں مرتب ہوگیا۔ اخلاص ونزاہت کے ساتھ جرأت وبے باکی اس مجموعہ کی جان ہے، اور یہی اندازِ بیان اور طرزِ خطابت ہے جس نے کتاب کی اثر انگیزی اور افادی حیثیت کو بامِ عرش پر پہنچا دیا ہے۔

کئی سال کی بات ہے ہمارے ملک کے مشہور فاضل اور عربی کے مایۂ ناز ادیب مولانا میمن عبدالعزیز صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے غالباً معارف کے صفحات پر "صید الخاطر" کا ادبی حیثیت سے تعارف کرایا تھا اس تعارف کو اُسی تعارف کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔

ایک جلیل القدر محدث ومفسر کی نگاہِ بصیرت واعتبار کی منتخب کی ہوئی حقیقتیں ادبی تعارف سے زیادہ ایسے تعارف کی مستحق ہیں جو متجسس روحوں کے لیے سامانِ تسکین بہم پہنچائے اور جس سے کتاب کے افادی گوشے اس طرح واضح ہوجائیں کہ مطالبِ کتاب کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے

ہم چاہتے ہیں قارئین بُرہان عبر ونصائح کے اس بیش قیمت خزانے سے بہرہ یاب ہوں آئندہ خواطر وسوانح کے سلسلہ میں کتاب کی جستہ جستہ فصلوں کا ترجمہ پیش کیا جائیگا۔ وباللہ التوفیق

لطائفِ ادبیہ

حدیثِ راز و نیاز

مولانا سیماب اکبرآبادی

مولانا سیماب اکبرآبادی ہندوستان کے مشہور استادِ شعر و سخن ہیں اردو شاعری کے موجودہ دور میں آپ ایک مخصوص اسکول کے مالک ہیں اور آپ کے تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے جن میں حضرت ساغر نظامی کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے آپ نے "برہان" کا پہلا پرچہ ملاحظہ فرماتے ہی ایک تازہ غزل اشاعت کے لیے ارسال فرمائی ہے جس کو ہم بعد شکریہ درج کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ خود مولانا کے بقول آپ کا "برہان" سے تعلق دائمی ثابت ہوگا۔

نامِ حقیقت نہ لے شعبدہ بازِ مجاز — دل میں ترے بتکدہ، سر میں جنونِ نماز

خلقتِ دل عام ہے، عام نہیں دلنواز — آئینے ہیں سیکڑوں، چند ہیں آئینہ ساز

شمع کو محفل میں ہے روز نیا اک گداز — سوز کی ہے کیا کمی، عمرِ محبت دراز!

بھیج دے یارب کوئی جلوۂ آئینہ ساز — پھر دلِ بے کیف ہے، غزنویِ بے ایاز

خود تو رہے محوِ خواب اور مجھے سونے نہ دے — آہ یہ دستورِ ناز، ہائے یہ شامِ دراز!

شورشِ پُر زور یا مقصدِ ہستی نہیں — غل نہ مچا، بیٹھ جا۔ تو نہیں آگاہِ راز

صوفیِ خود بیں کے پاس کیا ہے سوائے خودی — جُبّۂ خود ساختہ، خانقہِ خانہ ساز

جس کی نظر ہو شراب، وہ مرا ساقی بنے — ہاں نہیں مجھ کو پسند، شاہدِ پیمانہ باز

حسن ہے اور دلکشی، عشق ہے اور نارسی — ایک دلِ غزنوی، صد خمِ زلفِ ایاز

عشوۂ طناز کو، غمزۂ غماز کو — طنطنۂ ناز کو، میرا سلامِ نیاز

دو ہی تو ہیں وارثی، جانِ جہانِ وفا
بندۂ خواجہ پرست، خواجۂ بندہ نواز

غزل

جناب ملّا رموزی صاحب

ملّا رموزی صاحب جو اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے ہندوستان کے اُردو خواں طبقہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں، اب چند برسوں سے آپ نے تغزل کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ اور اس میں بھی آپکی طبع ندرت پسند نے قسم قسم کی جدت طرازیاں کی ہیں "برہان" کا پہلا پرچہ ملاحظہ فرما کر آپ نے ذیل کی تازہ غزل اشاعت کے لیے ارسال فرمائی ہے جس کو ہم دلی شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ غزل کے ساتھ آپ نے فلسکیپ کے آٹھ صفحوں کا جو طویل خط ارسال فرمایا ہے وہ بجائے خود آپ کی "رموزیت" کا شاہکار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اپنے مقررہ معیار کے مطابق کسی تعریفی خط کو "برہان" میں شائع کرنا پسند نہیں کرتے۔

مزاجِ ہندوستاں کی افسردگی کو پھر سے جواں بنا دوں
اگر میں جوشِ شبابِ جاناں کی داستاں پر غزل سنا دوں

شباب جس کے حجاب کی اک جھجک سے سو بجلیاں گرا دوں
شباب جس کی نظر کی شادابیوں سے آتشکدہ بجھا دوں

شباب یا جام گوہریں میں شراب رنگیں کی تابشیں ہیں
شباب جس سے گلاب کی نزہتوں میں سو رونقیں بڑھا دوں

شباب میں وہ وقار جس پر غرور سلطاں بھی تاج دیدے
نگاہ کی مست مسکراہٹ پہ ثروتِ سیکدہ لٹا دوں

وہ جیسے میرے خیال کی ایک دردمندی لیے ہوئے ہیں

نگاہ کی ایسی مضمحل جنبشوں کے آگے میں سر جھکا دوں

یہی ہے وہ جس نے مجھ کو عشق و جمال کی زندگی عطا کی
وہ زندگی جس کی اک نظر سے بہار کے حسن کو سجا دوں

مگر غضب، اپنے دوستوں کی نظر کی کم ظرفیوں میں رہ کر
ترا فسانہ تو کیا، میں تصویر بھی جو چاہوں کسے دکھا دوں

ق

وہاں تو اُن کے یقیں کی منزلیں ہی اتنی فسردہ تر ہیں
وہ منکرِ حسن ہی رہینگے میں لاکھ اُن کو یقیں دلا دوں

نظر کی ان پستیوں سے اک دن بلند ہو اور یوں سنور جا
کہ تجھ کو لے کر میں ایک دن اوجِ کہکشاں تک پہ مسکرا دوں

غضب کہ دوشیزہ چاندنی اور ایک ناقدرداں فضا میں
جو مجھ تک آئے تو آج اُس سے میں ساری دنیا کو جگمگا دوں

خدائے حسن و بہار تیرے قدم قدم کو بہار کر دے
بہارِ شعر و بیاں رموزی تری نظر پر نثار کر دے

مولانا حسرت موہانی کی ایک غزل "تیرے بغیر" ابھی چند روز ہوئے بعض اخباروں میں شائع ہوئی تھی، غزل کا سوز و گداز اُس غم جانگسل کا امانت دار تھا جو مولانا کے دل میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے والی رفیقۂ حیات کی یادگار ہو کر آباد ہو گیا ہے۔ ہمارے فاضل دوست مولانا حامد الانصاری غازی بھی چند ماہ ہوئے اسی طرح کے روح فرسا حادثہ سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اس لیے جب آپ نے مولانا حسرت کی یہ غزل پڑھی تو بیساختہ دل پر ایک چوٹ لگی اور اُس کی صدائے دل شکن غزل ذیل کے زمزمہ میں تبدیل ہو گئی"

"برہان"

میرا سینہ وقفِ صد آلام ہے تیرے بغیر
میری ہر اک آرزو ناکام ہے تیرے بغیر

اب نہ وہ دن ہیں، نہ وہ راتیں نہ وہ عیش و نشاط
اب خدا ہے اور خدا کا نام ہے تیرے بغیر

دیکھ مجھ کو میں تری ٹوٹی ہوئی اُمید ہوں
میرا شیشہ اک شکستہ جام ہے تیرے بغیر

اب نہ وہ دل اور نہ وہ محفل نہ وہ دنیائے دل
ہر طرح بے کیف صبح و شام ہے تیرے بغیر

میرا ہر اقدام ہے اک شکل تکمیل جنوں
میرا ہر آغاز اک انجام ہے تیرے بغیر

آمری اس زندگی کو دیکھ اور حسرت سے دیکھ
زندگی ہے اور برائے نام ہے تیرے بغیر

ہر طرف اک جوششِ ناکام اور اک اضطراب
ہر سکوں اک گردشِ ایام ہے تیرے بغیر

اب نہ وہ گل ہیں نہ وہ گلشن نہ وہ رنگِ بہار .
حسن ہر عنوان سے بدنام ہے تیرے بغیر

ایک تو ہی جنتیں تیرے لیے آباد ہیں!
ایک غازیؔ ہے، کہ بے آرام ہے تیرے بغیر

صبح ۸ بجے۔ ۲۵۔ جولائی ۳۸ء

ندوۃ المصنفین

شئون علمیہ

حضرت سلیمانؑ کا بیڑہ

کتاب "عہد قدیم" میں مذکور ہے کہ "بلقیس ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان کی زیارت ان کے پایۂ تخت یروشلم میں اس غرض سے کی تھی کہ وہ اُن کی ثروت و دولت اور مملکت و سلطنت کا مشاہدہ کرے اور اُن کی حکیمانہ باتوں سے مستفید ہو" لیکن محققین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان کی ملاقات محض رسمی اور دونوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعلقات پر گفتگو کرنے کے لیے تھی۔

اصل واقعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ شام اور یمن کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی اُس کے سلسلہ میں قافلوں کو خشکی کی راہ سے جنگلوں کو عبور کرکے جانا پڑتا تھا، اور ان کے راستہ میں شہر سبا بھی واقع ہوتا تھا جس سے گذرنے کے لیے ان لوگوں کو بھاری بھاری ٹیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔ سبا کی آمدنی کا دارومدار زیادہ تر ٹیکس کی اسی رقم پر تھا۔

حضرت سلیمان نے تجارتی قافلوں کی ان مشکلات کو دیکھ کر ایک بحری بیڑہ تیار کرایا جس کے ذریعہ تجارت خشکی کے راستہ کے بجائے بحر احمر کی راہ سے ہونے لگی، اور کشتیاں شام، یمن اور ہندوستان کی اشیاء کو لاد کر صبح وشام روانہ ہونے لگیں۔ حضرتِ سلیمان کے اس بیڑہ سے سبا کے خزانہ کو صدمۂ عظیم پہنچا، اور اس میں دن بدن کمی واقع ہونے لگی، یہ دیکھ کر ملکۂ سبا پریشان ہوئی، اور اس نے اس سلسلہ میں حضرت سلیمان سے گفتگو کرنے کے لیے سفر کیا کہ کسی طرح ٹیکس کی آمدنی کچھ نہ کچھ ہر سال وصول ہوجایا کرے۔

حضرت سلیمان نے اپنا یہ بیڑا بحر احمر کے ساحل کی اُس بندرگاہ پر بنایا تھا جہاں آج "تل الخلیفہ" کا گاؤں آباد ہے۔ دسویں صدی قبل مسیح سے لے کر آٹھویں صدی قبل مسیح تک یہ بندرگاہ بہت آباد اور پر رونق رہا۔ یہاں کشتی سازی کے بڑے بڑے کارخانے تھے، اور معدنیات کی صنعت کا کام بھی خوب

ہوتا تھا۔اور اس کے علاوہ یہ جگہ مچھلی کی بہترین شکارگاہ سمجھی جاتی تھی۔

آج کل پروفیسر میلار بوزدر کی زیر نگرانی امریکہ کا جو مدرسہ یروشلم کے آثار مشرقی کی تحقیقات کر رہا ہے اُس نے ابھی حال میں چند ایسے آثار دریافت کیے ہیں جن سے حضرت سلیمان کے اس بیڑہ اور اس بندرگاہ کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں ان محققین کو چند ایسے چولھے ملے ہیں جن میں معدنیات کو پگھلا کر صاف کیا جاتا تھا۔ ان کی تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ بندرگاہ شمالی ہواؤں کے بالمقابل تھا۔ اور اس سے غرض یہ تھی کہ جب شمالی ہوائیں چلیں تو چولھوں کی آگ زیادہ مشتعل ہو جائے اور کچھ دنوں تک برابر جلتی رہے، یہ بندرگاہ اب ساحل سے نصف میل دور ہٹ گیا ہے لیکن حضرت سلیمان کے زمانہ میں بحر سے بالکل ملا ہوا تھا۔

برتھ کنٹرول اور انسانی ترقی

آج کل جرمنی، ڈنمارک اور ولایات متحدہ امریکہ میں عام علماء علم الاجتماع کا یہ خیال ہے کہ وہ لوگ جو بیمار اور کمزور ہیں اُنہیں عمل جراحی کے ذریعہ برتھ کنٹرول کرنا چاہیے تاکہ بیمار اور کمزور اولاد کے پیدا ہونے سے انسانی سوسائٹی محفوظ رہے۔ ان کی رائے ہے کہ قوم میں کمزور بچوں کا پیدا ہونا تمدن کے لیے سخت مضرت رساں ہے لیکن ان کے بالمقابل علماء کا ایک دوسرا گروہ ہے جو اس خیال کا شدید مخالف ہے۔ اس گروہ کا سب سے بڑا لیڈر ایک انگریز عالم پروفیسر ہالڈین ہے۔ پروفیسر موصوف عہد حاضر میں تاریخ طبیعی کا بہت بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔ اس نے حال ہی میں "وراثت اور سیاست" کے موضوع پر ایک بہترین کتاب تصنیف کی ہے جس میں بڑی قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ جو مرد اپنے اوپر عمل تعقیم کراتے ہیں اُن میں سے اکثر کی صحت خراب ہو جاتی۔ اور عورتوں کا تو حال یہ ہے کہ اس عمل کے بعد دس فی صدی مہلک امراض میں گرفتار ہو کر انتقال کر جاتی ہیں۔ پروفیسر ہالڈین نے اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ برتھ کنٹرول اقتصادی یا اجتماعی کسی حیثیت سے بھی سوسائٹی کے لیے مفید نہیں بلکہ سخت مضر ہے۔

موصوف کی کتاب (The Inequality of man) تصنیفات میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔

موسیقی کے ذریعہ دیوانگی اور دوسرے امراض کا علاج

امریکہ میں ایک ڈاکٹر ولیم فان ڈی فل ہے جو موسیقی کے ذریعہ مجرموں اور پاگلوں کا علاج کرتا ہے پچھلے دنوں نیویارک کے بعض قید خانوں میں چند قیدی عورتوں نے جیلخانہ کے احکام کی خلاف ورزی شروع کردی، اُن کو اس حرکت سے روکنے کی متعدد تدبیریں کی گئیں لیکن کوئی کارگر نہ ہوسکی۔ آخر کار محکمۂ جیل نے اس ڈاکٹر کو طلب کیا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی ان تمام سرکش عورتوں کو اپنے پاس جمع کیا اور جمہوریت کا گیت گانا شروع کردیا۔ پھر کوئی عشقیہ گیت گایا جس کو اُس نے ایک ایسی گیت پر ختم کیا جس میں ماں کی محبت کو بیان کیا گیا تھا۔ اس موسیقی کو سنتے ہی تمام عورتیں اصلی حالت پر آگئیں اور جیلخانہ کا انتظام درست ہوگیا۔ ڈاکٹر موصوف کو کولمبیا کی یونیورسٹی نے اپنے نظریہ کے متعلق لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اور ۱۹۳۰ء میں جیلوں کی اصلاح کے لیے وہاں جو سرکاری کانفرنس منعقد کی گئی تھی اُس میں بھی موصوف نے شرکت کی تھی۔ ہالینڈ کے اصلاحی اداروں میں ڈاکٹر ولیم کے نظریات پر عمل درآمد کیا جاتا ہے اور وہ بہت کامیاب ثابت ہورہے ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض عجیب وغریب مثالیں دیکھنے میں آئیں۔

شکاگو کی ایک عورت کو اپنے اکلوتے بچہ کی وفات کا اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ پاگل ہوگئی۔ اور بچوں کی صورت سے ہی نفرت کرنے لگی کوئی بچہ اُسے اتفاقاً کہیں نظر آجاتا تو اُسے دیکھتے ہی رونے لگتی اور چیخ وپکار شروع کردیتی تھی۔ شفاخانہ کے اسٹاف نے مشہور موسیقار براہمس کو بلایا اور اُس نے ماں کی محبت کا گیت کچھ اس انداز سے گاکر اُس عورت کو سنایا کہ وہ اچھی خاصی ہوگئی اور اُس کا تمام مرض جاتا رہا، اور وہ بچوں سے پھر محبت کرنے لگی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ میلانو میں پیش آیا۔ ایک عورت کی قوتِ حافظہ بالکل جواب دے چکی تھی معمولی بات یاد ہی نہ رہتی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے اس عورت کے خاوند کو بتایا کہ وہ بہترین الحان سے اس کے سامنے وہ گیت گایا کرے جو اُسے بچپن میں سب سے زیادہ مرغوب تھا۔ خاوند نے چند روز تک اس پر عمل کیا تھا کہ بیوی بالکل تندرست ہوگئی اور اُس کی قوت حافظہ عود کر آئی۔

ایک اٹالین نوجوان لڑکی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کی قوت گویائی بالکل سلب ہوگئی تھی تین ماہ تک وہ گنگ کے مرض میں گرفتار رہی۔ آخرکار ایک ڈاکٹر نے مریضہ کی ماں سے کہا کہ وہ اُس کے سامنے اچھی آواز کے ساتھ وہ گیت گایا کرے جس کو وہ اپنے بچپن میں بہت پسند کرتی تھی اور جس میں اس کے آنیوالے ایام عروسی کا ذکر ہوتا تھا۔

اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیقی کو دیوانگی، جنون اور دوسرے سوداوی امراض کے علاج میں بہت بڑا دخل ہے۔ البتہ سب سے اہم بات یہ معلوم کرنا ہے کہ موسیقی کا کونسا حصہ کس مرض کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

موسیقی کے ذریعہ امراض کا علاج کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں عرب بھی بعض بعض شفاخانوں میں موسیقی کے جلسے منعقد کرتے تھے۔ اور امریکہ کا مشہور پروفیسر ولیم جیمس بھی شہر بوسٹن کے بعض شفاخانوں میں موسیقی سے علاج امراض کا کام لیتا تھا۔

(س)

چندہ سالانہ رسالہ برہان

پانچ روپیے

خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر رسالہ برہان قرول باغ نئی دہلی

برہان

برہان

جلد اوّل شمارہ ۳

رجب ۱۳۵۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۳۸ء

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

فہم قرآن

جس طرح کسی شخص کے اعضاءِ رئیسہ میں فتور پیدا جاتا ہے تو اُس سے تمام جسم متاثر ہوتا ہے۔ معدہ وجگر بیمار ہوتے ہیں تو مریض کا مزاج، عادات وخصائل، چہرہ کا رنگ، جسم کی موزونیت یہ سب چیزیں بدل جاتی ہیں۔ دماغ کا توازن خراب اور طبیعت میں ایک خاص قسم کا چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے۔ کسی قوم کے اربابِ علم وفضل اُس قوم کے لیے قلب وجگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ظاہر ہے اگر یہ تندرست اور قوی ہیں، تو قوم کے افراد میں بھی صحت وتندرستی کے آثار پائے جائینگے لیکن اگر بدنصیبی سے ان لوگوں کا ہی حال سقیم ہے، خود ان کے دماغ کا توازن بگڑگیا ہے، اور خود ان میں آپس میں یکجہتی، ہم خیالی، ہم مقصدی وہم آہنگی نہیں ہے، تو پھر غریب افراد کا پوچھنا ہی کیا۔ وہ اگر ریگ کے ذروں کی طرح پریشان ہیں، تو کوئی جائے، استعجاب نہیں۔ اور اگر اُن کا "خاکسترِ قومیت" دوشِ ہوا پر جہالت ونادانی کے تیرہ وتار بیابانوں میں آوارہ پھر رہا ہے تو اُس پر کوئی حیرت نہیں۔

آہ! کیونکر کہیے کہ آج مسلمانوں کی قوم کا حال بھی یہی ہے۔ جماعت جس چیز سے جماعت بنتی ہے یعنی احساس مرکزیت وہ سرا سر ان میں مفقود ہے۔ ہر شخص ایک نئے خیال کا پابند اور ہر مسلمان ایک منفے

جذبۂ و آہنگ سے ہم کنار ہے۔ ایک مرض ہو تو اُس کی شکایت کیجیے، زخم ایک ہو تو اُس کے لیے تدبیر چارہ گری کیجا سکتی ہے، جب جسم ہمہ تن داغ بن گیا ہو تو پنبہ و مرہم کہاں کہاں رکھا جائے۔ داماں و جیب اگر کہیں سے پھٹ گئے ہیں تو اُنہیں سیا جا سکتا ہے لیکن اگر دست وحشت نے ان کو تار تار کر دیا ہے تو پھر کیوں کسی کا احسان سوزن کاری و منتِ بخیہ گری اُٹھایئے۔ کہ یہ سب تدبیریں اور چارہ سازیاں لاکھ کوششوں کے بعد بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

ہر جماعت کی روح و رواں اُس کا مرکز ہوتا ہے۔ جب تک اُس قوم کے افراد میں مرکزی وابستگی پائی جائیگی اُن کی روح سرسبز و شاداب رہیگی۔ اور جتنا جتنا اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوتا جائیگا، اُن کی قومیت بھی مضمحل، کمزور اور از کار رفتہ ہوتی رہیگی۔ یہاں تک کہ اگر یہ احساسِ مرکزیت بالکل ناپید ہو جائے تو پھر وہ جماعت جماعت نہیں رہتی اُس کے افراد تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانوں کی طرح منتشر، اور گریبانِ عاشق کی مانند پراگندہ و متفرق ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کی دنیا الگ، ہر ایک کا مرکزِ خیال جُدا، اور ہر ایک کا کعبۂ مقصود نیا ہوتا ہے۔ اُن میں جماعتی وحدت مفقود ہو جاتی ہے۔ اور انفرادی تشتتِ خیال، ان کے نظامِ جماعت کے شیرازہ کو پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید کی زبانِ حق ترجمان نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا	اللہ اور اُس کے رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا
فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا	کروگے تو تمہاری طاقت سست پڑ جائیگی اور ہوا اکھڑ جائیگی،
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ	اور جیسی کچھ بھی مشکلیں مصیبتیں پیش آئیں، تم صبر کرو۔ اللہ اُنکا ساتھی ہے جو صبر

اس آیت میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنے مرکز (اطاعت اللہ و رسولہ) سے انحراف اختیار کیا تو پامال ہو جاؤ گے، تمہاری قومی عظمت و سطوت کا قصرِ رفیع دھم سے زمین پر آ رہیگا، اور دوسری

قومیں تمہیں ایک لقمۂ تر سمجھ کر ہضم کر جانے کی کوشش کریں گی۔ پھر فرمایا گیا کہ اگر کسی بات پر تم کو کسی سے اختلاف بھی ہو تو اس پر صبر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اختلاف کے چند شعلوں کو فرطِ عناد و بغض کے دامن سے ہوا دے کر بن کی آگ بنا دو اور وہ تمہاری قومیت کے جسم و روح کو از فرق تا بقدم بھسم کر کے رکھ دے۔

مسلمانوں کا مرکز کیا ہے: اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مسلمانوں کا مرکز ایک اور صرف ایک ہی ہے، اور وہ قرآن ہے، اُن کی تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب اور اُن کے تمام اجتماعی اور اقتصادی نظام سب اسی ایک مرکز سے وابستہ اور اسی ایک رشتہ سے منسلک ہیں۔ ان کی تمام اخلاقی و روحانی برتریوں اور بزرگیوں کا دار و مدار صرف اسی ایک کتاب مبین کے تعامل پر ہے۔ انہوں نے اس کی قیادت میں جب کبھی کسی جانب رُخ کیا۔ دشمنوں کی صفیں کی صفیں جو پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں دم کے دم میں اُلٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے سرنگوں و مفتوح ہو کر حق و صداقت کا پرچم اُڑانے لگے۔ انہوں نے قرآن کی مشعل کو ہاتھ میں لیے ہوئے جس کسی وادیٔ پُر ظلمت کی جانب اپنے عربی النسل گھوڑوں کی باگیں موڑیں تردد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹتی چلی گئیں، اور پھر وہاں ایمان و ایقان کے آفتاب جہانتاب نے اس شان سے طلوع کیا کہ ع عالم تمام مطلع انوار ہو گیا۔

لیکن جب سے دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر اُن کو قرآنِ حکیم سے بعد ہونا شروع ہوا، اُن کی روحِ قومیت بھی درماندہ ہونے لگی، اور آج اُس کے جو نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اُن کے ماتم میں دیدۂ و دل سے جتنا بھی خونِ جگر بہے کم، اور جس قدر بھی آہ و فغاں کے شرارے لب و دہن سے بلند ہوں تھوڑے ہیں۔

قرآن مجید کی مرکزیت سے تو کس مسلمان کو انکار ہو گا، مگر مشکل یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے فہم سے متعلق اب اس قدر زاویہائے نگاہ پیدا ہو گئے ہیں کہ اُن کی موجودگی میں محض مرکزیت کا اعتراف مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو اسوۂ حسنہ ماننے کے باوجود مسلمانوں میں پراگندگی خیال، تشتت اعمال، اور انتشار حسیات و جذبات کی وبا عام ہو رہی ہے اور یہی وہ انتشار وافتراق ہے جو اُن کو ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیتا۔

آج کل قرآن مجید کے فہم کی نسبت دو اہم خیال پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ہم اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں اور اِن دونوں خیالوں کا تجزیہ کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں تک درست اور کس حد تک قابل قبول ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل ان دونوں نظریوں کی تبلیغ بڑی شدومد کے ساتھ کی جارہی ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اسلام کی تمام بھلائیوں کا دارو مدار اور مسلمانوں کی نجات کا تمامتر انحصار اپنے ہی خاص زاویۂ نگاہ کی نشر و اشاعت پر سمجھ لیا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا جائے، اور اُن کے لیے جو خندقیں کھودی جارہی ہیں اُن میں اوندھے مُنہ گرنے سے اُنہیں بچا لیا جائے۔

آپ نے اکثر بعض تعلیم یافتہ حضرات کی زبان سے سُنا ہو گا کہ قرآن مجید ہندوؤں کی آسمانی کتابوں کی طرح مشکل، پیچیدہ، ادق اور ناقابل فہم کتاب نہیں ہے جس کا علم و فہم، اور جس کے معانی کا ادراک صرف برہمنوں اور پنڈتوں تک محدود رہتا ہے، بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جس کے معانی کا ادراک ہر اُس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو کسی زبان کا بھی تھوڑا بہت علم رکھتا ہے۔ ان حضرات کا یہ فرمانا بجا اور درست ہے۔ اور وہ کیا خود قرآن مجید نے اپنے آسان ہونے کا اعلان کیا ہے:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ   ہم نے قرآن مجید کو ذکر کے لیے آسان کر دیا۔

لیکن اس خیال پر جن نتائج کی بنیاد رکھی جاتی ہے، ان کے پیش نظر ہم ان حضرات سے بھی وہی کہہ سکتے ہیں جو حضرت علی نے خوارج کے جواب میں فرمایا تھا۔ خوارج تحکیم کے خلاف تھے اور اپنے استدلال میں قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یعنی حکم تو صرف اللہ ہی کے لیے ہے، علیؓ اور معاویہؓ کو کیا حق ہے کہ غیر اللہ کو اپنے معاملات کے لیے حکم بنائیں۔ حضرت علیؓ نے یہ سُنا تو فرمایا:۔

كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِلُ   یہ کلمہ حق ہے۔ مگر اس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح جو لوگ قرآن کے آسان ہونے کی رٹ لگا رہے ہیں۔ ان کے الفاظ اگرچہ درست ہیں اور کسی مسلمان کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا لیکن اگر ذرا اس ادعا کی گہرائیوں میں جائیے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان حضرات کا مقصد دعوتِ حق نہیں بلکہ اُن کے چند خاص اغراض و مقاصد ہیں جن کی تکمیل وہ اس دعوے کی آڑ میں کرنی چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کے آسان ہونے کے جو معنی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کرانا چاہتے ہیں وہ ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہیں۔ اور نہ وہ کسی صاحب انصاف کے نزدیک درخور پذیرائی ہوسکتے ہیں۔

یہ حضرات قرآن کے آسان ہونے سے حسب ذیل نتائج نکالتے ہیں:۔

(۱) قرآن کے معنی سمجھنے کے لیے کسی خاص علم کا پڑھنا اور حاصل کرنا ضروری نہیں۔

(۲) قرآن سے احکام کا استنباط جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابن مسعود کرتے تھے۔ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ اور ہم میں اور دوسرے ائمہ تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۳) اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں بیکار ہیں، کیونکہ قرآن تو ایک آسان کتاب ہے اُس کے فہم کے لیے کسی علم و راہنما کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص ترجمہ دیکھ کر اُس کا مطلب خود بخود معلوم کر سکتا ہے۔

پھر انہی لوگوں میں اب ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے:۔

(۴) فہم قرآن کے لیے کسی حدیث کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن ایک مکمل سرچشمۂ ہدایت ہے اسلامی احکام کی تمام کلیات وجزئیات اس میں بیان کردی گئی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت ہے کہ احادیث کی روشنی میں قرآن مجید سے احکام مستنبط کیے جائیں۔

ہر نیا قول جو کسی زمانہ میں کہا جاتا ہے۔ اور پھر اس کا قائل اسے بار بار دہراتا اور اس پر اصرار شدید بھی کرتا ہے، اپنے عہد کے احوال اور گرد و پیش کی فضا سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس بنا پر آئیے اصل مسئلہ پر بحث و تمحیص کرنے سے قبل یہ معلوم کریں کہ اس طرح کا ادعا کب سے کیا جا رہا ہے، اس کی تاریخ کیا ہے؟ اور اس میں اپنے زمانہ کے کن کن رجحانات و میلانات کا عکس نظر آتا ہے؟ ورنہ ظاہر ہے ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اگر واقعی قرآن مجید ایسا ہی سہل ہے تو صحابہ کرام میں پھر آپ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بعض بعض آیات کا مفہوم متعین کرنے میں کیوں اختلاف ہوا، اور اس کی کیا وجہ ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت کو بھی بہت بہت دنوں میں ختم کرسکتے تھے۔ ائمہ کرام اور مفسرین عظام کیا معاذ اللہ عقل باختہ تھے کہ انہوں نے ایک آسان سی بات سمجھنے کے لیے عمریں کی عمریں صرف کردیں اور پھر بھی اس کا قرار واقعی حق ادا نہیں کرسکے۔ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر آسانیٔ قرآن کا ادعاء بایں معنی درست ہے تو اب تک علماء نے جو خون پسینہ ایک کیا وہ سب فضول تھا، اور اگر یہ درست نہیں ہے تو پھر اس ادعاء جدید کا محرک و اصل سبب کیا ہے؟ اور کیوں اس کو بار بار شدومد کے ساتھ دہرایا جا رہا ہے؟

اصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے حاکمانہ

قبضہ کی گرفت مضبوط کرنی چاہی تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص مسلمان کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں۔ اور اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر انگریزوں کی ہر ایک چیز سے نفرت شدید کرتے ہیں اور اسی مذہبی جوش کے باعث ان میں جذبۂ جہاد (Fanaticism) بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انگریز ہندوستان کو فتح کر چکے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا جذبۂ جہاد ایک شیر کی طرح ہے کہ جب تک وہ اپنی کچھار میں پڑا سوتا رہتا ہے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا لیکن جب وہ بیدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اُس کو ترساں و ہراساں نہیں کر سکتی۔ یہ خیال و اندیشہ تھا جس نے انگریز کو آتش زیر پا بنا رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب ایسی چلنی چاہیے کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزیت کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھرا ہوا ہے وہ جاتا رہے لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان علمائے کرام کے زیر اثر تھے۔ اور وہ کسی حالت میں بھی انگریز کی طہارت کا فتویٰ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ اُن کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ علماء کرام کا ہی وجود ہے۔ اور یہ ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ آسانی سے کسی کے نقرئی یا زریں دامِ فریب میں آسکیں۔ اس بنا پر وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح علماء کا دفتا ختم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر اُنھوں نے جو استیلاء و تسلط جما رکھا ہے اُس کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائے۔

یہ اس فکر میں تھے ہی کہ انہیں سرسیّد اور اُن کے بعض ہم خیال لوگ مل گئے جنھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، اور اس میں اپنے مذہبی مضامین کے ذریعہ غریب علماء کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ سرے سے مذہب ہی کی بساط کمن اُلٹ کر رکھ دی۔ آپ سرسیّد کے مضامین پڑھیے، اُن کے ہم خیال شعراء کی نظمیں دیکھیے، آپ محسوس کرینگے کہ اُن میں کس آزادی کے ساتھ علماء کرام پر آوازے کسے گئے ہیں کیسی کیسی نادر اور نرالی پھبتیاں اُن پر چست کی گئی ہیں۔

ان لوگوں کو یقین تھا کہ محض سب وشتم سے کام نہیں چلتا اس لیے علمار کے وقار کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی جو شاید پہلی سے زیادہ کامیاب رہی ایک طرف تو انہوں نے کہنا شروع کیا کہ "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ" دین تو آسان ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی سہولت و آسانی کے مطابق اس کو سمجھ سکتا اور اس پر عمل کر سکتا ہے۔ اور دوسری طرف انہوں نے کہا کہ حضور خود فرما گئے ہیں۔ انتم اعلم بامور دنیاکم تم اپنی دنیا کی باتوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ پھر کبھی انہوں نے اعلان کیا کہ دین ہے ایسا کونسا پیچیدہ معمہ جس کے حل کرنے کے لیے ابو حنیفہ، یا کسی غزالی و رازی کا دماغ و جانسوزی درکار ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں۔ مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ دَخَلَ الْجَنَّۃَ "جس کسی نے لا الٰہ کہہ دیا جنت میں داخل ہو گیا۔

یہ جتنی باتیں کہی گئیں، الفاظ کی حد تک سب درست تھیں لیکن ان الفاظ کے قالب پر معانی کا جو جامہ چڑھایا گیا، اسلامی تخیل کے نقش سے بالکل معرا اور سادہ تھا۔ اور اس پر جگہ جگہ اغراض فاسدہ کے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دین اور قرآن کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ عربی کا عالم ہو یا نہ ہو اُسے سمجھ سکتا ہے اور اس کے احکام معلوم کر سکتا ہے۔ اس لیے علمار کا جو وصف ما بہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے وہ ایک بے بنیاد چیز ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علمار اسلام کی ایک جماعت حقہ سے نفرت دلا کر کس اطمینان خاطر کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

دراصل یہ ہے تاریخ اس طرح کے پروپگنڈے کی، اور جو کچھ یہ کہا جا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ ایک نوائے قدیم کی صدائے بازگشت ہے۔ جو کچھ دنوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی، مگر اب بعض مصالح کی خاطر سیاست کے حُدی خواں نے پھر اس نغمہ کارواں کو گانا شروع کر دیا ہے۔

آج ہم یہ مضمون یہیں ختم کر رہے ہیں اور آیندہ پرچہ میں انشاء اللہ اصل مسئلہ پر سیر حاصل کلام کرینگے اور بتائینگے کہ قرآن کے آسان ہونے کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا قرآن بغیر سنت کے پورے طور پر سمجھ میں آ بھی سکتا ہے؟

پچھلے دنوں علامہ سید سلیمان ندوی ظلہم کسی ضرورت سے دہلی تشریف لائے تھے، آپ نے بڑا کرم فرمایا کہ "ندوۃ المصنفین" کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشی موصوف انتہائی بے تکلفی اور خوش دلی سے رفقائے ادارہ کے ساتھ مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات فرماتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں یہ چیز بار بار نمایاں ہوتی تھی کہ آپ کو ندوۃ المصنفین کی اہمیت و ضرورت کا پورا پورا احساس ہے۔ ادارے کے طریق کار کے متعلق آپ نے بعض نہایت ہی مفید اور قیمتی مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ ایک نامور اور کامیاب مصنف کے وسیع تجربوں سے اس تھوڑی سی فرصت میں جو کچھ استفادہ کیا جا سکتا تھا کیا گیا۔ یہ پُرلطف مجلس نماز جمعہ کے بعد سے مغرب تک قائم رہی تمام کارکنان ادارہ مولانا کی اس کرم گستری کے دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہیں۔

مولوی عبدالصمد صارم سیوہاروی نے پہلے دیوبند میں علوم اسلامیہ کی تکمیل کی، پھر مدرسہ فتحپوری دہلی میں داخل ہو کر مولوی فاضل پنجاب کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ اب چند ماہ سے مصر میں مقیم ہیں جامع ازہر میں تعلیم پا رہے ہیں۔ عربی ادب کا ذوق شروع ہی سے ہے۔ اُن کے والد ماجد قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ انہوں نے شاہ فاروق کی مدح میں ایک عربی قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا جس کو پسند کیا گیا، اور اسی سلسلہ میں مصر کے اخبار البلاغ نے ۸ اگست کی اشاعت میں آنعزیز کی تصویر شائع کی مصر کے ایک پروفیسر نے انکی کتاب تاریخ تفسیر کی بھی تعریف کی ہے۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آنعزیز اپنے ذوق علم و ادب کی تکمیل کر کے بخیریت ہندوستان آئیں اور اپنے مذہب کی روش از بیش مفید خدمات انجام دے سکیں۔

اسلام کا نظریہ اجتماع

عقیدۂ توحید کا مقصد وحید

از مولانا حامد الانصاری غازی

تاریخ کے قدیم ترین زمانے سے لے کر اس وقت تک یہ حقیقت، حقیقت کی صورت میں تسلیم کی گئی ہے کہ بنی نوع انسان کی تنظیم انسانی زندگی کے اجتماعی میلان کی غایت طبعی ہے۔ دنیا میں مذہب کی غایت ہمیشہ سے یہی تنظیم رہی ہے اور سلطنت کا نصب العین بھی اسی غائت سے وابستہ رہا ہے۔ اسلام جو اپنے ظہور کے وقت سے سچائی کے ساتھ اس امر کا مدعی رہا ہے کہ وہ آخری اجتماعی مذہب ہے انسانی تنظیم کے اس رجحان کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

اسلام نے دنیا کو جس ایک کلمہ کی طرف دعوت دی ہے وہ کلمۂ توحید ہے اور اس کا مقصد ایک ایسے اعتقاد راسخ کا پیدا کرنا ہے جو تمام انسانوں کے معتقدات کا مرکز بن سکے۔ کلمۂ اسلام کا ایک ہونا اور اس کلمہ میں خدا کے ایک ہونے پر زور دینا، تمام دنیا کی تقسیموں سے انکار کر کے انسان کے دل و دماغ کو ایک عقیدہ پر جمع کر دینا اور بشری ذہنیت کے لیے ایک اصل کو پیش کر کے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کے اعلان کے ساتھ وَلَا تَفَرَّقُوْا کا حکم دینا، اور ایک قوی اسلوب سے یہ تعلیم پیش کرنا کہ اجتماعی زندگی کے تمام عناصر ترکیبی ایک رشتۂ محکم سے وابستہ ہو جائیں، اور الگ الگ حصوں میں متفرق اور منقسم نہ ہوں صاف طور پر اسلام کے امتیازی شرف کو ظاہر کر رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام جس مطمح نظر کو دنیا کے سامنے قوت کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے

وہ خدائے واحد کے نام اور توحید کے اصول پر دنیا بھر کے انسانوں کی ایک ایسی وحدت کا بروئے کار لانا ہے جو اپنی غایت کے لحاظ سے عالمگیر تنظیم کے قدرتی نصب العین کو تقویت پہنچا کر مکمل صورت میں تمام دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔

عالمگیر اتحاد اور بین الاقوامی تنظیم

پانچویں صدی قبل مسیح کے یونانی مقننین اور چوتھی صدی قبل مسیح کے رومی علمائے قانون کے زمانہ سے لے کر نئی روشنی کے اس دستوری دور تک اجتماعیات کے جس قدر بنیادی نظریے ہمارے سامنے آچکے ہیں، اسلام نے ان کے مقابلہ میں حکمت عملی کے اعتبار سے بالکل جداگانہ راہ اختیار کی ہے۔ اگر خیال وعمل کے مرکز اتصال سے یقین کی منزل پر پہنچ کر غور کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام کا مقصد ایک ایسے عظیم الشان اجتماع کو بروئے کار لانا ہے جس کو حقیقی معنی میں بغیر شک وشبہ نظری کہا جا سکے۔ اسلام اس عظیم مقصد کو توحید کے بدرست عقیدے کی قوت سے حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں ایک ایسے اسلوب سے دنیا کی رہنمائی کرتا ہے جس کی نظیر اس زمانہ کے دوسرے مذاہب پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

عقیدۂ توحید کا مقصد ہے دنیا کا اتحاد اور دنیا کے افراد کا اتحاد! اور اتحاد کے معنی ہیں کہ اس دنیا کا ہر فرد ایک ہی تصور کے تابع ہو، اپنے تئیں ایک ہی کُل کا جزو سمجھے اور ایک ہی مرکز وجود کو واجب الوجود قرار دے۔ نوع انسانی میں اندرونی تقسیمیں ہو سکتی ہیں اور خدائے واحد کی قدرت کے ماتحت ان تقسیموں کی قدرتی بنیادوں کو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن توحید کی رُو سے یہ تمام تقسیمیں جو دنیا کے کاروبار، دنیاوی سرگرمیوں اور روزانہ کی مصروفیتوں کا ناگزیر نتیجہ ہیں، ایک مرکز وحدت میں گم اور انسان کے مختلف رجحانات کو سکون روح کی منزل پر پہنچا کر ایک خدا کے نام پر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ توحید کا مقصد خود توحید ہے۔ افراد کی

توحید، اقوام کی توحید، نسلوں کی توحید، قبیلوں کی توحید، ملکوں کی توحید، سلطنتوں کی توحید، قدیم و جدید مذاہب کی توحید، سلطنتوں کے نئے پرانے نظریوں کی توحید، اعمال کی توحید، آمال یعنی اُمیدوں اور آرزوؤں کی توحید۔ پوری قوت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ توحید یا تو ایک دعویٰ ہے جو بغیر دلیل قابلِ قبول ہے یا پھر ایک ایسا دعویٰ ہے جو خود ہی دعویٰ بھی ہے اور خود ہی دلیل بھی۔

دنیا میں ہمیشہ سے اقرار اور انکار کی دو قوتیں کام کر رہی ہیں جہاں توحید کے عقیدے کا دنیا نے اقرار کیا ہے وہاں دنیا کے انسانوں نے اس عظیم اور موثر عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار بھی کیا ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان غور کرے کہ دنیا کا اتحاد اور عالمگیر اتحادِ انسانی تمدن کی بقا کے لیے ضروری ہے تو وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کی عام تنظیم اور انسانی ناموس کی یکجہتی کے لیے عقیدۂ توحید کی مرکزی حیثیت کا قبول کرنا ہی انسانی نجات کے لیے آخری اور واحد چارۂ کار ہے۔

سچ پوچھیے تو اسلام کی تعلیم کی رو سے خدا کو حاضر و ناظر جاننے اور ایک ماننے کے یہ معنی ہیں کہ یہ مان لیا جائے کہ آزادی، مساوات، انصاف اور مذہبی عقیدے کی بنیاد پر دنیا کے نظام کی بنیاد قائم ہے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ ہماری تمام سرگرمیوں کے لیے ایک تنظیم لابدی ہے، یہی توحید ہے اور یہی کلمۂ توحید کا مقصد و منشاء۔ لاالٰہ الا اللہ اسی مرکزی جامعیت کا قالب ہے اور ان الحکم الا للہ اسی جامعیت کی روح پہلا کلمہ قالبِ توحید ہے اور دوسرا روحِ توحید۔ توحید کی اصل یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور روح یہ ہے کہ خدا ہی اس تمام کائنات میں تنہا متصرف اور غالب ہے (واللہُ غالبٌ علیٰ أمرہٖ) ایک موحد مسلمان کو اُسی کے سامنے جھکنا چاہیئے، اسی کے نام کا کلمہ پڑھنا چاہیئے، اسی کے لیے زندہ رہنا چاہیے اور اسی کے دین کی خدمت کی راہ میں جان دینی چاہیے اسی کو اپنا واحد حکمراں اور فرمانروا تصور کرنا چاہیے اور اُسی کی ذات کو اپنے اسلام و ایمان کا مرجع

اور غور سمجھنا چاہیے۔ قرآن حکیم اس نکتہ کو کس قدر اچھے الفاظ میں پیش کرتا ہے

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا — تمہارا خدا خدائے واحد ہے (جھکو تو) اُسی کے سامنے جھکو۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کی تصریحات

آٹھویں صدی ہجری کے شہرۂ آفاق امام، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ جو اپنے عصر میں اسلامی اجتماعیات کے سب سے بڑے شارح تھے، اسلام وایمان کے اسی ضابطے کی تشریح کرتے ہوئے توحید خالص کی تفسیر کرتے ہیں۔

الاسلام ھو الاستسلام للّٰہ وحدہٗ۔ ولفظ الاسلام یتضمن الاسلام و یتضمن اخلاصہ للّٰہ۔ المسلم ھو المستسلم للّٰہ۔ فمن لم یستسلم لہٗ لم یکن مسلماً و من استسلم لغیرہ کما یستسلم لہٗ لم یکن مسلماً ومن استسلم لہٗ وحدہٗ فھو المسلم

(النبوات صفحہ ۶۴)

اسلام کیا ہے؟ صرف ایک اللہ کا ہو جانا۔ اسلام کا لفظ بجائے خود اسلام کی تفسیر ہے، اللہ پر اسلام لانا اور اللہ ہی کے لیے خالص ہو جانا اسلام ہے۔ مسلمان وہ ہے جو اللہ کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز تسلیم کرے جس کا یہ عقیدہ نہیں وہ مسلمان نہیں۔ جو شخص اسی طرح دوسروں کو اپنی زندگی میں موثر مانتا ہے جس طرح اللہ کو یا اللہ کے علاوہ کسی شی کے سامنے جھکتا ہے تو اُس کا مسلمان ہونا معتبر نہیں ہے، ہاں وہ شخص جو توحید خالص پر ایمان رکھتا ہے اور تنہا ایک خدا کو مانتا ہے اُسی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے اور یہ اُمید کرے کہ دوسرے اُس کو مسلمان کہیں گے۔

علامہ موصوف کی اس تشریح وتعبیر کا ماخذ قرآن حکیم کی حسب ذیل آیتیں ہیں:-

(۱) بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (لاریب جو شخص محض لوجہ اللہ اسلام لایا، اور وہ محسن ومخلص بھی ہے، وہی اپنے پروردگار کے انعام اور اجر کا مستحق ہے)

(۲) وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔

(جو نیت خالص کے ساتھ صرف ایک خدا پر ایمان لے آیا ہے، اور وہ ابراہیمؑ کے مذہب حنیف اور ملت ابراہیمی کے نظام اجتماعی کا پیرو کار بھی ہے، اسد اللہ وہ اپنے مسلک اور مذہب کے اعتبار سے کتنا اچھا اور کیسا مخلص ہے)

(۳) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام (جس دین کو اللہ نے مستند قرار دیا ہے وہ صرف اسلام ہی)

(۴) ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یہی محکم اور قائم و دائم رہنے والا مذہب ہے)

(۵) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دین اور مذہب کا خواہشمند اور طالب ہوگا، اس کی یہ طلب ہرگز قابل قبول نہ ہوگی۔

چونکہ اسلام کا مقصد دنیا بھر کی توحید ہے اس لیے اس کا اولین کام یہ ہے کہ وہ تمام دنیا کو مذہبی جمعیت کے ایک دائرہ پر جمع کر دے۔ اس مقصد کے اعلان کے بعد قدرتی طور پر ایک مذہب کے علاوہ کسی مذہب کو زندگی کی نمودگاہ میں نمود و ظہور کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ عقیدۂ توحید کی کامیابی کا پہلا مرکز افکار کی توحید ہے اور افکار کی توحید اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک دنیا کسی ایک مذہبی عقیدہ پر مجتمع نہ ہو جائے۔

علامہ ابن تیمیہ توحید کے لفظ کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

اَلتَّوْحِیْدُ الَّذِیْ جَاءَتْ بِہِ الرُّسُلُ	رسولوں نے دنیا کو جس عقیدۂ توحید کی طرف دعوت دی ہے
ھُوَ عِبَادَۃُ اللّٰہِ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ	اُس کے معنی یہ ہیں کہ خدائے وحدہ لاشریک کی پرستاری
وَتَرْکُ عِبَادَۃِ مَا سِوَاہُ فَاِنَّ التوحید	کی جائے اور دنیا کی ہر دوسری چیز کو پوجنا چھوڑ دیا جائے
یَتَضَمَّنُ محبت اللّٰہ وَحْدَہٗ	کیونکہ توحید جب ایک موثر اور محرک کی صورت میں نظام عالم
(النبوات)	پر متصرف ہوتی ہے تو تمام محبتیں سمٹ کر صرف ایک خدا کی
	ذات میں جمع ہو جاتی ہیں۔

انسانی تخلیق کا اجتماعی مقصد

قرآن حکیم کی آیتوں کا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا وسیع مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالٰی نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور سیرت و کردار کے اعتبار سے حسن و کمال کا نمونہ بنایا ہے۔ انسان دنیا میں خدا کا جانشین، خدا کا مامور خلیفہ، اور امامت و حکومت کے ایک خاص خدائی نظام کے تابع ہے۔ جب خدائے تعالٰی نے روزِ ازل میں انسان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو اُس کے قدرتی تصرفاتِ تخلیق کا یہ عنوان، ایک عظیم و جلیل دنیا کی تخلیق خود انسان کے اپنے شخصی مطمع نظر سے بھی کچھ کم عظیم الشان عزم نہ تھا۔ فرشتے خدا کے عرشِ سلطنت کے سامنے اپنی پاکی نکوکاری اور بزرگی کی نمائندگی کر رہے تھے کہ خدا کی مشیت نے ایک اہم اعلان فرمایا:- اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیفَۃً "میں زمین میں اپنا مامور اور خلیفہ بنانے کا فیصلہ کرچکا ہوں"۔ اس اعلان کے فوراً بعد جو فرمان اور حکم انسان کو ملا وہ یہ تھا۔ اِھْبِطُوْا مِنْھَا جَمِیْعًا "اے افرادِ انسانی اجتماعی شان سے زمین پر اُتر جاؤ"۔

انسان کی پیدائش کا یہ عنوان صاف بتا رہا ہے کہ اس کی آمد جس اجتماعی شان سے ہوئی ہے اس کی دنیاوی زندگی میں وہی اجتماعی وحدت قائم اور برقرار رہنی چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی وحدت اس وقت تک ظاہر نہیں ہوسکتی جب تک ایک ایسا مرکزی تصور نہ ہو جس پر اس وحدت کے افراد جمع ہوسکیں۔ اسلام اللہ کے وجود کو مرکزِ وحدت قرار دیتا ہے اور قرآن و حدیث کی رو سے دنیا کی تمام تحریکوں اور سرگرمیوں کو اللہ ہی کے نام سے وابستگی ہے اور اسی سے نسبت حاصل ہے۔ دیکھیے قرآن میں اس نسبت کو کس کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا۔ علم و آگاہی کی بات یہ ہے کہ اللہ ہی کائناتِ ارضی کو موت کے بعد زندگی کی شادابی عطا کرتا ہے۔

۲۔ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۔ (یقیناً اللہ ہی ہے جسے (آنے والے وقت) قیامت کا علم ہے)

۳۔ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۔ اللہ کا حکم ادھر ہوتا ہے اور اُدھر پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۔ اللہ کا حکم اٹل ہے اور اُسی کی قدرت سب کے لیے مقدر ہو چکی ہے یعنی جو بات اُس کے یہاں طے ہو چکی ضرور ہو کر رہیگی۔

۵۔ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۔ اللہ کا وعدہ سچا، ثابت اور مبنی برحق ہے۔

۶۔ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۔ اللہ کا نام آئے تو اُس کی طرف گرمجوشی سے دوڑ کر جاؤ۔

۷۔ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۔ (اپنی معاشرت اور معیشت کی تمام ضرورتوں کو مانگو تو اللہ ہی سے مانگو)

کلام مجید کی یہ تمام آیتیں خود اپنی شارح ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ خَيْرُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ ۔ اللہ کا کلام بہترین کلام ہے۔ اس حدیث پر ہمارا ایمان ہے۔ مذکورہ آیات میں معیاری اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اسلام انسانی ناموس کو اللہ کے نام پر اتحاد و ترقی اور اصلاح و ارتقاء کی دعوت دیتا ہے۔

اسلام اور انسانی وحدت

اگرچہ اسلام کے اولین دور میں اجتماعی مسائل کو پیش کرنے کا جو طریقہ تھا اِس زمانہ کا طریقہ اس سے مختلف ہے تاہم اسلامی زندگی کی ابتدائی صدیوں میں علمائے اسلام نے جن اجتماعی اصول کو پیش کیا ہے اس زمانہ کے مسلمان علمائے اجتماعیات نے انہی کو بدلے ہوئے حالات میں زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہمارے دور کے مشہور اہل قلم اور سیاست داں عالم علامہ فرید وجدی اسلام کے اجتماعی نظریہ کو ایک پرجوش وکیل کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اسی فکری قوت کی امداد سے اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ان الاسلام حق، وبکل دلیل دین خالد	حق یہ ہے کہ اسلام ایک حجت ہے اور ہر دلیل کے اعتبار سے ایک
وقد نادی بکل اصول العلیا التی تحلہ	عام اور ہمیشہ باقی رہنے والا مذہب ہے۔ اس زمانہ کے وہ تمام اعلیٰ اور بلند
ھذہ المکانۃ عند الاحاد والجماعات	اجتماعی نظریے جن پر دنیا کی جماعتیں اور افراد آکر ٹھہر گئے ہیں اسلام
فقد دعا الی الوحدۃ الانسانیۃ	ان پر ہر اعتبار سے پورا اُترتا ہے۔ اسلام نے تمام دنیا کو ایک عام
العامۃ ومحق ما کان بین الشعوب	وحدت اور نظم انسانی سوسائٹی کی طرف دعوت دی ہے اور ان
من فوارق القومیات واوھام	تمام تفریقوں اور تقسیموں کو مٹا کر رکھ دیا ہے جو قومیتوں طبقوں
الطبقات الاجتماعیۃ وقرران اصل	اور اونچ نیچ ذاتوں کی شکل میں نظام دنیا کے لیے ہلاکت کا باعث
الادیان واحد وان الخلافات التی	بنی ہوئی تھیں۔ اسلام کا اعلان ہے کہ تمام مذاہب کی ایک اصل
ینا عدھا بینھا انما سببھا	ہے اور وہ خود اسلام ہے۔ ہم تاریخ میں مذاہب کا جو اختلاف دیکھتے
بغی قادیھا فھم الذین خلقوھا	ہیں وہ اصلاً نہیں بلکہ وہ ان مذہبی پیشواؤں اور سرداروں کی
لمصلحتھم الذاتیۃ۔	کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنی ذاتی مصلحتوں کو امام در
	رہنما بنایا اور ایک خدائی نظام اور ایک مذہبی اصل کو شیرازہ بندی
(الاسلام دین عام خالد صفحہ ۱۲۶)	کے قدرتی مرکز سے علیحدہ کر دیا۔

علامہ وجدی نے ان موثر الفاظ میں اسلام کے جس نظریۂ اجتماع کو پیش کیا ہے اُس کا مرکزی نقطہ وہ مذہبی وحدت ہے جو خدا کے وجود اور خدا کی وحدانیت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں بھی انسانی زندگی سے بحث کی گئی ہے وہاں انہی دونوں باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

انسانی زندگی اور اس کا اقتدار اعلیٰ

توحید کا عقیدہ قرآن حکیم کی تعلیم کے لحاظ سے ایک اجتماعی اصل ہے۔ ذرا بصیرت کی نظر سے دیکھیے کہ اس کے اظہار کے لیے کتنے پیرایے اختیار کیے گئے ہیں۔ کلمۂ توحید ہی کو لیجیے

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ میں تمام کائنات کی قوتوں کی نفی اور اللہ کے وجود کے اقرار کے بعد اِنِ الحکمُ اِلَّا لِلّٰہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تمام دنیا میں واحد آمر ہے اور اللہ ہی کائنات عالم کی تمام قوتوں کا مالک و مختار ہے۔ قرآن حکیم اسی اعلان کو طرح طرح ادا کرتا ہے۔ اگر ایک جگہ اس حقیقت کو ایک صورت سے پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ط تمام قوتوں کا اجتماعی مرکز اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ ہی زندگی کا اقتدار اعلیٰ ہے تو دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ اللہ ہی بجائے خود غالب اور مقتدر ہے کسی ایک مقام پر خدا کی جلالت اور بادشاہی کا ذکر ہوتا ہے تو پیرایۂ بیان یہ ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (مائدہ)	اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے حکومت کرتا ہے۔
وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ (رعد)	اللہ دنیا پر حکم فرما ہے اور اس کے حکم پر کوئی گرفت کرنیوالا نہیں۔
لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا	اللہ تعالیٰ اپنے حق حکومت میں وحدہٗ لاشریک ہے۔

اور کسی دوسرے مقام پر خدا کی عظمت اور قدرت، شوکت اور سطوت۔ کبریائی اور جلالت کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو اظہار و ادا کا طریقہ یہ ہوتا ہے۔

۱۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (الطلاق ۱)	ہر شے کے لیے ایک اصول، ایک اندازہ اور ایک معیار مقرر کیا گیا
۲۔ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ (القمر ۳)	ہے۔ اور یہ معیار اللہ کے تصرف ہی کا نتیجہ ہے۔
۳۔ وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِمِقْدَارٍ (الرعد ۱)	
۴۔ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ (الرعد ۶)	اللہ چاہتا ہے تو مٹا دیتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے نقش وجود کو قائم کر دیتا ہے۔ اللہ ہی ہے جس کے پاس علم و حکمت اصلاح و اخلاق کی اصل اور مستند کتاب ام الکتاب ہے۔
۵۔ وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ (القصص)	تیرا پروردگار مختار ہے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے

عقیدۂ توحید کی رو سے انسانی فکر سب سے پہلے جس بصیرت سے فیضیاب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کا ایک نظام ہے اور وہ نظام ایک عالمگیر تنظیم کی حیثیت سے کائنات کی ہر شئے پر حاوی ہے اور انسانی زندگی کی تمام مصروفیتوں اور روزانہ کے کاموں پر غالب اور متصرف ہے۔ اس نظام کا ایک مرکز ہے اور یہ مرکز ہر شئے سے بالا و برتر ہے اور اپنی مرکزی قوت کے لحاظ سے اپنے تمام ماتحت عناصر ترکیبی سے یکساں تعلق رکھتا ہے۔ مرکز کے وجود کو ماننا، یہ تسلیم کرنا کہ وہ ایک ہے۔ اور اس کے ایک ہونے پر یقین لانا، اور اس یقین کو آخری درجہ تک اور تصور کی آخری حد تک شک و شبہ سے علیحدہ رکھنا عقیدۂ توحید کی اصل اور اصل توحید کی تعبیر کا صحیح طریقہ ہے۔ خدا کو ماننا، ایک ماننا اور اس کی جملہ صفات کے تمام پہلوؤں کو تسلیم کرکے ایک عقیدہ پر جبین عقیدت کو خم کرکے پھر دوبارہ اُٹھانے کی جرأت نہ کرنا یہی توحید کا مقصد ہے اور یہی توحید کا منشاء

عقیدۂ توحید کے تین اجتماعی پہلو

شیخ محمد سفارینی عقیدۂ توحید کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اِعلم اَنَّ التوحید ثلاثۃ اقسامٍ الربوبیۃ والٰہیۃ وتوحید الصفات۔ فتوحید الربوبیۃ ان لاخالق ولارازق ولامحی ولاممیت ولاموجد ولامعدم الا اللہ تعالیٰ۔	توحید کے تین پہلو ہیں اول یہ کہ خدا اپنی پروردگاری کے اعتبار سے یکتا ہو، دوسرے یہ کہ اپنی وحدانیت کے لحاظ سے معبود واحد ہو، تیسرے یہ کہ اپنی قدرت اور اپنے صفات کے لحاظ سے واحد ہو۔ پروردگاری میں خدا کے یکتا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات کے علاوہ نہ کوئی خالق ہو نہ رازق، نہ زندگی دینے والا نہ موت کو بھیجنے والا نہ دنیا کو ایجاد کرنے والا اور نہ اُس کو معدوم کرنیوالا۔
وتوحید الالٰھیۃ اِفرادہ تعالیٰ بالعبادۃ والتالہ والخضوع و	خدا کو اس کی خدائی میں معبود یکتا تسلیم کرکے عقیدۂ توحید کو قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ یہ اعتراف کیا جائے کہ تنہا خدا کی

الاول۔ والحب والافتقار والتوجہ الیہ تعالیٰ	ذات ہی پرستاری اور عبادت کے لائق اور معبود ہونے کی سزاوار ہے جبینوں کو اسی کے سامنے جھکنا چاہیے۔ دلوں کو اسی کی عقیدت میں غرق ہونا چاہیے۔ روحوں کو اسی کی محبت سے رس حاصل کرنا چاہیے۔ ہماری سرگرمیوں کو اسی اور صرف اسی کا محتاج ہونا چاہیے اور ہمارے کاموں کے لیے اسی کی ذات مرجع ہونی چاہیے۔
وتوحید الصفات ان یوصف اللہ تعالیٰ بما وصف بہ وبما وصفہ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم	توحید کا تیسرا پہلو صفات سے متعلق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ خدا اپنی صفات میں منفرد ہے اور خود اُس نے اور اُس کے رسول نے جن صفات کی تصریح کی ہے وہ حق اور سزاوار حق ہیں۔

علامہ محمد سفارینی نابلسی بارہویں صدی ہجری کے علماء میں بہت بڑے متکلم اور پایہ کے عالم تسلیم کیے گئے ہیں۔ عقیدۂ توحید کے متعلق اُنہوں نے جن تین پہلوؤں کو پیش کیا ہے درحقیقت وہ ایک ہی حقیقت کا مظہر ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے خود قرآن اس حقیقت کے اظہار کے لیے کیسے کیسے نئے، اچھوتے اور زیبا عنوان پیش کرتا ہے، اور انسان کے خیال کو ہر طرح کی گمراہیوں، ہر قسم کی پیچیدگیوں اور ہر رنگ کے اختلاف سے ہٹا کر کس طرح ایک مرکزِ اجتماع پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (آل عمران)	آسمان کی بلندیوں اور زمین کی پستیوں کے درمیان جتنی کائنات آباد ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ ہی تمام سرگرمیوں کا مرجع و مرکز ہے۔
لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (بقرہ)	مشرق اور مغرب اللہ ہی کا ہے۔
لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (منافقون)	آسمان اور زمین کے خزانے۔ تمام سرمایا اور ساری دولت اللہ ہی کے لیے ہے۔
لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (فتح)	آسمان اور زمین کی فوجیں اللہ ہی کا لشکر ہیں۔

[1] شرح عقیدۃ السفارینی جلد اول صفحہ ۱۰۹ مصر۔

كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ	سب ایک خدا کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔
وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (ھود ۱۰)	زمین پر ایک بھی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کا ذمہ دار خدائے واحد نہ ہو۔
إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ	یقیناً اللہ ہی روزگار دینے والا اور استوار طاقت کا مالک ہے۔
ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ۔ (الزمر، رکوع ۱)	یہ ہے تمہارا پروردگار جو تمہاری زندگی کی سلطنت کا تاجدار ہے۔ وہی معبود ہے اور اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

قرآن حکیم کے ان جواہر پاروں میں خدا کی عظمت اور جلال وکبریائی کے متعلق دلپذیر انداز میں جس دل نشین مقصد کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی سے توحید کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام آیتیں ایک ہی صداقت کی نشانیاں ہیں اور وہ صداقت ہے لیس کمثلہ شئ۔ خدا ایک ہے کوئی اس کا ثانی نہیں کوئی اس کی مثال نہیں۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہ ایک ہے اور ساری کائنات کو ایک مرکزی تنظیم کی صورت میں اپنے تصرف میں رکھنا چاہیے۔

آخری قانون اور آخری اُمت

توحید کی اعتقادی اصل سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ ہم زبان سے خدا کے ایک ہونے کا اقرار کریں بلکہ اس نتیجہ کی خصوصیت ایک ایسے حقیقی تصور کی تخلیق ہے جس کے ماتحت بنی نوع انسان کی عالمگیر سرگرمیوں کے لیے ایک عالمگیر مرکز پیدا ہو سکے۔ خواہ یہ سرگرمیاں مذہبی ہوں یا سیاسی، اخلاقی ہوں یا اصلاحی، معاشی ہوں یا تمدنی، مالی ہوں یا معیشتی، توحید کے معنی ہیں ایک مذہب اور ایک عقیدے کی حاکمیت عامہ، آخری قانون الٰہی کی بالادستی ایک آخری شارح قانون اور عظیم وجلیل پیغمبر کی پیروی اور ایک ایسی آخری عالمگیر اُمت کا ظہور جس میں تمام قومیتوں کا ضم ہو جانا مقدر ہو چکا ہے۔

نویں ذی الحجہ ۱۰ھ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی نمرہ میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ انسانوں کے اجتماع میں جو آخری خطبہ دیا تھا اُس کو تاریخ اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس خطبہ میں حضور نے آخری تین اجتماعی نکتے پیش فرمائے تھے۔

۱۔ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَالَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ۔ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ کِتَابَ اللّٰہِ	میں تمہارے ہاتھوں میں ایک چیز چھوڑ کر چلا ہوں کہ اگر تم اجتماعی شیرازہ بندی کے ساتھ اس پر جمع ہو گئے تو تم کو کوئی شے راہ راست سے ہٹا نہیں سکیگی۔ یہ چیز اللہ کی کتاب (خدا کا قانون) ہے
۲۔ ایھا الناس انہ لا نبی بعدی	لوگو! یقین اور بصیرت کا پیغام یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور کوئی ایسا مذہبی مصلح اور پیغمبر نہیں جس کی دنیا کو ضرورت ہو۔
۳۔ لا امۃ بعدکم الا فاعبدوا ربکم[۱]	تمہارے اجتماعی نظام کے بعد نہ کوئی تمہارے نظام سے بہتر نظام ہے اور نہ کوئی اُمت، علم و آگاہی کو رہنما بناؤ اور اپنے پروردگار کی عبادت کو مقصد زندگی بنا کر زندہ رہو۔

اِن تینوں اجتماعی نکتوں میں جس اجتماعی اصل کی صراحت ہے اس سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن زندگی کی تمام منظم سرگرمیوں اور جملہ ضرورتوں کے لیے ایک جامع اور مکمل ضابطہ ہے۔ دوسرے یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک نسل انسانی کے اجتماعی رجحان کا آخری مرکز ہے۔ تیسرے یہ کہ قرآن کی رہنمائی اور حضور اکرم کے ظہور سے جو اُمت پیدا ہوئی ہے وہ دنیا کے اجتماعی تصورات اور انسانی تنظیم و تشکیل کے آخری مقصد کو مکمل صورت میں پیش کرتی ہے۔ مختصر طور پر یہ کہنا بجا ہے کہ کتاب اللہ کتابِ توحید ہے۔ رسول اللہ اپنی عدیم المثال پیغمبرانہ زندگی کے اعتبار سے رسولِ توحید ہیں اور امت اسلامیہ اپنی جماعتی تنظیم اور اپنی مضبوط جمعیت کے

[۱] معدن الاعمال عن ابی امامہ۔

لحاظ سے اُمت توحید ہے۔ کتاب اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت محمدی نے اپنے وجود اور ظہور سے دنیا پر کس قدر زبردست اثر ڈالا ہے اور کتنے عظیم الشان اجتماعی انقلاب کو رونما کیا ہے۔ اس کو صحیح طور پر معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اسلام کے ظہور سے قبل دنیا کی اجتماعی حالت کیسی تھی۔ انسانی نسل کا تمدنی شیرازہ کس طرح بکھرا ہوا تھا تصورات کی تفریق کی کیا صورت تھی ایک خدا کی جگہ خدا کی مخلوق کو کس کس طرح خدا بنا کر پوجا جاتا تھا پرستش کے کتنے طریقے تھے اور کیسے کیسے خلاف عقل عنوانات سے عناصر کو پوجا جاتا تھا۔ انشاء اللہ اشاعت آئندہ میں اسی موضوع کو پیش کیا جائیگا۔

تصحیح

گزشتہ اشاعت برہان کے "نظرات" میں ادارۂ معارف اسلامیہ کی خبر کے ذیل میں شمس العلماء مولانا عبدالرحمن صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی کا نام آیا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ ادارہ کا یہ اجلاس مولانا محترم کے زیر اہتمام نہیں بلکہ اینگلو عربک کالج کی مسلم ایسوسی ایشن کے تحت ہو رہا ہے۔ ہمیں اس غلط اطلاع پر افسوس ہے۔ قارئینِ کرام تصحیح فرمالیں۔

عراق و عجم پر ہندوستانی فن کا اثر

از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، لاہور

ہمارے محترم دوست مولوی محمد عبداللہ صاحب چغتائی اپنے علمی اور تحقیقی مقالات کی وجہ سے ہندوستان کی علمی سوسائٹی میں روشناس ہیں دو سال ہوئے کہ علمی تحقیق کے سلسلہ میں آپ پیرس تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے قیام میں آپ نے تاج محل پر ایک محققانہ کتاب فرنچ زبان میں لکھی جس کو وہاں کے ارباب علم نے بہت پسند کیا اور اسی سلسلہ میں آپ کو ڈاکٹری کی ڈگری اور ایک معقول رقم بطور انعام دی گئی۔ تھوڑے دن ہوئے کہ آپ ہندوستان واپس آگئے ہیں اور حسب سابق اپنی علمی تحقیقات میں مصروف ہیں "برہان" میں اشاعت کے لیے آپ نے مقالہ ذیل ارسال کیا ہے جو ایسٹرن آرٹ امریکہ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ ہم اُس کو شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی درخواست ہے کہ ہمیں اپنے دوست سے اس سے زیادہ کی توقع ہے۔ "س"

ہیروڈوٹس[1] نے دارائے اول بن ہسٹاپیز (Hystespes) (ولادت قریب ۴۸۵ھ و وفات ۵۲۱ ق م) کی فتح وادی اٹک کا حال لکھا ہے[2]۔ اور راجستان کے کتبات اس اطلاع کی

---

[1] Herodotus (۴۸۴ تا ۴۲۵ ق م) قدیم یونانی مورخ ہے بعض نے اس کو ابوالتاریخ کہا ہے اس نے ایشیائے کوچک، مصر و شام وغیرہ کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات کی بنا پر اپنی تاریخ لکھی۔ مترجم

[2] تاریخ ہیروڈوٹس ص۱۱ و ص۲۴۔

تصدیق کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی ہیروڈوٹس یہ لکھتا ہے کہ دارا دریائے اٹک سے آگے نہیں بڑھا۔ ایرانی اور عرب مصنفین دارا کا نام بیان نہیں کرتے بلکہ اٹک کی فتح کو گستاسپ سے منسوب کرتے ہیں جس نے اپنی حکومت اپنے ایک پوتے بہمن کے سپرد کردی تھی۔ اس ایرانی شہزادہ نے اٹک ڈیلٹا کے شمال میں ایک شہر بہمن آباد اپنے نام پر آباد کیا اور خود اپنے جد امجد کی وفات پر ایران واپس چلا گیا اور تخت نشین ہوا۔ بہمن کی وفات کے بعد اس کا لڑکا ساسن بہمن آباد گیا اور ایران کی حکومت اس کی بچی کے سپرد ہوگئی۔ یہ ساسن اردشیر ساسانیوں کا ابوالآبا تھا۔ جب عرب ۷۱۱ء میں پہلی مرتبہ وادی اٹک میں آئے، تو انھوں نے شہر بہمن آباد کو جو اس وقت موجود تھا، اپنا دارالحکومت بنالیا۔

ہندوستانی تہذیب نے ایران پر جو اثرات کئے ہیں اخمینی دور میں ہم کو ان کا سُراغ نہیں ملتا۔ اس وقت اخمینی دربار کی تہذیب جو قدیم مشرقی روایات کی وارث تھی اچھی طرح مستحکم ہوچکی اور نشوونما پاچکی تھی۔ اس بنا پر اسے کسی خارجی محرک کی ضرورت نہ تھی علاوہ ازیں کوئی ایسا اثر ہم تلاش نہیں کرسکے جو قبل اشوک اخمینی دور کے نشانات کے مشابہ ہو۔ یہ نشانات اول تو ملے ہی کم ہیں اور جو ملے بھی ہیں ان میں کوئی چیز مفید مقصد نہیں۔ اس کے برخلاف ایرانی فنون جن کی داغ بیل بہمن آباد میں پڑی انھوں نے قدیم فن بدھ مت اور دورِ اشوک کے فن کو بیحد فیضیاب کیا۔

سلوکس اور ہندوستان کے ہمعصر بادشاہوں کے درمیان کیا تعلقات تھے؟ اس سلسلہ میں ہمیں چندرگپت بانی خاندان موریا اور سلوکس نکوادر کے درمیانی تعلقات کا علم ہے کہ پہلے وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اور بعد میں دونوں متحد ہوگئے تھے اور یہ اتحاد اس واقعہ سے اور مستحکم ہوگیا کہ سلوکس نے ہندوستان کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ سلوکس نے اپنے داماد کو وہ صوبہ دیا تھا جو وادی اٹک اور ہندوکش کے درمیان تھا گویا زیادہ تر جدید افغانستان۔ یونانی میگستھنز نے سلوکس کے ایلچی کی حیثیت سے پاٹلی پتر کو اپنا مستقر قرار دیا جو چندرگپت کی جائے

سکونت تھی۔ اس نے اپنی تزک میں اس شہر اور دربار کی بہت مفید تفصیلات دی ہیں جس کے مشہور حصے اب بھی محفوظ ہیں۔ ہند سے ارشاسد کے تعلقات اُن تمغہ جات کے ذریعہ جن کی ایرانی اور ہندی خصوصیات واضح ہیں، ثابت ہوتے ہیں۔ مگر ارشاسیدی آثار کی کمی مشرقی ایران میں کسی اثر کے اثبات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح ساسانی دور سے قبل ہندی اثر ایران میں نہیں ملتا۔ اشوک کے درباری مذہب "بودھ مت" اور یونانی فن کے باعث شمالی ہند میں تہذیب و تمدن کو بہت فروغ ہوا۔ ساسانیوں کو مشکل سے رومیوں، بازنطینیوں اور عربوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے روکا۔ بہرام گور (۴۲۱-۴۴۲ء ق م) نے چاہا کہ پوشیدہ طور سے ہندوستان کا سفر کرے بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں آکر بہرام گور نے واسودیو کی لڑکی سے شادی کی تھی جس کی رہائش تمراپور میں تھی۔ اور واپسی پر ہندوستان سے بارہ ہزار ماہرینِ فن موسیقی و رقص اور دوسرے ماہرین فنون جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے، اپنے ہمراہ ایران لے گیا تھا۔[1]

اگرچہ نوشیرواں اور خسرو (۵۳۱-۵۷۹ء) کی مہمیں تاریخ سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں تاہم ہمارے سامنے معاصر مصنفین کی بہت سی علامتیں ہیں جو اُس عہد کے ہندوستانی اور ساسانی بادشاہوں کے تعلقات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وشاپور کے دربار میں ایک ہندوستانی طبیب رہتا تھا۔[2] خسرو اوّل نے اپنے لیے پنچ تنتر (کلیلہ دمنہ) کو حاصل کیا جو دراصل ہندوستانی فہم و ادراک کی روشن دلیل ہے۔ اور اُسی کے زمانہ میں ہندوستان سے شطرنج آئی۔[3] پولکسیان (ایرانی پوروشیا) بادشاہ مہاراشٹر نے ایک ایلچی خسرو ثانی کے ہاں ۶۲۵ء میں مع تحائف کے بھیجا جو خسرو اور اس کے لڑکے کے لیے تھے۔[4] یہ تحائف ایک ہاتھی ایک تلوار، ایک سفید باز اور ریشم کے کپڑے پر مشتمل

[1] یہ تعداد جیسا کہ عموماً مشرقی قصوں میں پایا جاتا ہے بہت مبالغہ آمیز ہے۔ [2] طبری مطبوعہ یورپ ص ۸۹۹ [3] تاریخ راج ترنگنی مطبوعہ پیرس ص ۶۴۲۔ [4] میں نے غار ہائے اجنتا کے نقوش کو دیکھا ہے۔ یہ ایلچی اجنتا کی نقاشی میں عیاں ہے اور فن کے اعتبار سے بالکل ایرانی نژاد ہے۔ بلکہ تمام ماحول ہی ایرانی ہے اور بعض محققین کی رائے ہے کہ اجنتا کے کام میں ایرانی

تھے۔ اور خسرو کے جانشین شیرویہ نے ان کو وصول کیا۔ اس کے جواب میں ایران سے پلکسیان کے ارلے ۶۲۶ء میں ایک ایرانی ایلچی ہندوستان میں آیا جس کا ثبوت غار ہائے اجنٹا نمبر اول کے دیواری نقوش سے ملتا ہے جو بحالات موجودہ ایک عمدہ تصدیق ہے۔ تاہم ساسانی وفد میں ایران کے فن پر ہندوستان کا کیا اثر ہوا۔ اس کا ثبوت طاقِ بوستاں کے شکار کے کندہ مناظر سے ملتا ہے[1]۔ کندہ شدہ ہاتھیوں کے علاوہ جو محض ہندوستان سے جا سکتے تھے۔ فن کے اعتبار سے بھی یہ نقوش بہت سے ہندوستانی نشان ظاہر کرتے ہیں۔ اگرچہ متذکرہ نقوش کا یہ غیر منقطع مظاہرہ دراصل ایک ہی تصویر میں ایک ہی شکل کا بار بار تکرار ہے۔ ایک ایسا طریقہ تھا جو قبل ازیں اشوری لوگ عمل میں لاتے تھے۔ اور مغربی یونانی فن نے اسے اختیار کیا۔ ڈاکٹر ہیرزفیلڈ نے کہا ہے کہ یہ کندہ نقوش دراصل رنگین تھے[2] اور ان میں ساسانی نقش و نگار کی بہت کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔

ہم ان نقوش کو اپنے ذہن میں مصوری میں تبدیل کر دیں تو ہندی دیواری نقش و نگار کے ساتھ ان کی مشابہت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا گھوڑے پر سوار ہونا اور اس کے پیچھے ایک چتر بردار کا کھڑا ہونا۔ اجنٹا کی عام تصویر ہے۔ بادشاہ کے سر کے ارد گرد ہالہ کا ہونا (جو کسی حد تک مصور کیے گئے ہیں، اگرچہ وہ طباعت میں نمایاں نہیں ہیں) ساسانی فن میں ایک نئی چیز ہے۔ اور اجنٹا میں اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز صورتیں ہاتھیوں کی ہیں جو نہایت کاریگری اور عمدہ طریق سے ڈھالی گئی ہیں۔ یہ صورتیں یقیناً ہندوستانی صناعوں کی صنعت ہیں جو ان جانوروں میں رہنے سہنے کے باعث اس بات کی صلاحیت رکھتے تھے کہ ہاتھیوں کی خاص خاص صفات کو بہتر طریقہ پر نمایاں کر سکیں۔ اس کے علاوہ غول کے

---

[1] یہ کتاب میں مطبوعہ ہیں۔　[2] سفیر ایشیا مطبوعہ برلن۔ ص ۹۹۔

غول کو ایسا مصور کرنے کی قابلیت سانچی کے آثار سے ہمارے علم میں آتی ہے[1]۔

ایران وہند کے تعلقات و مراسم عربوں کی حکومتِ ایران کے زیر سایہ زیادہ بڑھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی اسلامی فتح محمد غوری کے عہد میں ہوئی جس نے ۱۱۹۲ء میں تھانیسر میں ہندوؤں کو شکست دی تھی۔ مگر مسلمان اس سے پہلے بھی اول صدی ہجری میں وادی اٹک اور صوبہ گجرات میں داخل ہو چکے تھے۔ اور پھر محمود غزنوی کے ماتحت بھی ہندوؤں سے ربط ضبط کا موقع ملا[2]۔ یہ دونوں مہمیں اسلامی ممالک کے لئے بہت ہی اہم تھیں۔ اول عراق کے لیے، دوسری خراسان کے لیے اور دونوں حالتوں میں ہندوستانی فن کا طوفان مغربی اسلامی دنیا تک پہنچا۔ اور اس کا اثر اسلامی فنون وثقافت پر ہوا جس کا اثر اب بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانہ میں دمشق اور بغداد دنیائے اسلام کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ ہندوستانی فن وثقافت نے اٹک کے ڈیلٹا کی راہ سے سمندر کے ذریعہ خلیج فارس تک اپنا راستہ بنایا۔ اس کے بعد محمود غزنوی اور بعد کی قوموں کے ماتحت تہذیب جدید نے افغانستان اور خراسان تک اپنی شاہراہ قائم کی۔

عربوں نے اس سے بھی بہت پہلے خلیفہ ثانی حضرت عمر کے زمانہ میں کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں قیام پذیر ہو جائیں۔ گجرات، سورت اور سندھ کے ساتھ تجارت کی غرض سے بصرہ قائم کیا گیا تھا حضرتِ عثمان نے وادی اٹک کی جستجو کا حکم دیا تھا۔ مزید فتوحات حضرت علی کے ماتحت ظہور میں آئیں۔ بنو امیہ کے عہد میں یزید اول اور عبد الملک کے زمانہ میں بھی

[1] تاریخ فرشتہ ترجمہ از برگز جلد اول۔ [2] یہ امر تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عام طور پر فاتح کا اثر مفتوح پر ہوتا ہے جس کے آثار آج تک ڈاکٹر ڈینیر کے بیان کے برعکس ملتے ہیں۔ مترجم۔
[3] یہ سب فنی خصوصیات ہزارہا سال قبل عراق، بازنطینی اور مصر کے فنوں میں پائی جاتی ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ یہاں سے براہِ ایران ہند میں پہنچیں نہ کہ ہندوستان میں پہلے سے تھیں اور پھر وہاں سے ایران میں گئیں۔ مترجم

قدرے عارضی کامیابی ہوئی۔ خلیفہ ولید کے زمانہ میں سندھ اور ہمسایہ ملک فتح ہو چکا تھا اور کچھ راجے مہاراجے باجگذار بنا لیے گئے تھے۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ کے بادشاہ کو مطیع کرلیا تھا۔ اور سندھ بہت زمانہ تک مسلمانوں کے ماتحت رہا۔ مسجدیں سب سے پہلے ملتان میں تعمیر ہوئی تھیں۔ ابن عمر تغلبی (قریب ۵۵۰ء) سندھ کا حاکم تھا[1]۔ اُس نے اپنا مقامِ استقرار جزیرہ کچھ اٹک میں بنا کر پڑوس کے قصبہ اروڑا کو اپنے لیے جائے رہائش قرار دیا جس کو منصورہ کہا جاتا تھا۔ ہارون رشید نے اپنے دوسرے بیٹے مامون کو خراسان، زابلستان، کابلستان، سندھ اور ہندوستان کے دیگر حصص مفتوحہ سپرد کیے۔ اس طرح ایک خاص مشرقی ہندوایران سلطنت قائم ہوئی جس پر سندھ کی اعلیٰ تہذیب کا اثر ہوا جو دراصل اٹک ڈیلٹا کا ایک صوبہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے ملک بہت جلد ہاتھ سے جاتے رہے لیکن سندھ خلیفہ متوکل علی اللہ (۸۴۷-۸۶۱ء) کے زمانہ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔

خلفاء عباسیہ کے ان دو دوروں میں ہندوستانی ثقافت کا جو اثر بغداد پر ہوا پروفیسر ڈوروڈ سکھاؤ نے ان دونوں میں فرق بتایا ہے۔ وہ اوّل تو خلیفہ منصور (۷۵۴-۷۷۵ء) کے زمانہ سے تطبیق دیتا ہے۔ جبکہ بغداد اور سندھ کے درمیان زبردست راہ و رسم تھی۔ اور ہندی فن و ادب کے قدم بغداد تک پہنچ چکے تھے اور عربوں نے علمی نظام نجوم سے واقفیت پیدا کرلی تھی۔ دوسرا دور ہارون رشید (۷۸۶-۸۰۹ء) سے شروع ہوتا ہے جبکہ برمکی خاندان کو فروغ حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بلخ سے بغداد میں عباسی حکومت کے بانی کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کا ایک بزرگ بودھ مت کے عبادتخانہ نو بہار بلخ میں واعظ تھا۔ بغداد میں برامکہ واقعی مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر ان کے کسی معاصر نے کبھی ان کے اسلام لانے کے متعلق زیادہ خیال نہیں کیا، اور نہ اُن کے اسلام کو کبھی خصوصیت کے ساتھ کوئی زیادہ اہمیت دی گئی۔ انہوں نے بغداد میں ہندوستانی اطبار کو بلایا اور اُن کو اپنے شفاخانوں کا مہتمم

---

[1] تاریخ ہند الیٹ ص ۴۴۲

[2] یہاں غالباً مصنف کو دھوکہ ہوا ہے۔ مترجم

بنایا، اور اُن سے ہندوستانی طب، عطاری، سمیات، فلسفہ، اور دوسرے علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا۔[1] پروفیسر سکھاؤ کے اس بیان پر ہم ابن ندیم کی کتاب الفہرست کے بیانات کا اضافہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ برامکہ مانوی مذہب سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اس طرح وسط ایشیا کی تہذیب مانوی کے لیے بغداد کے دروازے خود بخود کھُل گئے ہوں گے[2]۔ مسعودی کا بیان ہے کہ مامون کے ماتحت اس شہر کے لوگوں نے ایرانی، ہندی اور یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا[3]۔ اور اس زمانہ کے متعلق ابوالفدا، کا بیان بھی یہی ہے[4]۔ پروفیسر سکھاؤ کو حق ہے کہ بغداد کی ذہنی نشوونما پر ہندی اثر کو ثابت کرنے کے لیے اُن تمام کتابوں کے نام لکھے جن کے اس زمانہ میں تراجم ہوئے لیکن فنون کے میدان میں ہم ایسے خوش نصیب نہیں ہیں۔ اگرچہ منطقی استدلال سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ اثر محض ذہنی تہذیب تک ہی محدود نہیں تھا۔ ضابطۂ شریعت (یعنی مفتوح صوبوں پر کارگروں کا بھیجنا ضروری ہونا) ہندوستانی صوبوں پر بھی عائد تھا جو امویوں اور عباسیوں کے زیر اثر تھے۔ لیکن کسی ہمعصر مورخ نے اس امر کو مفید بحث نہیں سمجھا کہ ہندوستان کے فن تعمیر، اور فنون آرائش کا بغداد پر اثر کس حد تک ہوا۔ ہمارے وقت کی تاریخ کا اولین فرض ہے کہ ہم اپنے طریق تشریح سے حصص مشترکہ کو چن لیں۔ پہلے اس قسم کی کوشش جنرل ڈی میلی نے کی[5]۔ مثال کے طور پر اس نے بخارچہ اور شرفہ ہندوستانی اصلیت کے ثابت کیے ہیں جو مسلمانوں کے گھروں کی بناوٹ کے خاص ضروری حصے ہیں[6]۔ اسی طرح بغداد اور مصر میں عباسیوں، طولونیوں اور فاطمیوں کے دور میں لکڑی پر جو منبت کاری ہوئی ہے وہ بھی ہندوستانی فن سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ یہ درست ہے

---

[1] کتاب الہند۔ البیرونی۔ ترجمہ سکھاؤ　[2] مسعودی صفحہ ۴۸　[3] ابوالفدا، صفحہ ۵۲۹ / ۱۸۳
[4] فن تعمیر ہندو مشرق اقصیٰ میں۔ مطبوعہ پیرس　[5] یہ حصص تعمیرات پہلے سے ہی مصر میں پائے جاتے تھے، جبکہ ہندوستان میں ان کا کہیں وجود بھی نہیں تھا۔ البتہ مسلمان ہندوستان میں آئے تو ان چیزوں کو ساتھ لیتے آئے۔ اس سے قبل ہندوستان کا کوئی ایسا فن تعمیر ہی نہیں تھا جو ذکر کیا جائے۔ مترجم۔

کہ مصر میں تطلیوں کے زمانہ سے پہلے بھی منبت کاری پائی جاتی تھی، اگر وہ ہندوستانی اثر کے بغیر اس قدر بلند معیار تک مشکل سے ہی پہنچی ہوگی۔ لکڑی کے منبت شدہ دروازے جنہیں محمود غزنوی متھرا سے غزنہ تک لے گیا تھا۔ معاصرانہ حیثیت سے قدیم فن کے نمونے تھے[1]۔ اسی طرح قیروان کا منبر بغداد میں منبت ہوا جو بیشمار صنعت سنگتراشی کے نمونوں سے لبریز ہے[2]۔ مرکب تہذیب کو ثابت کرنے کے لیے ہم اس سے بمشکل سے ہی کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب تک کوئی شہادت اس امر کی نہیں ملی کہ اس کے اصل نمونہ کی اصلیت قدیم ہندوستانی منبت کاری سے ماخوذ ہے کیونکہ سندھ میں آج تک اس قسم کا نمونہ کبھی کسی نے نہیں پایا۔ اور اس کے برعکس بہت سے نمونے اسلامی کہے جا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے بہت سے زیبائشی نمونوں کی شناخت پر ہی اکتفا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ہندوستان نے ابتدائی فن اسلامی کو اپنی قدیم روایات ہنرمندی سے بڑی حد تک مستحکم کیا ہے[3]۔ مگر محض ہندوستان نے ہی نہیں، بلکہ بازنطینی اثر کو بھی ایک بڑی حد تک دخل تھا ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ دستکار لوگ اپنے اصول کو فوراً بدل دیتے تھے جب وہ غیر ملک میں کام کرتے تھے۔ اگرچہ خود کسی حد تک اپنی مقامی روایات پر بھی کاربند رہتے تھے[4]۔ یہ تمام ہنرمندی کی روایات نہیں جنہیں باہر سے لایا گیا چنانچہ منبر کی جالی کا کام ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم عربی گھروں کے بخارچوں میں پاتے ہیں۔ ڈی بیلی نے ثابت کیا ہے کہ یہ کام بھی ہندوستان سے لایا گیا تھا۔ بقیہ نمونوں کی تعداد جو عراق کے لیے مقامی بھی مقابلۃً اُس مختلف الانواع جالی سے کم

[1] یہ تاریخی اعتبار سے غلط ثابت ہو چکا ہے بلکہ مسلمانوں نے اپنا خاص انداز فن لکڑی کی منبت کاری میں پیدا کیا۔ اور محمود غزنوی کے زمانہ کا فن منبت کاری زیادہ تر عباسیوں اور ابن طولون کی منبت کاری کے نمونوں سے ملتا ہے۔ مترجم

[2] اسلامی فنون از ڈیمینڈ ۲۴۲۔ [3] کوئی خاص طرز فن جس نے اسلامی فن پر اثر کیا ہو بیان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ابتدا میں مسلمان بیرونجات سے متاثر ضرور ہوئے مگر انہوں نے اپنا طرز خاص اسلامی وضع کیا۔

[4] یہی حال اطالوی تعمیر کاروں کا تھا۔ اور اس سے تو ان کی ہمہ گیر جذبۂ فن کی شہادت ملتی ہے۔

"مترجم"

سے کم ہے۔ قیروان کا منبر ابتدائی دورِ عباسیہ کے لکڑی کے کام کا نمونہ ہے۔ اور وہ موجود ہے اس کے علاوہ کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔

مسلمانوں کی فتوحات کا ایک نیا دور دولتِ ترکیہ غزنیہ سے شروع ہوتا ہے سبکتگین (۹۷۶-۹۹۶ء) جو دراصل حکومتِ غزنیں کا بانی ہے اس نے خراسان اور شمالی ہندوستان پشاور تک مطیع کیا اور دوبارہ سلطنت ہند و ایران قائم کی جس کے باعث ہندوستانی تہذیب ایران میں مداخلت کرنے سے نہیں رک سکتی تھی۔ سبکتگین کے لڑکے محمود کو اس سے پہلے ہی خلیفۂ بغداد کی طرف سے خراسان اور غزنہ عطا ہوچکے تھے۔ اس نے ۱۰۰۱ء اور ۱۰۲۶ء کے درمیان بارہ حملے کیے۔ اسی طرح اس نے اپنی حکومت کو کشمیر، پنجاب، قنوج، متھرا اور گجرات سورت تک بڑھایا[1]۔ لیکن پنجاب میں اسلامی حکومت رہی اور گجرات کو وہیں کے ایک راجہ کے سپرد کردیا۔ مورخ فرشتہ نے بیان کیا ہے کہ محمود غزنوی کس قدر ہندوستان کے فن تعمیر و تہذیب سے متاثر ہوا، یہاں تک کہ متھرا کی تاخت و تاراج کے بعد اس نے غزنیں کے حاکم کو مبالغہ آمیز الفاظ میں ایک خط لکھا اور اس میں متھرا کی عمارتوں اور اس کی شان و شوکت کی بہت تعریف کی۔ اسی میں وہ لکھتا ہے "یہاں کی ایک ہزار عمارتیں مومن کامل کے ایمان کی طرح مضبوط ہیں۔ اور یہ سب کچھ یونہی نہیں ہوگیا بلکہ کئی لاکھ دینار کے خرچ سے بھی دو صدیوں تک کوئی اور شخص ایسی عمارتیں نہیں بنا سکتا" محمود غزنوی پانچ ہزار تین سو قیدی غزنہ لایا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے اکثر و بیشتر لوگ معمار و دستکار تھے[2] مرمر اور سنگ خارا کی عظیم الشان مسجد تعمیر کی جو عروسِ فلک کے نام سے مشہور رہی اور جس کو اس نے اپنی فتوحات کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا[3]

---

[1] لین پول کی کتاب مسلمان حکومتوں کی جدولیں ص ۲۸۶ [2] یہ غلط ہے کیونکہ محمود نے غزنہ میں جو کچھ تعمیریں کرائیں فرگسن محقق فن تعمیر کا خیال ہے کہ ان میں بنی طولون کی شباہت پائی جاتی ہے اور فن تعمیر کا یہی دور دراصل اسلامی ہندوستان کے فن تعمیر کا نمونہ ہے۔ مترجم [3] فرشتہ ترجمہ برگز ص ۵۹ دہیول فن تعمیر ص ۱۲

کچھ عرصہ بعد محمود کی حکومت لاہور سے سمرقند و اصفہان تک پہنچی مگر ایرانی صوبوں کو اس سے پہلے ہی ۱۰۵۰ء میں آل سلجوق لے چکے تھے۔

غزنہ کی ان عظیم الشان عمارتوں کا کچھ زیادہ حصہ باقی نہیں رہا علی الخصوص وہ جو ہندوستانی نمونوں کے تتبع میں تعمیر ہوئی تھیں[1]۔ اب بھی دو عالیشان مینار فتح موجود ہیں۔ ایک محمود نے تعمیر کرایا اور دوسرا مسعود ثالث (۱۰۹۹-۱۱۱۴ء) نے ان کو دیکھ کر ہم یہ تصور کرسکتے ہیں کہ غزنہ میں یہ فن اپنے خاص دنوں میں کیا تھا۔ ان کی بنیادی سطح کی ستارہ نما شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مینار ہندوستانی نمونوں سے متاثر ہیں۔ اگرچہ ان کی نقاشی بالکل اسلامی ہے[2]۔ مزید براں محمود کی مرمریں قبر کا تعویذ کوفی کتبات سے مزین ہے۔ یہ قبر کھلے صحن میں ہے۔ مسلمان اپنے بزرگوں کے لیے قبے بنایا کرتے تھے لیکن اس کے برخلاف ہندوستانی کھلے میدان کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ اکبر نے بھی سکندرہ (آگرہ) میں اپنی قبر کا تعویذ نہایت عظیم الشان مقبرہ کی چھت پر کھلی فضا میں بنوایا ہے[3]۔ محمود کے روضہ کا دروازہ جو حرم کی جانب تھا ایک مشہور لکڑی کے طاقوں سے مزین کیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے انگریز حاکم ان کو ۱۸۴۲ء میں لے آیا تھا تاکہ پورے طور پر محفوظ ہو جائیں[4]۔ ان پر عربی کتبات کے حلقے بنے ہوئے تھے۔ اور ان کو اسلامی ماحول کے مطابق کرلیا گیا تھا۔ روضہ محمود کی قبر کے بالائی حصہ کی تجدید غزنوی دور کے انحطاط کے بعد غوریوں (۱۱۴۸-۱۲۱۵ء) کے ہاتھوں ہوئی آخر کار اس کے تنگ

---

[1] ثابت ہو چکا ہے کہ غزنہ میں ایک عمارت بھی ایسی تعمیر نہیں ہوئی جس میں ہندوستانی طرز کا شائبہ ہو۔ مترجم

[2] غزنہ از گوڈرڈ فلوری ۱۹۲۵ء یہ مینار کیپٹن کرسویل نے اپنے طویل مضمون "ارتقاء اسلامی مینار" میں دیے ہیں۔ اور لکھا ہے کہ یہ خالص اسلامی ہیں اور مصر کی عمارتوں سے ماخوذ ہیں۔ فن ہند کا شائبہ بھی نہیں۔ مترجم

[3] سکندرہ کے متعلق عرض یہ ہے کہ تزک جہانگیری کے بیان کے مطابق یہ عمارت نامکمل رہ گئی ہے۔ ورنہ اس پر گنبد ہونا چاہیے تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہندوستان میں سکندرہ جیسی کوئی ہندو عمارت نہیں ملیگی جو یہ کہا جائے کہ سکندرہ اس کی نقل ہے۔ مترجم۔ [4] لارڈ ایلین برا ۱۸۴۲ء غزنہ سے مفروضہ سومنات کے دروازے لایا۔ لیکن دراصل ان کو سومنات کے مندر سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ان پر خالصًا اسلامی منبت کاری تھی۔ مترجم۔

اطراف میں سے ایک طرف ایک منبت شدہ کتبہ سہ نقطہ محراب کے حاشیہ سے بنایا گیا ہے[1] یا اور دیگر محرابوں اور قبروں کے تعویذ جو ہندستانی محرابوں سے بنائے گئے ہیں۔ ثابت کرتے ہیں کہ غزنہ پر ہندوستانی فن نے کتنا اثر کیا تھا۔[2]

غور کے افغان ایک عنصر خود مختار قوم تھی جو فیروزکوہ اور بامیان پر غزنویوں کے ماتحت حکمراں تھی۔ ان دونوں میں ازدواجی تعلقات کی وجہ سے اتحاد تھا۔ مگر بعد میں ایسے حالات پیش آ گئے کہ غوریوں نے غزنہ کو پامال کر کے رکھ دیا، اور اُس کو فتح کر کے افغانستان پر چھا گئے۔ محمود غوری نے ایک سلطنت قائم کی اور خراسان کا کچھ حصہ سلجوقیوں سے فتح کیا۔ پھر ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع ہوا اور سندھ و متھرا پر غلبہ پایا۔ جہاں عرب عمال نے اسلامی حکومت نافذ کی تھی۔ اُس نے اپنی آخری واپسی پر لاہور میں ۱۱۸۶ء میں غزنویوں کو مغلوب کیا۔ چوہان راجپوتوں کے قائد اعظم پرتھوی راج والیِ اجمیر پر حملہ کی غرض سے بڑھا۔ تھانیسر کی جنگ راجپوتوں کی شکست فاش پر انجام پذیر ہوئی غوریوں نے اپنی فتوحات سے قریب قریب تمام شمالی ہند کو مطیع کر لیا۔ یہ سب سے پہلا زمانہ تھا جبکہ کم و بیش تمام ہندوستان نے اسلامی غلبہ کو قبول کیا۔[3] اس طرح ہند و ایران کے مزاج سے مرکب ایک حکومت قائم ہوئی۔ ہندوستانی فن کا اثر اب بھی برقرار رہا۔ ہندوستانی حملوں نے نئے حاکم کو دولت وافر بخشی اور اس سے محمود کی عظیم الشان جامع ہرات کے ہمراہ ایک مسجد تعمیر کرائی جس کی تفصیل موہن لال ہندستانی نے بیان کی ہے۔[4] مسجد کا ایک دروازہ ستر قدم کا تھا جس کی چھت مضبوط ستونوں کے سہارے کھڑی تھی، صحن کو چار ایوان گھیرے ہوئے تھے جو ستونوں کے ذریعہ

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں سے قبل کوئی اپنا قدیم محراب فن معماری تھا ہی نہیں، یہاں مسلمان آئے اور اُن کے فن نے ہندوستان پر اُلٹا اثر کیا۔ [2] یہ فن تعمیر کی ایک اصطلاح ہے۔ کمان یعنی Arch اور قبر محمود پر جو کتبات ہیں اُن کے متعلق عرض ہے کہ اُن کا خط کوفی نہیں ہے جیسا کہ صاحبِ مقالہ نے سمجھا ہے بلکہ اصل میں خط بدیع و نسخ کا مرکب ہے۔ مترجم۔ [3] لین پول ص ۴۹ [4] جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابت ۱۸۴۳ء ص ۱۶

کمانذار ستونوں سے ملحق اور چھوٹے چھوٹے قبوں سے مسقف تھے یہ ایوان ایرانی طرز کے تھے مگر ستونوں کا کمانذار راستہ مع قبوں کے ہندوستانی تھا[1]۔ یہ ثبوت اب بھی تربت شیخ جام کی مسجد میں مشرقی خراسان میں تلاش کیا جا سکتا ہے[2]۔

لیکن محمد غوری ۱۲۰۶ء میں قتل کر دیا گیا اور سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ ۱۲۱۵ء میں خوارزم شاہ ایرانی ممالک کا وارث ہوا تو غوریوں کی سلطنت کو غلاموں نے دہلی میں بطور دار السلطنت کے سنبھالا۔ اور ایران و ہندوستان کے درمیان جو سیاسی اتحاد تھا وہ زائل ہو گیا پھر مختصر سا اتحاد تیمور کے کشمیر اور دہلی کے حملوں سے ہوا۔ اس کی فتوحات نے حکومتِ ماوراء النہر کو بہت اہمیت تک پہنچایا۔ جو اُسے پہلے کبھی حاصل نہیں تھی۔ سمرقند ایک ایسی سلطنت کا دار الحکومت تھا جو دہلی سے دمشق اور بحیرۂ یورال سے خلیج فارس تک وسیع ہو چکی تھی[3]۔ ہندوستان کے عظیم الشان فنِ عمارت نے تیمور کو بہت محظوظ کیا، چنانچہ محمود کی طرح وہ بھی بیشمار کاریگر اپنے ہمراہ لے گیا۔ بعض ماہرین جر اثقال اور دوسرے کاریگر جن میں سے اکثر کی خدمات کو شاہی خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں کے محلات کی تعمیر کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے جنگوں میں بھی حصہ لیا اور جو لوگ سمرقند میں رہ گئے تھے اُن کی خدمات ماتحت شعبوں اور حرم شاہی کے لیے وقف ہوئیں، مگر تیمور نے واپسی پر خیال کیا کہ اپنے دار الخلافت میں تراشیدہ پتھر کی ایک جامع مسجد تیار کرائے[4]۔ اس مقصد کے لیے خاص خاص فرامین صادر کیے گئے کہ تمام کاریگر جو پتھر یا مرمر کے کام میں خاص ماہر ہیں اُن کو شاہی ملازمت کے لیے محفوظ کر لیا جائے[5]۔ شرف الدین علی یزدی "ظفر نامۂ تیمور" میں اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ پتھر کا کام کرنے والے دو سَو آدمی جن میں ایرانی تھے اور آذربائیجانی اور ہندوستانی بھی۔ وسیع

---

[1] تاریخ فنِ تعمیر ہند فرگسن ۱۸۶۱ء ص ۳۳۵ جلد ۲۔ [2] خراسان۔ جرمنی۔ از ڈینبرگ۔ [3] لین پول ص ۲۶۶

[4] غالباً فیروز شاہ کے کوٹلہ کی مسجد اور مسجد قوت الاسلام مراد ہے۔ مترجم [5] روضۃ الصفا ترجمۂ انگریزی ص ۲۶۶

صحن میں کام کرنے پر متعین کیے گئے تھے، اور گاڑیوں کے کھینچنے کے لیے ہاتھی استعمال کیے جاتے تھے۔ مسجد کے چار سو اسی ستون تراشیدہ پتھر کے تھے اور محرابوں کی وسیع پیشانیاں نہایت عمدگی کے ساتھ تراشیدہ، صیقل شدہ، مرمری سلوں سے مزین کی گئی تھیں۔ ابھرے ہوئے منبت شدہ کتبات سے تمام دیواروں کی سطح اندرونی و بیرونی طور سے آراستہ تھی۔ اور صرف یہ سطح ہی نہیں، بلکہ محرابوں کے کماندار راستے بھی جن کو پتھر یا ابھری ہوئی اینٹوں سے جوڑا گیا تھا۔ بہزاد کی تصاویر ظفرنامہ سنہ ۱۴۶۷ء اب تک محفوظ ہے، اُس میں بھی یہ تفصیلات بالا مذکور ہیں، اور اُس میں پتھر تراشنے والے ہتھوڑہ اور چھینی سے مرمری سل پر منبت کاری کرتے دکھائے گئے ہیں[2]۔ اس سے واضح ہے کہ حجر سازی کا ہندوستانی طریق فن یہاں بھی برتا جاتا تھا، اور ویسی ہی ترتیب نقاشی میں مقصود تھی۔ اس کا ثبوت دہلی اور اجمیر کی مساجد سے بھی ملتا ہے جن کی دیواریں ابھرے ہوئے بیل بوٹوں، اور کتبات سے بالکل بھری ہوئی تھیں۔ اور جن کی مثال گوالیار کے مندروں کی دیواروں سے واضح ہوتی ہے[3]۔

اب سمرقند میں اس مسجد تیمور کا بھی کہیں نام و نشان باقی نہیں ہے۔

تیمور تک ہندوستانی اثر ایران پر ختم ہوچکا تھا۔ اور تیمور کی عظیم الشان مسجد کے باوجود تیموری فن تعمیر ایران میں خالصتاً ایرانی الاصل رہا۔ یہاں تک کہ ایران کے فن نے شاہانِ مغل کے فن کو آگرہ اور دہلی میں فیضیاب کیا۔　　　(ترجمہ از مقالہ ارنٹ ڈینیر مطبوعہ سالنامہ ایسٹرن آرٹ امریکہ)

(نوٹ) یہاں یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں آئے تو فن تعمیر میں جو طرز انہوں نے اختیار کیے وہ سب اپنے ساتھ عراق و عجم سے لائے۔ اور اُن کو ہند میں رائج کیا، اور یہ سب طرز ہندوستانی طرز سے الگ ہیں۔ خاکسار مترجم نے اسی موضوع پر گذشتہ دسمبر میں انڈین سوسائٹی لندن کے رسالہ Indian - Art and Letters میں بعنوان Indian links with central Asia - Architecture ایک مضمون شائع کرایا تھا جس میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

[1] ظفرنامۂ تیموری ترجمۂ فرانسیسی مطبوعہ پیرس ۱۸۱۴ء　[2] شُلز کی کتاب ایرانی مصوری　[3] یہاں صاحبِ مقالہ کو غالباً دھوکا ہوا ہے۔

وجود و ثبوتِ باری تعالیٰ پر ایک لمحۂ فکریہ

از جناب مولانا خواجہ سید محمد علی شاہ سہارنپوری

وجود باری تعالیٰ کے دلائل قدیم فلسفہ و منطق کی کتابوں میں بہت منتشر طریقہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا خواجہ سید محمد علی شاہ صاحب نے اُن سب کو طرز استدلال کے مختلف عنوانوں کے ماتحت ایک جگہ جمع کردیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جن علماء یا طلبہ نے ان دلیلوں پر مختلف مواقع پر غور کیا ہے، وہ سب بیک وقت اُن کے ذہن میں موجود رہ سکتی ہیں۔ اور اس مضمون کو پیش نظر رکھ کر وہ ضخیم و طویل کتابوں کی ورق گردانی سے ایک حد تک بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ ہم مولانا موصوف کی "برہان نوازی" کے شکرگذار ہیں۔ اور اس مضمون کو اسی فائدہ کے پیش نظر شائع کر رہے ہیں۔ ورنہ اس میں شک نہیں فلسفۂ جدید کی روشنی میں وجود باری کو ثابت کرنے کے لیے ان کے علاوہ اور بھی موثر، قوی اور نفسیاتی دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں جو فلسفۂ جدید کا ایک مستقل مبحث ہیں۔		"برہان"

(۱)

موجود بحق واحد اول باشد		باقی ہمہ موہوم و مخیل باشد
ہر چیز جز او کہ آید اندر نظرت		نقش دومیں چشم احول باشد

انسانی عقل اپنے نقصان اور محدودیت کی بنا پر بہ آسانی منزلِ کمال اور سعادت کے ذروۂ علیاء پر نہیں پہنچ سکتی۔ اور اپنی نارسائی و کوتاہی کی وجہ سے تمام اسرار کائنات و حقائق الٰہیہ پر

احاطہ پانا اس کے لیے دشوار ہے۔ اس لیے طبعی طور پر اس کا رجحان اس طرف ہے کہ کسی پر اعتماد اور بھروسہ کرکے سکون و طمانیت حاصل کرے جو اُس کو بحث و تنقید اور دماغی کدوکاوش کی مشقت میں ڈالے بغیر منزل مقصود تک راہ نمائی کرے۔

(۲)

خالق و مخلوق کے ذاتی تفاضل کی بنا پر عقلی حصر کے ساتھ یہ بات مبرہن و مدلل ہو کر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عقل سلیم جس چیز پر اعتماد اور کامل یقین کر سکتی ہے وہ صرف خدائی کلام، ربانی الہام وحی الٰہی اور نقل صحیح ہے اور بس۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

(۳)

الہامیات میں از روئے عقل سب سے اعلیٰ مرتبہ قرآن مجید کا ہے۔ کیونکہ یہ آخری کتاب اک مکمل درس ہے جو اقرب طرق سے تقرب الٰہی و رضائے خداوندی کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی الہامی کتاب ہے جو اول سے آخر تک یقین ہی یقین ہے۔ اس کے دعوے بھی یقینی ہیں اور دلائل بھی۔ اس میں نہ ریب و شک کی جگہ ہے نہ تردد و تذبذب کی گنجائش۔

یہ ایک سماوی قانون ہے جو انسانی فطرت کی صحیح ہدایت اور راہ نمائی کے لیے عطا ہوا ہے اور انسانی دستبرد سے ابد تک محفوظ رکھا گیا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا پر ہے۔

یہ ایک مکمل دستور العمل ہے جو دنیا و آخرت اور موت و حیات کی ہر ہر جزئی کی اجمال نما تفصیل و تشریح ہے۔ معاش و معاد کے شخصی و نوعی، انفرادی و اجتماعی ہر ہر شعبہ اور ہر ہر صیغہ پر حاوی ہے۔

قرآن حکیم بحث و تکرار، اور تدبر و تفکر کا عظیم الشان داعی ہے۔ سعی و عمل اور جہد مسلسل میں مشغول رہنے کا طالب ہے۔ ناموس فطرت اور معارف الٰہیہ کا حقیقی ترجمان ہے۔

قرآن شریف کو اگر صرف تمدن، عمرانیت کے اصول، قوانین اور فلسفہ وسائنس کے مبادیات وجہات کا مرکز قرار دیا جائے تو اس سے قرآن عظیم کی وقعت میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کی تنزیل کا مخصوص مقصد اور ہدایت وغایت روح وقلب کا تزکیہ وتصفیہ، اخلاق کی جلاء، جذبات وحسیات کی تہذیب اور خیالات واعتقادات کی تقدیس ہے یہی اس کا خاص عنوان اور مخصوص موضوع ہے، اگرچہ اس کی جامعیت اور تفصیل وبیان لکل شئی ہونا، اور اس کی تاثیرات وتعلیمات کا ہر قسم کے دینی اور دنیوی ضروریات کی تکمیل پر مشتمل ہونا تمام کتب سماویہ کے مقابلہ میں اک امتیازی شان ووقار رکھتا ہے۔

انسانی فطرت کے اندر جو باتیں مستور ہیں ان کی اصلاح واستحکام اور ہدایت وفلاح کے لیے یہ ایک عالمگیر پیغام عمل ہے۔

اس کے معانی ومطالب کی حقیقت نہایت واضح اور روشن ہے۔

اس کے ارشادات وبصائر، عرفان وبصیرت کی روشنی کو قوت اور قوت میں زیادتی بخشتے ہیں۔

اس کے مواعظ وحکم غفلت وسرشاری اور طغیان وتمرد سے باز رکھتے ہیں۔

اس کے قصص وامثال سے عبرت ونصیحت کا فتح باب ہوتا ہے۔

اس کتاب حکیم کے مبادی ومقاصد سراپا حکمت ہیں اور عقل وبصیرت کی تشفی کا تمام سامان اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔

اس کا اسلوب بیان کسی قسم کی حجت وبرہان اور دلیل واستدلال سے خالی نہیں۔ اور کچھ ایسا حکمت بھرا ہے کہ عامی سے عامی شخص بھی ادنیٰ تامل اور ذرا سے غور وفکر کرنے پر اس کے مطالب ومقاصد کا حقیقت آشنا بن کر اپنی روحانیات وعمرانیات کے ہر شعبہ وصیغہ پر کمال واقفیت پیدا کرسکتا

ہے۔اور ایک مرتب و مسلسل نظام کے تحت دنیا و آخرت اور جسمانی و روحانی زندگی کے ہر ادارے کو مناسب انداز پر چلا سکتا ہے۔

اس کا طرز استدلال نہایت صاف سادہ اور فطری ہے۔

اس کا طریق رشد و ہدایت کسی خاص فنی روش اور مخصوص وضعی اسلوب پر نہیں۔ ذوق سلیم اور فہم صحیح فطرت بشری کی تمام مقتضیات اور ضروریات کو اس میں موجود پا رہی ہے۔

(۴)

گو دنیا کی ہر چیز انسان کو اپنے دام فریب میں پھنسا کر اس کو اپنے فرائض سے غافل کرنے پر تلی ہوئی ہے۔اور مادی کثافتیں، ملکوتی صفات اور بلند و بالا روحانی مقامات سے انسان کو دور کر رہی ہیں، مگر ہر شخص اپنے خیال اور حیثیت کے مطابق، اپنی عمر کے کسی نہ کسی حصہ میں اپنی اصلی فطرت کی طرف رجوع کرتا اور خدائے وحدہ لاشریک کا زبان سے نہ سہی دل سے اور صدق دل سے اقرار کر لیتا ہے۔

انسانی فطرت مجبور و مضطر ہو جاتی ہے کہ اپنے مالک و خالق کی طرف رجوع کرے۔

یہاں انسان کا اندرونی حال اور باطنی مجبوری دوسرے پر نہ سہی خود اس کے اپنے اوپر تو ضرور واضح ہو جاتی ہے اور اصل حال کھل جاتا ہے۔

قرآن حکیم انسانی فطرت میں جو عقل پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کا سب سے پہلا سبق یہی ہے کہ ایک واحد مطلق، قادر علی الاطلاق، اور مختار کل ہستی کا ثبوت و وجود ثابت و محقق ہے جس کی ذات تمام صفات کمالیہ کی مستحق۔اور صفات تمام عیوب و نقائص سے منزہ۔اور افعال تمام خوبیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہیں۔

(۵)

نوع انسانی چونکہ اپنے جدا جدا خیالات، قسم قسم کی معلومات، اور علیحدہ علیحدہ ماحول کے اعتبار سے

مختلف طبقوں پر مشتمل ہے۔ بلکہ ایک انسان بھی اپنی مختلف حیثیتوں اور تنوعِ افکار کے لحاظ سے نہ
وہ کتنے فرقوں پر منقسم ہے۔ تو اس کے لیے صرف قرآنِ عزیز ہی ایک ایسا جامع اکمل آئین و اصول
دستور العمل ہے جو ہر فردِ انسانی کو انفراداً و اجتماعاً اس کے مدارج و مراتب کے لحاظ سے فکر و عمل
مطالعہ و تدبر کی دعوت عام دے رہا ہے۔

شخص خواہ دیہاتی ہو یا شہری، عالم ہو یا ناخواندہ، بوڑھا ہو یا جوان، اپنی علمی و عملی، کاروباری
بارتی، غرضکہ زندگی کے ہر گوشہ میں۔ دعوے۔ دلیل اور نظر و استدلال سے کام لیتا ہے۔ محاورات
روزمرہ کی بول چال میں بھی طفل نوخیز تک اپنے خیال کے اظہار پر تمثیل واقعات بیان کرتا اور
سمجھ کے موافق برہان و حجت قائم کر دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس انداز و روش سے بھی صدر درجہ اعتنا
ں ہے اور قوائے فکریہ کو تلاش و جستجو کے میدان میں سرگرم عمل ہونے کا موقع دیا ہے سعی و عمل کے
تھ اعمالِ فکر و عمق نظر قرآن کا مطلوب اولین ہے۔

(۶)

چونکہ انسانی عقل اور ممارست علمی، ہر عام مفہوم میں خصوصیت اور عقلی و طبعی، شرعی و وضعی
نباداً حصر پیدا کرنے کی عادی ہے تاکہ کوئی گوشہ گرسنۂ تحقیق اور کوئی پہلو تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے اس
ے ابتدائی طور پر دلیل کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ وجدانی اور نظری۔ پھر نظری کی بھی دو قسمیں ہیں تام
روی۔ اور پھر جزوی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ تمثیل، استقراء۔ اور آگے چل کر استقراء کی بھی دو قسمیں ہیں
قص اور تام۔

استقراء تام قیاس ہے اور قیاس کو پانچ قسموں پر منقسم کیا جاتا ہے۔ برہانی، خطابی، جدلی،
ر، سفسطہ۔

قیاس برہانی کی بھی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ جن کو انی اور لمی کہتے ہیں اور ان ہی کو طبعی و

الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔

(۷)

تتبع و تفحص، اور تفتیش و جستجو کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ باری تعالیٰ جل مجدہٗ کی وحدانیت و وجود پر قرآنِ حکیم میں سوائے سفسطہ و مشاغبہ کے جملہ اقسام دلیل سے بحث کی گئی ہے۔ اور قرآنِ حکیم میں دلیل کے اقسام بتمامہ موجود ہیں۔

رہے یہ فنی اصطلاحات اور علمی عنوانات جو قرآنِ حکیم کی علمی و عملی خدمات بجالانے پر ہر زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہوتی رہتی ہیں خواہ وہ علم تصوف و اخلاق، فلسفۂ اسلام اور منطق صحیح سے تعلق رکھتی ہوں یا علم جدل و خلاف، مناظرہ و اصول کلام کے مناسب ہوں، تمام کے تمام فہم قرآن ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہیں۔ اور تقریبی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن ہی سے مستنبط و ماخوذ ہیں۔

(۸)

تسہیل، تعمیم نفع، تشحیذ اذہان اور تجدید خیال کے لیے دلیل کی جملہ اقسام کی مثالیں الگ الگ ذیل میں درج ہیں۔

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

۱۔ وجدانی :۔ ذاتِ خداوندی کے وجوبِ وجود اور وحدانیت پر فطرت انسانی میں ایک قوی انجذاب و کشش ہے۔ اور طبیعت خود بخود ایک مالک خالق واحدِ مطلق کے تسلیم کرنے پر مجبور و مضطر ہے۔

۲ تمثیل :۔ نظر عقلی کے اعتبار سے شے کی تین قسمیں ہیں۔ کوئی شے ان تین احتمالات سے خالی نہیں ہو سکتی شے کا وجود بالنظر الی الذات ضروری العدم ہوگا یا ضروری الوجود۔ یا نہ ضروری العدم ہوگا اور نہ ضروری الوجود۔ اول ممتنع و محال ہے۔ اور بحث سے خارج ہے۔ ثانی واجب ہے؛ اور

ثالث ممکن، اور ممکن موجود ہے۔ لہذا واجب بھی موجود ہوگا کیونکہ امکان و وجوب دونوں وجود کے مستحق ہیں اور وجوب استحقاق وجود میں ممکن پر مرجح ہے۔ لہذا واجب بدرجۂ اولیٰ موجود ہوگا اور واجب ہی کا نام خدا ہے۔[1]

۳۔ استقراء:۔ اکثر موجودات عالم علت کی محتاج ہیں۔ اس بنا پر ہر موجود علت کا محتاج ہے۔ لہذا تمام عالم علت کا محتاج ہے۔ کیونکہ ہر ممکن بغیر واجب ناممکن ہے، پھر واجب، یا ممکن کے لیے علتِ محض ہوگا جس کے لیے عقل، شعور، ارادہ، قدرت ضروری نہیں یا علت بحیثیت فاعلِ مختار، قادر، ذی ارادہ ہوگا۔ پہلی صورت اس لیے صحیح نہیں کہ علت محضہ ذی شعور و ذی ارادہ ممکن کے لیے علتِ تام نہیں بن سکتی۔ اور دوسری صورت میں واجب الوجود ہی کا نام خدا ہے۔

۴۔ قیاس برہانی:۔ (۱) "طبعی یا انی" عالم کا ہر شعبہ اور کائنات کا ہر حصہ ایک نہایت متسق و منتظم اور احسن ترتیب پر چل رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مدبر حکیم صانع کی صنعت و حسنِ تدبیر کا نتیجہ ہے۔

(۲) "الٰہی یا لمی" عقل تسلیم کرتی ہے کہ کوئی ایسی ہستی اور ذات یقیناً موجود ہے جس کا وجود کامل بھی ہے اور خانہ زاد و ذاتی بھی۔ اور اسی وجود کامل پر یہ سلسلۂ کائنات جس کا ہر فرد ناقص ہے منتہی ہو جاتا ہے اور وہی وجودِ کامل خدا ہے۔

۵۔ قیاس خطابی:۔ ہر زمانہ میں خدا کے ماننے والے بہ کثرت موجود رہتے چلے آئے

---

[1] فاضل مضمون نگار کی اس دلیل سے واجب کے وجود کا ثبوت بیشک مدلل و مبرہن ہوتا ہے لیکن واجب کا خدا ہی ہونا محتاج نظر ہے۔ اس لیے کہ واجب کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ مسئلہ پھر بھی بحث طلب رہ جاتا ہے کہ واجب الوجود حساس، ذی شعور، صاحب علم و ارادہ ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو وہ خدا نہیں ہو سکتا، اور اگر ہے تو اس کے ثبوت کے لیے مستقل دلیل کی حاجت ہے جو تمثیل کے زیر عنوان اس دلیل سے ثابت نہیں۔ نیز یونانی نظریات کے سلسلہ کی یہ دلیل موجودہ فلسفہ کے جدید نظریہ کی روشنی میں بھی ناتمام اور ناقص ہے۔ انشاء اللہ کسی دوسرے وقت اس مسئلہ کو مفصل سپرد قلم کیا جائے گا۔ "برہان"

ہیں۔ عارفین اور اصحاب ادراک و معرفت نے اپنے عرفان و بصیرت، کشف و مشاہدہ اور ارشادات و ملفوظات سے مصلحین و واعظین نے اپنے مواعظ و بیانات سے، فلاسفہ و حکماء نے اپنے حکیمانہ اقوال و مقالات سے۔ ہمیشہ ہر زمانہ میں خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کا خود بھی اقرار کیا اور دوسروں سے بھی اقرار کرایا۔

۶۔ قیاس جدلی :- اہل باطل کا عقیدہ ہے کہ مادہ ہی ایسی چیز ہے جس میں ابتدائً تغیر و تبدل ہوا، اب اہل حق کی طرف سے پوچھا جائیگا کہ مادہ کے اس تغیر کی علت کیا ہے۔ مادہ ہی ہے یا کوئی اور شے۔ خود مادہ ہی اس تغیر کی علت نہیں ہوسکتا کیونکہ اس صورت میں ترجیح بلا مرجح لازم آئیگی۔ لہذا مادہ کے علاوہ کوئی دوسری شے اس تغیر کی علت ہوگی اور وہ خدا ہے۔

۷۔ قیاس شعری :- بدو فطرت سے روح اپنے مطلوب حقیقی کی تلاش میں ماہیِ بے آب کی طرح وسیع کائنات کے ہر گوشۂ وادی میں سراسیمہ و سرگرداں پھر رہی تھی لیکن کہیں بھی اپنے مطلوب کو نہ پاسکی۔ ایک ایک ذرہ پر نظر ڈالی، دیکھا، بھالا، تلاش و غور کیا، چھان بین کی۔ معائنہ و مشاہدہ کیا۔ بالآخر وہ شاہدِ حقیقی جب اپنے جمال جہاں آرا و عالمتاب سے خود ہی لباس مجاز میں جلوہ افروز و دیدار نما ہوا تو روح اپنے معبودِ حقیقی اور مطلوبِ تحقیقی سے وصال پاکر سجدہ میں جا پڑی اور جامِ تسکین سے سیراب ہوئی۔

(۹)

الوہیت کے دلائل بے شمار و لاتعداد ہیں۔ ان تمام کا احاطہ تھوڑی سی فرصت میں غیر ممکن ہے۔ سابق میں دلیل کے جملہ اقسام میں سے ہر قسم کے دلیل کی ایک ایک مثال پر اکتفا کی گئی ہے۔ استقراءِ تام، قیاس برہانی میں دلیل اِنّی کی مثالیں بہت کثرت کے ساتھ شائع و رائج پذیر اور زبان زد خلائق ہیں۔ اور بآسانی مل جاتی ہیں۔ کیونکہ انسانی طبیعت کا رجحان اور لگاؤ زیادہ تر

اسی کی طرف ہے۔ یہاں پر اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند اصل الاصول، بنیادی مقدمات جو ایک، دوسرے پر موقوف بھی ہیں ذکر کرتا ہوں۔

یہ ایک نفس الامری حقیقت ہے کہ (۱) ہر ممکن واجب کا محتاج ہوتا ہے۔

چونکہ عقل خود بخود بتلاتی ہے کہ

(۲) یہ نظم و حکمت اور حسن تدبیر جو کائنات اور عوالم میں طاری و ساری ہے محض اتفاقی اور اتفاقیات میں سے نہیں ہے۔ بلکہ فکر و درایت اور تدبیر و حکمت کا نتیجہ و غائت ہے۔

یہ اس لیے کہ

(۳) یہ بات بھی اقتضائے عقل کے خلاف ہے کہ ناقصات کا سلسلہ بدون کسی کامل کے ختم ہو جائے۔

یہ چند بنیادی مقدمات ہیں جو اصول موضوعہ کے طور پر مسلم ہیں سے اپنے مقام پر ثابت شدہ اور تمام اِنی دلائل کے مرجع اور اصل الاصول ہیں تفصیل، توضیح اور تشریح کے طور پر ان ہر سہ مقدمات کی تمثیل یوں ہو سکتی ہے کہ

۱۔ ہر ممکن مؤثر کا محتاج ہے۔ اور عالم ممکن ہے۔ لہذا عالم بھی مؤثر کا محتاج ہے۔ اب یہ مؤثر ممکن تو ہو نہیں سکتا ورنہ دور یا تسلسل لازم آئیگا۔ بلکہ واجب ہوگا اور وہی خدا ہے۔

۲۔ عالم سراسر منتظم و مرتب ہے۔ اور کوئی منتظم و مرتب شے اتفاقی نہیں ہو سکتی بلکہ کسی صانع و مدبر اور حکیم کی صنعت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہذا یہ عالم بھی کسی صانع و مدبر و حکیم کی صنعت ہے اور وہ صانع حکیم، خدا ہے۔

۳۔ تمام عالم ناقصات کا مجموعہ ہے اور ہر ناقص اپنے وجود میں کامل کا محتاج، اور اس کا مقتضی ہے اور وہ وجودِ کامل خدا ہے۔

(۱۰)

عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد

اگر قلبی اطمینان اور روحانی تشفی کے لیے زیادہ وضاحت مطلوب ہو تو یوں سمجھیے کہ

۱۔ دلیل طبیعت ــ تمام عالم اپنے نظم و ترتیب اور نوامیس طبعیہ کے اعتبار سے معلول عقلی ہے اور ہر معلول عقلی، علت عاقلہ کا مقتضی ہے۔

۲۔ دلیل غایت ــ کائنات کے ہر فرد کی ماہیت، انسانی وجود کی ضروریات کے موافق ہے۔ یہ موافقت اتفاقی نہیں۔ بلکہ فاعل با اختیار کے ارادہ کا ثمرہ ہے۔

۳۔ دلیلِ اختراع ــ تمام موجودات مُختَرَع اور معقول ہیں۔ اور ہر مُختَرَع شے اپنے مُختَرِع اور فاعل کی محتاج ہے۔

۴۔ دلیل حدوث ــ عالم حادث ہے اور ہر حادث علّتِ محدثہ کا محتاج ہے۔

۵۔ دلیل توقف ــ ہر "ما بالعرض" شے کا وجود بدون "ما بالذات" کے ممتنع ہے۔ اور عالم "ما بالعرض" ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی "ما بالذات" ضروری ہوا۔

۶۔ دلیل انعکاس ــ عالم موجود وہمی ہے۔ اور ہر موجود متوہم کسی موجود اصلی کا انعکاس ہوتا ہے اور موجود اصلی خدا ہے۔

۷۔ دلیل تقابل ــ عالم کثرتِ محض ہے۔ اور ہر کثرت وحدت کی متقاضی ہے۔ اور وحدت محضہ سے متصف، خدا ہے۔

۸۔ دلیل مقابلہ ــ عالم سلسلۂ تقییدات ہے۔ اور تمام تقییدات، اطلاق کا تقاضہ کرتی ہیں۔ لہٰذا عالم بھی مطلق کا مقتضی ہوا۔ اور ہستی مطلق صرف خدا ہے۔

(۱۱)

یہ آفتاب ہی کرم اُسکی کبریائی کا ۔۔۔ کہ ذرّہ ذرہ ہی آئینہ خودنمائی کا

خلاصۂ کلام یہ کہ ہر شے، ہر ممکن، ہر موجود، جس طرح بھی دیکھا جائے اپنی فطرت و حالت کے اعتبار سے وجود باری پر گواہ ہے۔ ضرورت غور و فکر کی ہے گو وجود الٰہی اپنے ثابت لنفسہ اور موجود بوجود ذاتی و اصلی ہونے کی بنا پر نظر و استدلال کا محتاج نہیں۔ بلکہ صرف تنبیہ و توضیح کافی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ خواہ دلیل و استدلال سے کام لیا جائے یا توضیح و تنبیہ سے۔ بغیر تصدیق و تسلیم، انسان کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے

او وجودِ چمن آرائے ازل کے منکر! ۔۔۔ خود بخود گل ہوئے موجود نہ خار آپ سے آپ

ایک عربی سادہ ذہنیت نے کیسی بلیغ تشبیہ سے کام لیا ہے۔

البعرة تدل علی البعیر، و اثار الاقدام علی المسیر، فالسماء ذات البروج، والارض ذات الفجاج کیف لا تدلان علی الصانع القدیر۔ (مینگنی سے اونٹ کا، نشانِ قدم سے رفتار کا پتہ چل جاتا ہے تو یہ برجوں والا آسمان، اور کشادہ راستوں والی زمین، اپنے بنانے والے مالک و خالق کا پتہ کیوں نہیں دے رہے)

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی ۔۔۔ ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

(۱۲)

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ۔۔۔ وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت بہ پایاں رسید عمر ۔۔۔ ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

سعید روحیں مطمئن ہیں کہ وہی دائمی مسرت اور وصال ابدی کی مستحق ٹھہرینگی کیونکہ اُنہوں نے "الست بربکم" کے جواب میں مستانہ وش "بلیٰ" کا نعرۂ والہانہ لگا کر شاہد حقیقی کے مشاہدۂ وجود و معائنۂ

میں اپنی ہستی کو فراموش کردیا ہے۔ اور طالبانِ حقیقت و رہ نوردانِ شاہ راہِ معرفت کو

"العجز عن درک الادراک ادراک"

کا تسمۂ جاں نواز لگاکر، عرفانی رمز کشائی میں مشغول و منہمک بنادیا ہے۔

جستجو میں تری دوڑیں نہ جو ٹوٹیں وہ پاؤں

سر وہ کٹ جائے کہ جس میں نہ ہو سودا تیرا

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

"اُردو زبان اور تفسیر قرآن"

کے نام سے ایک اہم کتاب کی ترتیب و تدوین ہو رہی ہے جس میں ان تمام مصنفین و مولفین کا تذکرہ ہوگا، جنھوں نے اُردو زبان میں قرآن عزیز کی کوئی مستقل تفسیر لکھی ہے یا کسی عربی تفسیر کا ترجمہ کیا ہے یا کم از کم کسی قرآنی مسئلہ پر کوئی تصنیف کی ہے۔

لہٰذا اس امر کا اعلان کیا جاتا ہے کہ جن حضرات نے اُردو زبان میں قرآنِ عزیز کی کوئی خدمت کی ہو وہ اپنا مختصر سا تذکرہ اپنی کتاب کے ساتھ روانہ فرمادیں تاکہ ہم کو درج کرنے کا موقع ملے۔

حضرات اہل علم سے قوی اُمید کی جاتی ہے کہ وہ ضرور قرآن اور اُردو زبان کی اس خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائینگے۔

معتمد دائرہ قرآنیہ سید صبغۃ اللہ حسینی بختیاری (فاضل دیوبند)

اُستاذ جامعہ دارالسلام۔ عمرآباد۔ ضلع شمالی ارکاٹ

مسلمانوں کے تعلقات غیر قوموں کے ساتھ

قرون اولیٰ میں

(۲)

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم کو لفظ اسلام پر غور کرنا چاہیے۔ اسلام کا مادہ سلم ہے، جس کے معنی صلح، مصالحت اور انقیاد و اطاعت ہیں۔ عرب کے دور قبل از اسلام کو جو عہد جاہلیت کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں "جہل" یا "جہالت" کا لفظ بردباری اور حلم کے بالمقابل مستعمل ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے عرب بات بات پر لڑتے تھے۔ لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لیے موجب ننگ و عار سمجھتے تھے۔ اور انتقام لینے میں اس قدر متشدد اور سخت گیر واقع ہوئے تھے کہ برسہا برس تک اس کو فراموش نہ کرتے تھے۔ قبائلی عصبیت کے احترام کو محفوظ رکھنے کے لیے جان دیدینا اُن کے اعتقاد میں فخر و مجد کا تقاضا تھا۔ اسلام آیا تو اُس نے ان سب تعصبات کو مٹانے کی تلقین کی اور قبائلی عصبیت یا وطنی و ملکی تعصب کی جگہ انسانی وحدتِ اجتماعی کی روح پیدا کی۔ اُس نے بتایا کہ انسان انسان سب برابر ہیں کسی کو کسی دوسرے پر محض نسبی امتیاز یا وطنی خصوصیت کی بنا پر تفوق نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے صاف و صریح اعلان کیا:-

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ تم میں سب سے بڑا وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

حضرتِ ابوذر غفاری نے کسی شخص کو اس کی ماں کا طعنہ دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی، تو فرمایا اے ابوذر تجھ میں اب تک جاہلیت کی خو بو پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔

اور اللہ کے وہ بندے جو زمین پر حلم اور بردباری کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل اُن کو خطاب کرتے ہیں تو وہ اُن کی طرح جہالت کی بات نہیں کرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں" ایک اور موقع پر فرمایا گیا "کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ تم سب برابر ہو" یہ اسلام کی عام تعلیم تھی، جس کے ذریعہ اُس نے لوگوں میں اخوت انسانی کا جذبۂ کامل پیدا کیا۔ وہ مسلمانوں کو غیر قوموں سے نفرت کرنا، اُنہیں حقیر سمجھنا اور اُن کے محسوسات سے بے توجہی برتنا نہیں سکھاتا بلکہ اس کے برخلاف انہیں دعوت دیتا ہے کہ غیر قوموں کے انسانی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں حق کی طرف بلاؤ۔ اور سچائی کا راستہ دکھاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری کو یمن میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا تو انہیں ہدایت فرمائی "لوگوں کو اچھی اچھی باتیں سنانا، نفرت نہ دلانا، سہولت اور آسانی کرنا، سختی اور تشدد کے ساتھ پیش نہ آنا۔"

قرآن مجید میں خود ہدایت کی گئی ہے کہ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔

تم اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ جامع فضائل و کمالات کون ہوسکتا ہے لیکن آپ کے متعلق بھی صاف طور پر ارشاد فرمایا گیا۔ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔

غیر قوم کے لوگوں سے حُسنِ معاملت و معاشرت کے ساتھ پیش آنے کی اس تعلیم کے علاوہ

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ انہیں کسی شخص کی بات کے قبول کرنے سے محض اس لیے انکار نہ ہونا چاہیے کہ اس کو ایک غیر ملک و قوم کے آدمی نے کہا ہے۔ بلکہ راست دلی کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے کہ فی الواقع وہ بات کیسی ہے؟ اگر وہ اچھی بات ہے، اور فلاح وخیر کا باعث ہو تو اس کو فوراً قبول کرلینا چاہیے ورنہ نہ صرف یہ کہ خود اس کو قبول نہ کریں بلکہ جو لوگ اُس پر عامل ہیں اُن کو بھی اُس کی ہلاکتوں اور تباہیوں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بہرحال اسلام کسی قوم کی روایات کلچر اور قوانینِ معاشرت سے تعصب برتنے کا قائل نہیں ہے۔ اُس نے اصولی اعتبار سے انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کیا ہے لیکن تمدن کی تعمیر میں وقتی طور پر جو جزئی ضروریات پیش آجاتی ہیں۔ اُن کی تکمیل کے لیے اگر مسلمانوں کو کسی قوم کی کوئی اصلاحی کوشش اچھی معلوم ہو تو اُس کو بے تکلف اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسلام کی کسی اصل سے متصادم ہوکر اُس کی حقیقی روح کے خلاف نہ ہو۔ صحیح حدیث ہے الحکمۃ ضالۃ المومنِ فحیث وجدھا فھو احق بھا[1] حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے۔ جہاں کہیں ملے اُس کو حاصل کرلینا چاہیے کیونکہ وہی اُس کا زیادہ حق دار ہے۔

ایک اور حدیث ہے جس کو محدثین نے حسن کہا ہے، اُس کے الفاظ یہ ہیں۔ اطلبوا العلم ولو بالصین فان طلب العلمِ فریضۃٌ علیٰ کُل مُسلمٍ[2] علم طلب کرو، اگرچہ وہ چین میں ہو۔ کیونکہ علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میمنت مہد میں غنیمت میں جو مال آتا تھا اُسی وقت تقسیم ہو جاتا تھا۔ اور بیت المال سے سالانہ عطیہ و وظیفہ کے مقرر ہونے کی نوبت ہی نہ آئی تھی آپ کے بعد حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا، مگر وہ اتنا مختصر تھا کہ اُس میں کوئی دفتری اصلاح نہ ہو سکی

[1] رواہ الترمذی عن ابی ہریرہ۔ [2] رواہ العقیلی وابن عدی والبیہقی وابن عبدالبر عن انس۔

پھر جب حضرت عمر کے عہد میں عراق و شام فتح ہوئے۔ اور اموالِ غنیمت کے انبار لگ گئے۔ تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ باقاعدہ رجسٹر بنائے جائیں اور ہر ایک کو اس کے مرتبہ و اہلیت کے مطابق وظائف تقسیم کیے جائیں۔ حضرت عمر کو اول تو مال کی کثرت دیکھ کر اتنا تعجب ہوا کہ اُس کا یقین ہی نہ کر سکے۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ بحرین سے آنے کے بعد میں حضرت عمر کی خدمت میں عشاء کے وقت حاضر ہوا، جاتے ہی سلام کیا۔ حضرت عمر نے لوگوں کا حال پوچھا۔ میں جواب دیتا رہا۔ پھر دریافت فرمایا۔ کیا لائے ہو؟" میں نے عرض کیا "پانچ لاکھ" فرمایا کچھ جانتے بھی ہو کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے پھر وہی کہا "پانچ لاکھ" حضرت عمر نے اس مرتبہ بھی وہی فرمایا۔ میں نے اپنی ایک ایک انگلی کو کھول کھول کر کہا کہ یہ ایک لاکھ، یہ ایک لاکھ۔ اسی طرح پانچوں انگلیاں کھول دیں اور کہا کہ یہ پانچ لاکھ ہوئے حضرت عمر کو اس دفعہ بھی یقین نہیں آیا۔ اور فرمایا کہ سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟ اچھا اب جاؤ اور صبح کو پھر آنا۔ ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ صبح کو میں حاضر خدمت ہوا۔ تو حضرتِ عمر نے پھر وہی سوال کیا اور میں نے وہی جواب دیا۔ اب دریافت کیا کہ یہ مال درست اور طیب بھی ہے؟ ابو ہریرہ نے کہا "میں تو یہی جانتا ہوں"۔ اس کے بعد حضرت عمر نے لوگوں کو خطاب کیا اور فرمایا "ہمارے پاس بہت مال آیا ہے، اب تم بتاؤ میں اس کو تول تول کر تم پر تقسیم کروں یا اُس کو اندازہ سے دے دوں ایک شخص بولا۔

یا امیر المومنین انی قد رأیت ھؤلاء الاعاجم یدونون دیوانا یعطون الناس علیہ۔ | اے امیر المومنین! میں نے ان عجمیوں کو دیکھا ہے کہ یہ دفتر بناتے ہیں اور اُس کے مطابق لوگوں کو دیتے ہیں۔

حضرت عمر نے اس تجویز کو شرف قبول عطا فرمایا، اور دفتروں کی ترتیب کا حکم دے دیا۔[1]

مسلمانوں کی اسی بے تعصب ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ وہ جب کسی ملک میں گئے، اور وہاں کوئی

[1] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ مصر ص ۴۵۰

بات بھی نظر آئی۔ اُنھوں نے اُس کو بے تکلف اختیار کرلیا۔ ۴۴ھ میں حضرت معاویہ برسرِ خلافت تھے آپ نے مہلب بن ابی صفرہ کی زیرقیادت ایک لشکرِ جرار سندھ پر فوج کشی کے لیے روانہ کیا۔ قیقان پہنچ کر مہلب نے اٹھارہ ترک سوار دیکھے جن کے گھوڑوں کی دُمیں کٹی ہوئی تھیں (فوجی گھوڑوں کی عموماً دُمیں کاٹ دی جاتی ہیں اور غالباً اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ گھوڑے جنگ کے موقع پر چست و چالاک رہیں۔ اور لانبی دم میں اُلجھ کر گر جانے کے خوف سے مامون ہو جائیں) مہلب نے کہا۔

ما جعل هٰؤلاء الاعاجم اولیٰ بالتشمیر منّا[1] — ان عجمیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا یہ چستی و چالاکی کے لیے ہم سے زیادہ مستحق ہیں۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے سب گھوڑوں کی دُمیں کٹوا دیں بلاذری کہتے ہیں کہ مہلب مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے گھوڑوں کی دُمیں کٹوائیں[2]۔

مہلب کے زورِ الفاظ پر غور کیجیے۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر اچھی چیز کا حاصل کرنا مسلمان کا اپنا ذاتی حق ہے۔ اُس کو حاصل کرنے کی راہ میں کسی قوم کی بیگانگت اور اجنبیت رُکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ مسلمان کا طغرائے امتیاز عدل ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کو اُس کی جگہ میں رکھنا یعنی تحقیق کی نظر سے کسی شے کی حقیقت کو دیکھنا۔ اور پھر اگر اچھی ہو تو اُسے اچھی کہنا، اور بُری ہو تو اُس سے اجتناب و احتراز کرنا عدل کے بالمقابل ظلم کا لفظ ہے جس کی تعریف ہے وضع الشیٔ فی غیر محلہٖ یعنی کسی چیز کو اُس کے مرتبہ میں نہ رکھنا۔ اس تعریف کے بموجب جس طرح ایک ناکردہ گناہ انسان کو سزا دینا ظلم ہے۔ ایک واقعی مجرم و خطاکار کو یونہی معاف کر دینا بھی ظلم ہے۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر امر فرمایا گیا ہے کہ عدل و انصاف کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی اور بغض تم کو عدل کے راستہ سے منحرف کر دے

---

[1] بعض لوگوں نے اس کو تشمیر پڑھا ہے جس کے معنی چست و چالاک ہو جانے کے ہیں۔ اور تشمیر کے معنی پرواز نشاط ہوتا ہے۔

[2] فتوح البلدان بلاذری باب فتوح السندھ۔ ۵۴

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ پھر فرمایا جاتا ہے۔

اِعْدِلُوْا، ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی عدل کرو، یہ عدل ہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان تحقیق اللہ عدل اور احسان کا حکم کرتا ہے۔

پھر اسی آیت میں آگے چل کر ہے:۔

وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی اور منع کرتا ہے (اللہ) بیہودہ اور ناپسندیدہ باتوں سے اور حد سے تجاوز کرنے سے

یہاں ظلم کے مفہوم کو بغی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اچھی چیز کو برا کہنا اور بری شے کو اچھا سمجھنا

حد سے تجاوز کرنا (بغی) ہے۔

ایک حدیث میں ہے:۔

لقد شقیت ان لم اعدل میں البتہ شقی ہونگا اگر عدل نہیں کرونگا۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ کسی چیز کو اختیار کرنے سے قبل اُسے خوب اچھی طرح پرکھ لینا اور میزان

عقل میں تول لینا چاہیے۔ اور اُس کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ کر اُس کے ترک و اختیار کی نسبت کوئی

فیصلہ کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ اور جس چیز کا تم کو علم نہیں ہے۔ اُس کا اتباع مت کرو۔ کان،

وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے اُس کے متعلق سوال ہوگا۔

حضرت معاویہ کے متعلق مشہور ہے کہ اہل عجم کی کہانیاں بڑے شوق سے سُنتے تھے، اور یہی وجہ

ہے کہ اُنھوں نے خلافت کے نظم ونسق، اور ملک کے اہتمام وانتظام میں جو بعض جدتیں کی تھیں اُن

میں ایران کا اثر نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام نے اپنے پیرووں میں بے تعصب ذہنیت نہ پیدا

کی ہوتی تو حضرت معاویہ ایسے "عربیت" کے ساتھ شدید تعصب رکھنے والے بزرگ کو اس طرح کی جدت

در غبت نہ ہوتی۔

ایک طرف اسلام کی اس تعلیم کو سامنے رکھیے، اور دوسری جانب اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کیجیے کہ اسلام دنیا میں حق کا آخری پیغام ہے۔ اور اُس کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں اُن کو ہدایت کی شمع ربانی دکھا کر کامیابی کی منزلِ مقصود تک پہنچا دینا چاہیے پس ظاہر ہے کہ یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ غیر مسلموں کے ساتھ میل جول میں اور اختلاط وارتباط میں علیحدگی نہ برتی جائے اور اُن سے چھوت چھات کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے۔

جب کوئی قوم کسی ملک میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتی ہے تو طبعی طور پر اُس میں ایک طرح کا پندار تفوق اور احساس برتری ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ مفتوح قوم کے افراد کے ساتھ معاشرت میں، معاملات میں اور روزمرہ کے معمولاتِ زندگی میں تحقیر و تذلیل کا برتاؤ کرتی ہے لیکن اسلام میں یہ انتہائی معیوب بات اور شدید ترین معصیت ہے کہ کوئی ایک شخص دنیوی برتری کے باعث کسی دوسرے بندۂ خدا کو حقیر سمجھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔

اپنے گالوں کو لوگوں کے سامنے پھلاؤ مت، اور زمین پر اکڑ کے مت چلو۔ اللہ تعالیٰ کسی متکبر اور گھمنڈ کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ

اے ایمان والو کوئی قوم دوسری قوم سے ٹھٹول نہ کرے ممکن ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔

فاتحانہ شان کے ساتھ الگ تھلگ رہنا اور مفتوح اقوام کے ساتھ استحقار کا معاملہ برتنا کجا! حکم دیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ میل جول رکھنا چاہیے تاکہ آپ اپنے اخلاق فاضلہ اور اسلامی عادات

کے سبب اُن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اور پھر آپ کے لیے تبلیغ کلمۂ حق، اور ارشاد وہدایت کی راہیں خود بخود کھل سکیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ

اور اچھائی اور برائی دونوں برابر نہیں ہیں۔ تم ایسی ترکیب سے مدافعت کرو جو بہترین ہو تو پھر جس سے تمہاری دشمنی ہے وہ بھی پکا دوست ہو جائیگا۔

اسلامی کیرکٹر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ لوگوں کو چھل فریب کرنا اور آج کل کی ڈپلومیسی پر عمل کرنا نہیں سکھاتا۔ اُس کی دوستی اور دشمنی دونوں سورج کی طرح روشن اور عیاں ہوتی ہے وہ جس کا دوست ہے دل وجان سے اُس کے حق دوستی کو ادا کرنے کا عہد پیمان بھی کرتا ہے اور اُس کو تمام رکاوٹوں کے باوجود سچائی کے ساتھ نباہتا ہے۔ اور اگر وہ کسی کا دشمن ہے تو کھلا ہوا، برملا اور علانیہ دشمن ہے۔ وہ جنگ کرتا ہے مگر بہادر اور شریف انسانوں کی طرح، بزدلوں، کمینہ فطرت اور ذلیل انسانوں کی طرح دوستی کا اظہار کرکے دشمن کو زیر کرنے کی فکر میں لگا رہنا اُس کی فطرت سے بہت بعید ہے۔

کسی ملک کے فتح ہو جانے کے بعد جب امن وامان قائم ہو جائے، اور مفتوحہ اقوام مسلمانوں کی سیادت کو تسلیم کرلیں تو اب وہ سب پرانے دشمنانِ خونخوار مسلمانوں کے دوست ہو جاتے ہیں۔ اسلامی حکومت اُن کو اپنے ذمّۂ حفاظت کی پناہ میں لے لیتی ہے۔ یہ سب لوگ اسی بنا پر ذِمّی کہلاتے ہیں غیروں کو اپنانے کی مثال اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ اُن سب کو برملا یہ خوشخبری سُنا دی جاتی ہے کہ "جو حقوق ہمارے ہیں وہی تمہارے بھی ہیں اور جو چیزیں ہم پر واجب ہیں تم پر بھی ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ اٰذٰی ذِمِّیًّا فَقَدْ اٰذَانِی — جس شخص نے کسی ذمی کو تکلیف دی اُس نے مجھ کو تکلیف دی۔

ایک اور روایت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

مَنْ اٰذٰی ذِمِّیًّا فَاَنَا خَصْمُہٗ وَمَنْ کُنْتُ — جو شخص کسی ذِمّی کو تکلیف پہنچائیگا میں اُس سے جھگڑا کرونگا اور

خصمہٗ خصمتہٗ یوم القیامۃ — جس سے میں جھگڑا کرونگا قیامت میں میں اُس پر غالب آجاؤنگا۔

قبطیانِ مصر جو کہ نصاریٰ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق حکم فرمایا تھا۔

اِذا فتحتم مصر فاستوصوا باھلھا — جب تم لوگ مصر فتح کرو تو وہاں کے لوگوں کے ساتھ بھلائی کا معا

خیرًا فانّ لکم منھا صھرا وذمّۃ[1] — کرنا۔ کیونکہ اُن سے تمہارے سسرالی اور عہد پیمان کے تعلقات ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اُسامہ کی زیر قیادت شام کی مہم پر لشکر بھیجا تو انہیں صاف لفظوں میں نصیحت کی:۔

لا تخونوا ولا تغدروا ولا تغلّوا — تم خیانت نہ کرنا، غدر اور فریب نہ دینا اور غنیمت میں بددیانتی نہ کرنا۔

پھر آگے چل کر فرمایا۔

وسوف تمرّون باقوامٍ قد فرّغوا — اور تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزروگے جنہوں نے اپنے آپ کو

انفسھم فی الصوامع فدعوھم وما فرّغوا — گرجوں میں بند کر رکھا ہے، تو تم انہیں اور جس کے لیے انہوں نے

انفسھم لہٗ — ایسا کیا ہے اُسے، دونوں کو چھوڑ دو۔

مسلمانوں کے یہی وہ اخلاقِ فاضلہ تھے جن کی بدولت انہوں نے جہاں کہیں گئے اقوام کے دلوں کو فتح کرلیا۔ اور اُن کی تمام توجہات وعنایات کو اپنے اندر جذب کرلیا۔

محمد بن قاسم جس نے سندھ کی حکومت کو زیروزبر کرکے رکھ دیا جب سندھ سے واپس ہونے لگا تو یہاں کے لوگوں کو اُس کی جُدائی کا بیحد افسوس ہوا، اور اُس کی رخصت کے وقت یہ سب لوگ زار زار روئے۔ یہاں تک کہ مقام کیرج میں انہوں نے محمد بن قاسم کا ایک اسٹیچو بنا کر رکھا۔[2]

بیان بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ اسلامی تعلیم کی رو سے غیر قوموں کے ساتھ ملنے کے وقت مسلم

[1] الاسلام روح المدنیۃ۔ ص ۱۲۱۔
[2] فتوح البلدان بلاذری۔ باب فتوح السندھ

کو حسب ذیل امور کی رعایت کرنی چاہیے۔

(۱) مسلمانوں کو غیروں کے ساتھ فاتحانہ تمکنت وغرور کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

(۲) بلکہ اُن کے ساتھ بے تکلف معاشرت رکھنی چاہیے۔

(۳) غیر قوموں میں جو نقائص ہیں حسن تدبیر سے اُن کی اصلاح کرنی چاہیے۔

(۴) غیر قوموں کے ساتھ سچائی۔ صفائی باطنی اور حسن اخلاق کا معاملہ کرنا چاہیے۔

(۵) غیر قوموں میں اگر کچھ اچھی چیزیں پائی جائیں جن سے معاشرت، معیشت اور عام اجتماعی وتمدنی معاملات میں مدد مل سکے اور وہ اسلام کی کسی اصل کے خلاف بھی نہ ہوں اُن کو قبول کر لینا چاہیے۔

(۶) کسی معاملہ میں بیجا تعصب اور تنگ نظری کو دخل نہ دینا چاہیے بلکہ ہر شے کے حسن وقبح کو اچھی طرح میزان عدل وعقل میں تول کر اُس کی نسبت کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہے۔

اب آئیے دیکھیں مسلمان ان تعلیمات کو لیے ہوئے غیر ملکوں میں گئے تو تاریخی اعتبار سے اُس کے کیا نتائج ہوئے۔ انھوں نے دوسروں کو کس قدر اپنے رنگ میں رنگا اور خود انھوں نے اپنے تمدن کی تعمیر کے لیے کس کس ملک سے خشت وسنگ فراہم کیے۔

افادات علامہ ابن جوزیؒ

(از)

مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی۔

علامہ ابن جوزیؒ کی کتاب "صید الخاطر" کا ضروری تعارف پچھلے خواطر میں کرایا جا چکا ہے، اس دفعہ حسب وعدہ کتاب کی بعض فصلوں کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

مطالعہ کے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہئے۔

(۱) کتاب کا تعلق کسی خاص فن اور کسی خاص موضوع سے نہیں، ایقاظ و اصلاح کی توقع پر دل کی باتوں کو زیادہ سے زیادہ سادہ و بے تکلف لفظوں کے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔

(۲) فنی بحثوں اور علمی موشگافیوں کے ردّ و کد میں پڑ کر حقائق کو الجھایا نہیں گیا۔ جس چیز کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے وہ اسلوب بیان او طریق خطاب کا اصلاحی اور عملی پہلو ہے۔ یہی کتاب کا جوہر ہے۔ اور تمام مضامین اسی ایک محور پر گھومتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مصنف اس کتاب میں ایک محدث اور محقق کی حیثیت میں ظاہر نہیں ہوتے بلکہ سراپا نصیحت بن جاتے ہیں۔ اور یہ رنگ اُن پر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ مسائل کی علمی تحقیق و تفتیش کی بھی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ مطالب و معانی کی تحقیق کے لحاظ سے کتاب کے بہت سے حصے تشنہ ہیں، حالانکہ محدث ابن جوزی جیسے بے پناہ اور برق پاش خطیب کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں تھا کہ جس مسئلہ پر چاہتے تحقیق کا حق ادا کر دیتے۔ بس بات وہی ہے کہ وہ بے تکلفانہ واردات قلب کو اُن کی قدرتی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کو اچھی طرح اندازہ

کہ کادشوں اور بحثوں کے الجھاؤ اصلاح وہدایت کی باتوں کو کتنا بے اثر کر دیتے ہیں۔

(۳) مؤلف اپنی سخت گیری اور تشدد کے لئے تاریخی شہرت رکھتے ہیں اور یہ اُن کے مزاج کا ایسا خاصہ ہے جو کسی وقت اور کسی حالت میں اُن سے جُدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کی یہ خصوصیت اِس کتاب میں بھی جگہ جگہ نمایاں ہے۔

(۴) خود اگرچہ بہت بڑے صاحب باطن ہیں تاہم اصطلاحی تصوف پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے جذبات اِس قدر تیز ہو جاتے ہیں کہ عام حالات میں اُن کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

علمار کے سینوں میں بغض و حسد کی آگ کیوں مشتعل ہے؟

اہل علم میں تباغض و تحاسد کا یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے؟[1] جہانتک میں نے غور کیا مجھ تو یہ اندازہ ہوا کہ جن علمار پر دنیا کی محبت چھا گئی ہے وہی اس مرض میں گرفتار ہیں۔ یعنی یہ روگ علمار دنیا میں پایا جاتا ہے علمار آخرت اِس سے پاک ہیں اور ان کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ مودّت و مؤانست اُن کے چہروں سے ٹپکتی ہے، بغض و حسد کا اُن کے آس پاس بھی گذر نہیں ہوتا۔ وہ ایثار کا پیکر، خلوص کا نمونہ اور محبت کی تصویر ہوتے ہیں۔ کذا قال تعالیٰ۔

---

[1] حضرت شاہ عبد العزیز رحمہ نے فتح العزیز میں حسد کے مراتب اور اسباب پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے ایک عجیب بات تحریر فرمائی ہے فرماتے ہیں اس خصلت ذمیمہ کا نہایت ہی قبیح پہلو یہ ہے کہ بدقسمتی سے علما میں یہ مرض زیادہ پایا جاتا ہے "وسرش آنست کہ اینہا قدر نعمت خدا را بیشتر می فہمند و بسبب نبودن آں نزد خود و بودن آں نزد غیر خود نہایت متاذی می گردند و طبع ایشاں بحسد می گراید" یعنی اس گروہ میں حسد کی کثرت کا راز یہ ہے کہ بہ نسبت عوام کے انکو خدا کی نعمتوں کی زیادہ قدر ہوتی ہے پھر جب وہ اُن نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم پاتے ہیں اور دوسروں میں دیکھتے ہیں تو انہیں بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے اور اُنکی طبیعت حسد کی خوگر ہو جاتی ہے۔ پھر فرماتے ہیں یہی بنا پر بزرگوں کا قول ہے کہ چھ فرقے بیحساب اور بے اندازہ آتش دوزخ کی نذر ہوں گے جن میں ایک فرقہ اُن علمار کا ہوگا جنہیں حسد کی بدولت عذاب میں ڈالا جائیگا۔"

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا	نہیں پاتے اپنے دل میں تنگی اُس چیز سے جو مہاجرین کو دیجائے
وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ	اور مقدم رکھتے ہیں انکو اپنی جان سے اگرچہ اپنے اوپر فاقہ ہو۔(۲)

وَقَالَ تَعَالٰى

وَالَّذِيْنَ جَاءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا	اور اُن لوگوں کے لئے جو آئے اُن کے بعد کہتے ہوئے اے
اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ	رب! بخش ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان میں داخل
وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	ہوئے اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے۔

ابو الدرداء صحابیؓ کا دستور تھا کہ ہر شب اپنے ملاقاتیوں کی ایک جماعت کے لئے خاص طور پر دعا کیا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ کے صاحبزادے سے فرمایا "صاحبزادے! تمہارے والد اُن چھ بزرگوں میں سے ایک ہیں جن کے لئے روزانہ رات کے آخری حصہ میں دعا کرتا ہوں"۔(۳)

دونوں جماعتوں کو اُنکے اصلی خط و خال میں دیکھنا چاہو تو اس طرح دیکھ سکتے ہو۔

علماءِ دنیا ریاست و اقتدار کے نشہ میں سرشار رہتے ہیں، شہرت کا سودا اُنکے دماغ میں سمایا رہتا ہے

---

۵۵ آیۃ میں انصارِ مدینہ کی ایثار پیشگی کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا گیا ہو یعنی مہاجرین کے متعلق انصار کے ایثار و محبت و خلوص کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو جو شرف مرحمت فرمایا اُسے دیکھکر انصار نہ صرف یہ کہ دل تنگ نہیں ہوتے بلکہ خوش ہوتے ہیں اور اُن کو اپنی جان سے مقدم رکھتے ہیں۔ سختیاں جھیل کر اور فاقے اٹھا کر بھی اُن کو آرام پہنچا سکیں تو پہلو تہی نہیں کرتے۔

۵۶ سبحان اللہ ائمہ ہدیٰ کی یہی شان ہوتی ہے، ایکطرف مسائل اجتہادیہ میں دونوں اماموں کے ہنگامہ خیز اختلافات کا اندازہ کرو، اور دوسری طرف اس محبت و احترام کا۔

قبول عام کی تمنا اُن کے دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے۔

سب سے زیادہ جو چیز انہیں مرغوب ہے وہ یہ ہے کہ عوام پروانوں کی طرح اُن کے گرد جمع ہوں اور اُن کی مدح سرائی میں رطب اللسان۔

اس کے بالمقابل علمائے آخرت اِن رسمی چیزوں سے بالکل بے تعلق بلکہ نفور ہوتے ہیں، یہاں تک کہ سلف صالح کی عادت تھی کہ اگر کوئی عالم شہرت اور قبول عام کے امتحان میں مبتلا ہو جاتا تو انہیں اُس کے متعلق یہ اندیشہ ہوتا مبادا کہیں اسے ٹھوکر نہ لگ جائے، بار بار یہ کلمہ اُن کی زبان پر ہوتا۔ "اللہ اس پر رحم فرمائے"۔

ابراہیم نخعیؒ کی یہ حالت تھی کہ صورتِ جاہ سے بچنے کے لئے ستون سے کمر تک نہیں لگاتے تھے۔

علقمہؒ فرماتے ہیں کہ میں اس بات کو بہت ہی ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ میرے پیچھے پیچھے ہوں اور میرے متعلق یہ شہرت ہو کہ یہ علقمہ جا رہے ہیں۔

بعض سلف کا طریقہ تھا کہ جیسے اُن کے پاس چار آدمیوں سے زیادہ کا مجمع ہوا اور وہ اُٹھے۔

متقدمین عام طور پر جواب استفتاء کے لئے اقدام نہیں کرتے تھے۔ معاملہ کو ایک دوسرے پر محمول کر دینا اُن کی عام عادت تھی، وہ نمود کی نسبت خمول کو پسند کرتے تھے۔

اعجاب بالنفس

کتنے ہی ارباب علم و زہد کو مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو ظاہر میں زہد و اتقاء اور علم و عمل کا پیکر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جب اُنکی اندرونی حالت کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ اُن کے دل کی گہرائیوں میں کبر و نخوت کے بُت چھپے ہوئے ہیں اور معاملہ کی سطح ایسی ہوتی ہے کہ اس تکبر کا ان کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ کوئی حاسدانہ نگاہوں سے اپنی پستی اور اپنے ہمعصروں کے مقام کی بلندی دیکھتا ہے اور کڑھتا ہے۔ کوئی ایک نادار مفلس مریض کی عیادت اس لئے نہیں کرتا کہ اُسے اپنے سے کمتر جانتا ہے۔ اس قسم کے زہد فروشوں کی

حرکتیں بھی عجیب مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔

اسی قماش کے ایک گروہ کو جس کے تقدس کا عام طور پر چرچا تھا ایک دفعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں کوئی کہہ رہا تھا میں احمد بن حنبل کے مزار کے قریب مدفون ہوں گا گویا بزبان حال اپنے اس استحقاق اور خصوصیت کا اعلان کر رہا تھا۔ کوئی یوں کہتے سنا گیا کہ مجھے میری مسجد کی فلاں جانب میں دفن کرنا، وہ اسی توقع پر مست تھا کہ اس کی قبر معروف کرخی (مشہور بزرگ) کی طرح زیارت گاہ عوام بنے گی۔

باتیں تو یہ معمولی سی معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے ان عادتوں کا نتیجہ بیحد نقصان رساں بلکہ انتہا مہلک ہوتا ہے کہ اُسکی ہلاکت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

افسوس اُن کی کوتاہ فہمی پر جو نہیں جانتے کہ اس باب میں نبی کریم صلعم کا ارشاد کیا ہے؟

ارشاد مبارک یہ ہے۔

مَنْ ظَنَّ اَنَّہٗ خَیْرٌ مِّنْ غَیْرِہٖ	جس نے اپنے متعلق دوسروں سے بہتر ہونے کا گمان کیا
فَقَدْ تَکَبَّرَ۔	درحقیقت وہ تکبر کے جال میں پھنس گیا۔

اور سچ یہ ہے بہت ہی کم ہیں جو اعجاب بالنفس کی معصیت سے محفوظ ہوں۔ حیرت ہوتی ہے کہ آخر انسان اپنے سے اس درجہ حسن ظن کیونکر رکھ سکتا ہے اگر عالم نہاد علم کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہئے اس سے پہلے کتنے علما گذر چکے ہیں جنکے شرف کی گرد بھی اس مدعی علم کو نہیں لگی، اگر یہ مراقبہ و عبادت کا اثر ہے تو ظاہر ہے بڑے بڑے عبادت گذار جن کے تقدس کی کرنیں ابتک دنیا کو منور کر رہی ہیں اس سے سبقت لیجا چکے ہیں، اور اگر یہ مال و دولت کا خمار ہے تو معلوم ہو دولت میں کوئی ذاتی فضیلت نہیں۔

آدمی غور کرے اور اپنے نفس کی خصلتوں اور معصیتوں کی رنگینیوں کا جائزہ لے تو اُسپر روشن ہو جائے کہ اُسکے لئے جس قدر یقینی اپنی لغزشیں اور معصیتیں ہو سکتی ہیں دوسرے کی نہیں ہو سکتیں۔ دوسروں کی نسبت اُسکے ذرائع معلومات کتنے ہی وسیع ہوں تاہم وہ دوسروں کے احوال ہیں جنہیں یقین کا درجہ نہیں دیا جا سکتا پس جس چیز کے سایہ سے بھی پناہ مانگنے کی ضرورت ہے وہ اعجاب بالنفس ہے۔

لطائفِ ادبیہ

دعوت و پیغام

حضرت ساغر نظامی

اے جرأتِ حسنِ نظر سوزاں اِدھر دیکھ ۔۔۔ غماز ہے وارفتگیٔ چشم و نظر دیکھ

کس دن کے لئے ہے یہ ترا ذوقِ نظر دیکھ ۔۔۔ خود جلوہ سراپائے تقاضہ ہے اِدھر دیکھ

اُٹھنے کو ہے محفل میں قیامت کی نظر دیکھ ۔۔۔ کچھ دیر میں کارِ جہاں زیر و زبر دیکھ

کچھ موت نہیں منزلِ انجامِ سفر دیکھ ۔۔۔ عقبیٰ بھی ہے دُنیا کی طرح راہگزر دیکھ

مرنا تو کجا عشق میں آساں نہیں جینا ۔۔۔ حسرت ہی ترے دل کو تو یہ کام بھی کر دیکھ

ہر شے پہ جو اُس جانِ تماشا کا ہو دھوکا ۔۔۔ یہ ذوقِ نظر ہے کہ مرا سحرِ نظر دیکھ

منظر جسے کہتے ہیں ترا رنگِ نظر ہے ۔۔۔ اس رُخ سے کبھی آئینۂ شام و سحر دیکھ

پردے تری آنکھوں سے نہ اُٹھ جائیں تو کہنا ۔۔۔ تنہائی میں ایک روز کبھی رقصِ شرر دیکھ

پروانہ ہے اک آن میں خاکسترِ محفل ۔۔۔ اے چشمِ ہنر باز یہ انجامِ ہنر دیکھ

قربت کی جلالت سے فضا کانپ رہی ہے ۔۔۔ پہلے انہیں پھر جنبشِ ہر پردۂ در دیکھ

آوارہ ہیں کیوں تیرے لئے شام و سحر آج! ۔۔۔ تکتے ہیں تجھے دُور سے کیوں شمس و قمر دیکھ

مستوں کو تو آئینہ ہے ہر قطرۂ صہبا

ساغر کے تموّج میں رمِ شام و سحر دیکھ

حدیثِ گلستاں

جناب اعجاز صدیقی "اڈیٹر" شاعر آگرہ

حسیں ہر شے معلوم ہوتی ہے، جواں معلوم ہوتی ہے
جوانی میں ہر اک شے، دل ستاں معلوم ہوتی ہے

بہار آئی ہے، دُنیا گلفشاں معلوم ہوتی ہے
جوانی بھی بہ رنگِ نو، جواں معلوم ہوتی ہے

تجلی سی شریکِ جسم و جاں معلوم ہوتی ہے
نظر اُس جلوہ گر میں کامراں معلوم ہوتی ہے

محبت میں، وفا کس کو گراں معلوم ہوتی ہے
مگر اب آپ کہتے ہیں تو ہاں معلوم ہوتی ہے

تپش اندوز جس نے کر دیا تھا قلبِ موسیٰ کو
وہ بجلی آج بھی دل میں نہاں معلوم ہوتی ہے

بنا لوں اپنے دل کو گلکدہ اِتنی اِجازت دے
تری ہنستی نظر تسکینِ جاں معلوم ہوتی ہے

زمانہ گوش بر آواز ہے، تارے ہوں یا کلیاں
بڑی دلکش ہماری داستاں معلوم ہوتی ہے

کسے گلچیں اماں دے، اور بچائے باغباں کس کو
تباہی آشیاں در آشیاں معلوم ہوتی ہے

فضا میں چودھویں کا چاند جب انگڑائی لیتا ہے
"زمینِ تاج" رشکِ کہکشاں معلوم ہوتی ہے

تباہیٔ چمن کی تیرہ سامانی کو کیا کہئے
مجھے بجلی چراغِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

شکستہ پا اندھیری رات منزل دور، واماندہ
یہ گردشِ امتحانِ کارواں معلوم ہوتی ہے

مٹا ڈالا چمن آرائیوں نے میں نہ کہتا تھا
کہ بجلی پر بنائے آشیاں معلوم ہوتی ہے

عجب اِک شعبدہ سا ہے فریبِ ہستیٔ فانی
نہیں ہے اور دنیا جاوداں معلوم ہوتی ہے

بیاباں خلد آتا ہے نظر صحرا نشینوں کو
بہت رنگیں حدیثِ گلستاں معلوم ہوتی ہے

ہے اُن کا ہاتھ دل پر اور ہونٹوں پر تبسم ہے
کہوں کیا ٹیس اب دل میں کہاں معلوم ہوتی ہے

ں اس بجلی سے اپنے آشیاں کی خیر کیا مانگوں ۔۔۔ جو خود محتاجِ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نہیں کہنے کی بات اعجازؔ لیکن واقعہ یہ ہے

ابھی اُردو ہماری ہی زباں معلوم ہوتی ہے

بربطِ احساس

جناب حکیم سید ابوالنظر صاحب رضوی

دِل نوازی، اِک خیالِ خام ہے ۔۔۔ فطرت ساغر، صلائے عام ہے

اب نہ ساقی ہے، نہ کوئی جام ہے ۔۔۔ اُٹھ گئی محفل، خدا کا نام ہے

بربطِ احساس، نازک چیز ہے ۔۔۔ بانگِ گل تو، تلخیٔ دشنام ہے

اعتبارِ رنگ و بو سے کیا غرض ۔۔۔ ہستیٔ گل ہسیلِ مے کا نام ہے

ہر نگہ میں ہے، نمود سیمیا ۔۔۔ ہر نفس میں، رازِ صبح و شام ہے

خفتۂ روز ازل ہے، بخت کیا؟ ۔۔۔ جو صبح سے شام تک بھی شام ہے

اُٹھ رہی ہے موج مے لیکن ہنوز ۔۔۔ ذرّہ ذرّہ تشنۂ یک، جام ہے

اِنقلاب زندگی ہے، زندگی ۔۔۔ موت دل کی، خستگی کا نام ہے

ہوگیا وقفِ جنوں، ہر ہر نفس ۔۔۔ کیا شعورِ زیست، اس کا نام ہے

معنیٔ صد زندگی، حُسنِ عمل ۔۔۔ جس کا ہر آغاز، خود انجام ہے

صبحِ اخترؔ، کائناتِ اِنقلاب

شامِ اخترؔ، خُلدِ ہر ہر گام ہے

فکرِ شہیدؔ

از جناب شہیدؔ سیوہاروی

صبحِ عشرت چاہیے اور شامِ ہجراں چاہیے
زندگی میں اک تلاطم خیز طوفاں چاہیے

منزلِ مقصود کی تکمیل ہو ہی جائیگی
ہر قدم پر جلوہ گاہِ حسنِ جاناں چاہیے

خود ہی جھک جائے جبینِ نازِ بربائے نیاز
دل پریشاں، سینہ بریاں، چشمِ گریاں چاہیے

لوٹ لی پہلے اشارے ہی میں تو نے کائنات
اور کیا اب اے نگاہِ فتنہ ساماں چاہیے

کس لئے طوق و سلاسل تو ترستا ہے تو شہیدؔ
کچھ تو اے وحشی تجھے آدابِ زنداں چاہیے

مصباح الفرقان فی لغات القرآن

اِس کتاب میں حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے پہلے لفظ پھر اُس کے معنی اور پھر تیسرے خانہ میں الفاظ سے متعلق صرفی و نحوی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ لفظ اگر فعل ہو تو اسکا مادۂ اشتقاق اور اصل باب۔ اور اگر وہ اسم ہے تو مفرد کی جمع اور جمع کا مفرد۔ یہ چیزیں تو ہر لفظ کے ساتھ بالالتزام اور اُن کے علاوہ جگہ بجگہ دوسری مفید باتیں بھی بیان کردی گئی ہیں۔ انبیاء کرام کے جہاں جہاں نام آئے ہیں اُن کے حالات مختصراً بتائے گئے ہیں۔ یہ کہنا بے مبالغہ ہے کہ اُردو زبان میں لغات القرآن پر اب تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی یہ کتاب عام طلبہ اور اُن انگریزی داں اصحاب کے لئے بہت مفید ہو جو صرف قرآن مجید کے ترجمہ پر ہی اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہر لفظ کی معنی کیساتھ اسکا مادۂ اشتقاق اور صیغہ بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب ۲۰×۲۶/۴ کی بڑی تقطیع پر شائع ہوئی ہے طباعت و کتابت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت للعہ۔ خریداران رسالہ برہان سے ۱۲؍ روپے۔

منیجر مکتبہ "برہان" قرول باغ۔ نئی دہلی سے طلب فرمائیے۔

شئون علمیہ

عیسائیت پر امام غزالی کا ایک نادر و نایاب رسالہ

حجۃ الاسلام امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے اپنی مشہور کتاب "احیاء علوم دین" میں حضرت عیسیٰ کے اقوال کثرت سے نقل کئے ہیں۔ اندلس کے مشہور مستشرق (Asin palacious) نے ان تمام اقوال کو ایک جگہ پر جمع کر کے شائع کیا۔ اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ ان میں سے دو قولوں کے سوا کوئی قول حضرت عیسیٰ کا نہیں ہے اور یہ ان کی طرف غلط طور پر منسوب کر دئے گئے ہیں۔ امام غزالی کے ارادتمندوں کے لئے یہ چیز انتہائی رنج والم کا سبب تھی۔ لیکن وہ ابتک یہ ثابت نہیں کر سکے تھے کہ امام غزالی نے یہ اقوال کہاں سے لئے ہیں۔

مقام شکر ہے کہ استنبول کی ترکی کتب خانہ میں اب امام غزالی کا ایک رسالہ دستیاب ہوا ہے جس کا نام "الرد الجمیل لالٰھیات عیسٰی بصریح الانجیل" ہے۔ یہ رسالہ آٹھ سو برس تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ اور کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کی اشاعت کا اہتمام کرتا۔ پیرس کی یونیورسٹی "سوربون" سب مسلمانوں کے شکریہ کی مستحق ہے کہ اُس نے اپنی تصنیفات عالیہ کے سلسلہ میں اب امام غزالی کے اس رسالہ کو شائع کرنیکا ارادہ کیا ہے۔ کامل توقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اقوال حضرت عیسیٰ کے متعلق امام غزالی کا ماخذ کیا ہے؟ اس اطلاع کا سہرا پروفیسر "ماسینیون" کے سر ہے جس نے سب سے پہلے اسطرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ اور بتایا کہ امام غزالی کا یہ قلمی نسخہ استنبول میں محفوظ ہے اور اس میں حضرت عیسیٰ کے وہ تمام اقوال ملتے ہیں جو امام موصوف نے اپنی کتابوں میں نقل کئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان اقوال سے متعلق امام عالی مقام کا ماخذ کیا ہے؟ خود اصل انجیل یا اس کا عربی ترجمہ۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ ۴۹۵ھ کے قریب جب امام موصوف بیت المقدس میں گوشہ نشین ہونے کے بعد اسکندریہ میں تشریف لائے تھے تو یہاں انکو انجیل کا عربی ترجمہ ملا ہوگا۔ اور آپنے اس سے

استفادہ کیا ہوگا۔

مصر کے رسالہ الہلال میں ایک ذی علم خاتون جنہوں نے اپنا نام فقط "بنت الحارث" لکھا ہے۔ امام غزالی کے اس مخطوطہ پر ایک مضمون شائع کرایا ہے۔ اس میں خاتون محترمہ لکھتی ہیں کہ میں نے خود استنبول کے کتب خانہ میں جاکر اس مخطوطہ کا بغور مطالعہ کیا۔ اور یونانی و سریانی زبانوں سے انجیل کے جو تراجم ہوئے ہیں اُن سے امام صاحب کے مخطوطہ کا مقابلہ بھی کیا مجھکو امام صاحب کے اس نسخہ میں اور مذکورہ بالا تراجم میں کافی فرق نظر آیا۔ اب رہا یہ کہنا کہ یہ مخطوطہ انجیل کے اُس نسخہ سے ماخوذ ہے جو قبطی سے عربی میں ترجمہ ہے۔ خاتون فاضلہ کا خیال ہے کہ یہ رائے بھی درست نہیں۔ کیونکہ امام غزالی کی وفات ۱۱۱۱ء میں ہو چکی تھی اور عربی زبان میں انجیل کا سب سے پہلا ترجمہ جو قبطی زبان میں ہو اس کی تاریخ ۱۱۶۵ء یا ۱۱۶۶ء میں ملتی ہے یعنی امام غزالی کی وفات سے ۵۴-۵۵ برس بعد بہر حال یہ معمہ اب بھی ناقابل حل ہے کہ امام صاحب کی ان معلومات کا ماخذ کیا ہے؟ ممکن ہے آپ کو انجیل کا کوئی ایسا مترجم نسخہ ملا ہو جو اب تک دستیاب نہ ہو سکا ہو۔

جرمنی میں شادی کے متعلق دس ہدایتیں

تہذیب جدید میں شادی کا مقصد شہوانی خوش وقتی (Sexual pleasures) سمجھا جاتا ہے اور اس کے لئے خاندان وغیرہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ پھر میاں بیوی کے لئے اسلام نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کا بھی قطعاً کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ الہلال مصر نے جولائی کی اشاعت میں رسالہ نیوا سے تلخیص کر کے شادی کی دس ہدایتیں نقل کی ہیں جو جرمنی میں نازی حکومت کی "وزارت تبلیغ" کی طرف سے شادی کے خواہشمند نوجوانوں کے نام شائع کی گئی ہیں۔ اُن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کس طرح تمدن جدید کی ہلاکتوں سے تنگ آکر پھر فطرت انسانی کی اُسی اصل روشنی پر چلنے کے لئے بیتاب ہو رہی ہے جس کا سب سے پہلا داعی صرف اسلام ہی ہے۔

(۱) تمکو سب سے پہلے یہ خیال کرنا چاہئے کہ تم جرمنی ہو۔ اور جتنے بھی تمہارے کام ہیں سب اپنی قوم اور اپنے ملک کی فلاح و بہبودی کی خاطر ہونے چاہئیں۔ ذاتی منفعت اور حظ نفسانی کو اُس میں دخل مت دو۔ کوشش کرو

کہ تمہاری شادی تمہاری قوم کے لئے ترقی وعروج کا باعث ثابت ہو۔

(۲) اپنے دماغ کو مادی منفعتوں سے بالکل پاک وصاف رکھو۔ شادی کے معاملہ میں ان کا کوئی دخل نہ ہونا چاہئے۔ تم ہمیشہ اپنے نفس اور اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ سچے رہو۔

(۳) اگر تم کسی مرض متعدی میں گرفتار نہیں ہو تو تم پر واجب ہے کہ شادی کرو۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ایسی اولاد پیدا کرو جو تمہارے نام کی حفاظت کرے۔ تمہاری روحانی وراثت کی صحیح طور پر وارث ہو۔ اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ جو شخص طاقت واستطاعت کے باوجود شادی نہیں کرتا وہ جرمنی قوم کا دشمن ہے اور وہ نیم شعوری طور پر اپنی قوم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

(۴) شادی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک محبت مگر نفسانی نہیں جو شباب گزرنے پر مضمحل ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ غیر شہوانی محبت جو انسان کی روح کو ہر وقت بیدار اور تکمیل فرض پر آمادہ رکھتی ہے۔ اور دوسری چیز دل کی تونگری ہے (خَیرُ الغِنا غِنَیٰ النفسِ) جس پر ایک بڑی حد تک خانگی زندگی کی بہبودی اور فلاح کا دارومدار ہے۔ تم کو ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ کہیں جذبات تمہاری عقل کو مغلوب نہ کریں۔ اندھی محبت تباہ کن ہوتی ہے۔ جہانتک ہو سکے بیوی کے انتخاب میں عقل سے کام لو۔

(۵) ہر جرمنی مرد اور عورت کا فرض ہے کہ وہ اپنے لئے شریک حیات کا انتخاب اپنے ہی قبیلہ و خاندان میں کرے۔ مختلف خاندانوں کا اختلاط عموماً بدبختی کا باعث ہوتا ہے۔ جرمن قوم کے ہر ہر فرد کو یقین کرنا چاہئے کہ وحدتِ خون کی حفاظت اس کا سب سے بڑا اور اہم وطنی فریضہ ہے۔

(۶) بیوی کا انتخاب کرنے سے پہلے اُس کے خاندان کی خوب تحقیق کر لو۔ کیونکہ شادی کے ذریعہ درحقیقت تمہارا تعلق ایک ایسی عورت سے ہو رہا ہے کہ جو اپنے عادات وخصائل کا مجموعہ ہوگی۔

(۷) یاد رکھو روحانی فضائل وکمالات بالوں اور آنکھوں کے رنگ کی طرح موروثی ہوتے ہیں جو خاندان کے ایک فرد سے دوسرے افراد میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ شریف خون دنیا میں سب سے زیادہ

قیمتی چیز ہے۔

(۸) بیوی کا طبی معائنہ برابر کراتے رہو۔ بغیر صحت و تندرستی کے جمال و تونگری بے حقیقت چیزیں ہیں

(۹) شادی کے معاملہ میں یہ مت دیکھو کہ تم کس کے ساتھ زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ بلکہ اس کا دھیان رکھو کہ کونسی عورت زندگی کی دشوار گذار راہوں میں تمہاری رفاقت کی زیادہ سے زیادہ اہلیت و صلاحیت رکھتی ہے۔ اور اس امر کو فراموش نہ کرو کہ شادی کا مقصد تندرست اولاد پیدا کرنا ہی

(۱۰) شادی کے ذریعہ جہاں تک ہو سکے نسل بڑھانے کی کوشش کرو۔ اُبوّت یعنی باپ بننے سے تمکو نفرت نہیں بلکہ اُس کی خواہش اور تمنا کرنی چاہئے۔ ہر گھر میں کم از کم چار بچے ہونے چاہئیں۔ تاکہ افزائش نسل سے قوم کو طاقت و قوت حاصل ہو۔ تمہارا شخصی وجود کوئی چیز نہیں۔ فنا ہو جانے والا ہے۔ ہاں! اگر تمہاری قوم زندہ ہے تو تم بھی زندہ رہوگے۔

معاہدۂ سعد آباد کا تاریخی ارتقار

معاہدہ سعد آباد جو معاہدۂ مشرق کے نام سے معروف ہے اُسکی تفصیلات اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں شاید اس کا علم کم لوگوں کو ہو کہ اس معاہدہ کی تاریخ ارتقاء کیا ہو۔ ہم ذیل میں مصر کے رسالہ المقتطف سے ایک طویل مقالہ کا بہت ہی مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں جس سے اس معاہدہ کی اجمالی تاریخ کا علم ہوگا۔

جنگ عظیم کے بعد صورت حال ایسی رونما ہوئی کہ دنیائے اسلام کی چاروں حکومتوں (ایران۔ افغانستان ترکی اور عراق) میں وہ رشتۂ ارتباط قائم نہیں رہ سکا جو اسلامی حکومت ہونے کے اعتبار سے اُن میں قائم ہونا چاہئے تھا۔ مسرت کا مقام ہے کہ اب اُن میں پھر اتحاد و یکجہتی کا تعلق قائم ہو رہا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد ایران اور ترکی میں سب سے پہلا دوستانہ معاہدہ ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں ان دونوں حکومتوں نے آپس میں ایک اقتصادی عہدنامہ کیا۔ پھر جب ۱۹۲۹ء میں دونو سلطنتوں نے اپنی اپنی حدود مملکت کو متعین کر لیا تو یہ علاقۂ ارتباط اور بھی مستحکم اور مضبوط ہو گیا۔ اور دونوں میں دوستانہ

نامہ وپیام کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہانتک کہ جون ۱۹۳۴ء میں شاہ رضا پہلوی والی سلطنت ایران نے انگورہ واستنبول کی سیاحت کی۔ اسی سلسلہ میں ماہ ستمبر میں مجلس اقوام میں جو نشست خالی ہوئی تھی ایران ترکی کی خاطر اُس کی امیدواری سے دست بردار ہوگیا۔ پھر ستمبر ۱۹۳۴ء میں ترکی نے بھی احسان کا بدلہ احسان سے دیا۔ یعنی ایران کی خاطر مجلس الاقوام کی ممبری سے دستکش ہوگیا

افغانستان اور ایران دونوں جگہ ایک ہی زبان فارسی بولی جاتی ہے۔ اور افغانستان ایرانی شہنشاہیت کا جزو رہا ہے۔ البتہ تعین حدود کے مسئلہ نے ۱۹۲۱ء میں ان میں ایک بے چینی پیدا کر دی تھی۔ لیکن حکومت ترکیہ کے دخل سے ایک کمیٹی کے ذریعہ جون ۱۹۳۴ء میں یہ مسئلہ طے ہوگیا۔ اور اُس کے بعد ۱۹۳۷ء کے معاہدہ سعد آباد (طہران) پر دونوں نے دستخط کر کے اپنے تعلقات دوستی کو مضبوط کر لیا۔

اب رہا ایران وعراق کا معاملہ! تو ان دونوں میں پہلے پہل بڑا اختلاف تھا۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ عراق کی حکومت جدید نے عراق میں آباد ہونے والے ایرانیوں کو شہری حقوق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس بناپر ایران بھی عراق کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا۔ پھر جب ۱۹۳۱ء کے ماہ اپریل میں شاہ فیصل نے طہران کی زیارت کی تو یہ شہری حقوق کا معاملہ بھی طے ہوگیا۔ اور اُدھر حکومت ایران نے عراق کی حکومت کو بھی تسلیم کر لیا۔ درمیان میں تعین حدود کے مسئلہ نے پھر ایک اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ ایران اس معاہدہ کو قبول کرنے سے انکار کرتا تھا جو ۱۹۲۳ء میں ترکی اور ایران کی حدود کو متعین کرنیکے سلسلہ میں ہوا تھا لیکن عراق کا اصرار تھا کہ اُسکو ہی باقی رکھا جائے ۱۹۳۳ء میں عراق کے وزیر خارجہ نے جمعیت الاقوام سے اس قضیہ کو ختم کرنیکے لئے مداخلت کی درخواست کی چنانچہ اس مقصد کیلئے جمعیت نے اطالوی نمائندہ کو بھیجا اور شکر کا مقام ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ایران وعراق دونوں ایک عہدنامہ پر متفق ہوگئے۔ پھر جولائی ۱۹۳۷ء میں اس علاقہ اتحاد کو مزید سیاسی۔ اقتصادی اور فضائی معاہدوں کے ذریعہ اور مستحکم کر دیا اُس کے بعد سعد آباد (طہران) میں جو معاہدۂ مشرق ہوا تھا۔ اُسمیں ان دونوں حکومتوں نے بڑے ہی شد ومد کیساتھ حصہ لیا۔ (س)

نقد و نظر

اقبال کی شاعری

مؤلفہ جناب مولوی عبدالمالک صاحب آروی، سلسلۂ "طاق بستان آرہ" تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت متوسط صفحات ۶۶۔

یہ دراصل ایک علمی مقالہ ہے جو یوم اقبال کی تقریب میں ۹ جنوری ۳۸ء کو شاہ آباد اُردو لائبریری کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ فاضل مؤلف نے اس مقالہ میں سب سے پہلے اُردو شاعری کے مختلف ادوار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ پھر اقبال اور اُس کی شاعری کے عنوان سے اس پر بحث کی ہے کہ اقبال کی شاعری کن اثرات سے متأثر ہے ہمارے خیال میں یہ بحث ایک بڑی حد تک سیر حاصل ہے اس کے بعد اقبال کی "صوفیانہ شاعری" "اقبال اور اسلامیات"۔ "اقبال اور بین الاقوامی تأثرات" ان عنوانات کے ماتحت اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے "اقبال کی فلسفیانہ شاعری" کے زیر عنوان۔ اولاً فلسفہ کی حقیقت، اُس کے اسکول اور زندگی سے متعلق مغربی فلاسفہ کے مختلف نظریے بیان کئے گئے ہیں۔ پھر اقبال کی فلسفیانہ شاعری کے اجزاء ترکیبی بتائے ہیں۔ مقالہ کا اہم اور طویل باب یہی ہے۔ اس کے بعد اقبال کی سیاسیات اور اس کے ادبی انداز اور زبان پر چند خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ مقالہ۔ مقالہ کے اعتبار سے بہت جامع اور مکمل ہے ورنہ اقبال کی شاعری پر بحث کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے غالب پر جو فلسفیانہ مقالہ لکھا تھا اور جو "محاسن کلام غالب" کے نام سے عرصہ ہوا کہ شائع ہو چکا۔ زیر نظر مقالہ اسی انداز پر اقبال کی شاعری پر لکھا گیا ہے جو اپنی نوعیت میں بہت کامیاب ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے متعدد مقام پر اقبال کو "حالی اسکول" کی پیداوار کہا ہے

اس میں اس سے اختلاف ہو۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زبوں حالی نے حالی اور اقبال دونوں کو متاثر کیا اور دونوں نے قومی شاعری کی ایک نئی طرح ڈالی۔ شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچہ میں بالکل بجا کہا ہے کہ "اگر غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے" واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے طرز و انداز اور زندگی کی حقیقت نگاری میں غالب کا رنگ تو نظر آتا ہے۔ لیکن اُس کو حالی اسکول کی پیداوار کہنا صحیح نہیں" حالی کی حیثیت صرف ایک "واعظ قوم" کی ہے جو اپنی "شعلہ مقالی" سے برہم زن ہنگامہ محفل" بھی ہے۔ لیکن اقبال ایک عمیق النظر فلسفی، ایک دقیقہ رس حکیم، اور ایک بلند پایہ خطیب کی حیثیت سے خطاب کرتا ہے صحیفہ زندگی کا ایک ایک باب۔ اقوام کے عروج و تنزل کے نفسیاتی اسباب۔ اور انسانیت و روحانیت کے تمام مدارج و مراتب اُسکی نگہ حقیقت بیں پر عیاں ہیں۔ اور وہ اُنکا (Scientific analysis) علمی تجزیہ کرکے ایک ایک پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ "ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

حالی کو صرف ایک غمدیدہ ماں کی طرح رونا آتا ہے۔ لیکن اقبال زندگی اور موت کا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ حیات اقوام کی بقا و فنا کی تفسیر کرتا ہے۔ اور پھر اپنے "پیغام عمل" سے مشرق کی اقوام مردہ کی رگوں میں حیات نو کی رُوح دوڑا دیتا ہے۔ حالی صرف مسلمانوں کو بُرا بھلا کہنا جانتے ہیں۔ لیکن اقبال استعمار فرنگ اور تمدن فرنگ کے عفریت خون آشام کے سر پر ایک گرز گراں بھی مارتا ہے اور اُس کی ہلاکتوں کو بیان کرکے مسلمانوں کو اُس سے بچنے کی دعوت دیتا ہے۔

حالی صرف ایک مولوی ہیں۔ اقبال فلسفہ مشرق و مغرب کے جامع، قدیم و جدید نظریات و افکار سے واقف، اور مستعمرین فرنگ کی سیاسی چالوں سے پوری طرح باخبر بھی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اس بنا پر اقبال کو "حالی اسکول" کی پیداوار کہنا ایک طائر سدرہ نشین کو ہم پرواز عقاب و شاہیں قرار دینا ہے۔

آخر میں فاضل مقالہ نگار نے اقبال کی زباندانی پر جن لوگوں نے اعتراضات کئے تھے اُن کو محققانہ

جوابات دیئے ہیں۔ مگر پھر خود ہی یہ تسلیم کرلیا ہے کہ ان کے یہاں ادب وانشا کی خامیاں ضرور ہیں۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کا وطن مرکز زبان سے بہت دور سیالکوٹ میں واقع ہوا ہے ہماری رائے میں اول تو جس چیز کو خامی کہا جاتا ہے وہ خامی نہیں۔ بلکہ ذوق اختراع وایجاد کی ایک جستہ بے پروا کا مظاہرہ ہے جو اقبال ایسے جدت پسند، تمدن سے خوگر اور ٹھوس فلسفیانہ مضامین بیان کرنے والے شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔ اور پھر بقول جناب مؤلف "غرابت بیان کے بالمقابل اس کی کوئی حقیقت نہیں"۔

ان دو ایک جزوی باتوں سے قطع نظر، یہ مقالہ اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ارباب علم وادب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

الاصلاح

دائرۂ حمیدیہ کا ماہوار علمی ومذہبی رسالہ اڈیٹر مولانا امین احسن اصلاحی مقام اشاعت سرائے میر اعظم گڈھ۔ چندہ سالانہ للعہ روپیہ۔

مولانا حمید الدین صاحب فراہی دور آخر کے اُن نامور علماء ہند میں سے تھے جنہوں نے اپنی زندگی ہمیشہ قرآن مجید کے معانی وحقائق پر غور وفکر کے لئے وقف رکھی اور جنہیں خداوند تعالیٰ نے ایک خاص قسم کے ذوق قرآنی سے نوازا تھا۔ دائرۂ حمیدیہ مولانائے مرحوم کی یادگار میں قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد مولانا مرحوم کی تصنیفات اور اردو میں ان کے تراجم شائع کرنا ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ بھی الاصلاح کے نام سے نکلتا ہے۔

یہ رسالہ قرآنی حقائق پر اعلیٰ قسم کے مضامین پیش کرتا ہے۔ تحریکات جدیدہ سے متعلق بھی ایک آدھ مفید مضمون ہوتا ہے۔ شذرات میں عموماً جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ہمارے خیال میں وہ سنجیدہ ومتین

اور قابل قبول ہوتے ہیں اور انداز بیان بھی دلچسپ ہوتا ہے لیکن بعض مواقع پر پیرایۂ بیان طنز و تعریض کا طرز اختیار کر لیتا ہے۔ رسالہ بحیثیت مجموعی بلند پایہ، مفید اور اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہے۔ مسلمانوں کو اس کی قدر کرنی چاہئے

"قائد" مراد آباد

مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں اب چند برسوں سے ایسے علماء و افاضل کا اجتماع ہو گیا ہے جو اپنی علمی لیاقت و قابلیت کے باوجود عملی سرگرمی، بیدار مغزی اور خلوص و ایثار کے اعتبار سے طبقۂ علماء میں ایک نمایاں مقام کے مالک ہیں۔ ان سب حضرات کی متفقہ کوششوں سے اب وہاں سے ایک ماہانہ رسالہ "قائد" کے نام سے جاری کیا گیا ہے جس میں مختلف قسم کے دلچسپ اور کارآمد مضامین شائع ہوتے ہیں جیسا کہ رسالہ کے ٹائٹل پیج پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مذہبی اقتصادی اور فقہی مضامین ہوتے ہیں اور سیاسی دنیا کے زیر عنوان مہینہ بھر کے مفید سیاسی معلومات کا خلاصہ بھی درج کیا جاتا ہے۔ پھر کبھی کبھی فسانہ و نظم کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ اور چند صفحات میں کوئی عربی مضمون ہوتا ہے جو مدارس عربیہ کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ ترقی کریگا۔ کتابت طباعت عمدہ اور ضخامت ۴۴ صفحات قیمت سالانہ عمدہ کاغذ ۳؎ معمولی کاغذ ۲؎ جو رسالہ کی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ منیجر صاحب رسالہ قائد مراد آباد کو طلب فرمائیے

"نور" جالندھر

یہ ماہانہ رسالہ جالندھر سے اسد اللہ خاں صاحب کی زیر ادارت شائع ہوتا ہے اسکی جلد ۱ نمبر ۱۲ کا پرچہ ہمیں بغرض ریویو موصول ہوا ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر لکھا ہوا ہے "علمی، ادبی، اخلاقی، اجتماعی تفریحی، صنعتی و تجارتی" اس میں جو مضامین درج ہیں کسی نہ کسی حیثیت سے ان عنوانات کے ماتحت آسکتے ہیں۔ ہماری مسلم نوجوان خواتین میں جو نئے سیاسی خیالات پیدا ہو رہے ہیں اُن کا اندازہ اُس نظم سے ہوتا ہے جو نور کے اس پرچہ میں سرمایہ دار سے خدا کے سوالات کے زیر عنوان محترمہ زیب عثمانیہ گولڈ میڈلسٹ کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ اس نظم سے اگرچہ نومشقی کا انداز ظاہر ہوتا ہے لیکن خیالات کی سچائی ضرور قابل داد

ہے۔ متعدد دلچسپ افسانوں کے علاوہ ہمارے عزیز سید محمد ازہر شاہ کا مضمون "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" پڑھنے کے لائق ہے۔ بچوں کے صفحہ میں مذہبی معلومات آسان اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہیں، اخیر کے تین صفحات میں تکیہ اور رومال وغیرہ پر کاڑھنے کے لیے پھولوں کے خاکے دیے گئے ہیں۔ ضخامت ۸۴ صفحات لکھائی چھپائی متوسط۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ۔

"ہمدردِ صحت" کا تپ دِق وسل نمبر

ہندوستان کا سب سے زیادہ مشہور اور کم قیمت طبی پرچہ "ہمدرد صحت" دہلی ہر سال کسی خاص موضوع پر اپنا ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع کرتا ہے۔ چنانچہ امسال اس سالہ کا تپ دق وسل نمبر بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اور گذشتہ نمبروں کی طرح ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس خاص نمبر میں مشرق و مغرب کے اساتذۂ فن کے قیمتی مضامین دق اور سل کے مختلف پہلوؤں کے متعلق درج ہیں جن میں بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی انسائیکلوپیڈیا میں دق اور سل کے متعلق جس قدر تحقیقی مضامین ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں جمع ہیں۔ اخیر میں حسب معمول "ادبیات" کے زیرِ عنوان متعدد طبی افسانے ہیں جو زبان و بیان اور افادیت کے اعتبار سے دلچسپ ہیں۔ دق اور سل کی صحت گاہوں کے حالات بھی ہیں۔ ہندوستانیوں کی صحت عامہ کے متعلق اعداد و شمار بھی۔ کتابت و طباعت عمدہ اور دیدہ زیب۔ ارباب ذوق کو اس کی قدر کر کے حکیم عبدالحمید صاحب کی کوششوں کی عملی داد دینی چاہیے۔ سالانہ چندہ عہ/

"سب رس"

نگراں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ۔ مدیر صاحبزادہ میر محمد علی میکشؔ طباعت وکتابت عمدہ تعداد صفحات ۱۰۰، سائز $\frac{20 \times 30}{8}$۔

یہ ماہوار رسالہ "ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن" کیطرف سے شائع ہوتا ہے۔ ابتک آٹھ پرچے نکل چکے ہیں۔ اپنے نام کے مطابق اس میں ہر قسم کا مزہ (سب رس) مہیا کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ نظم و نثر کے عمدہ عمدہ مضمون اس میں شائع ہوتے ہیں۔ مضمون نگاروں میں قابل خواتین کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ اگر "سب رس" خواتین کے ذوق کو ادبِ لطیف اور افسانہ نگاری سے ہٹا کر علمی، معاشرتی اور اخلاقی مضامین لکھنے کی طرف منتقل کر سکے تو ہمارے خیال میں یہ بھی ملک کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔ "سب رس" کے مضامین صحت زبان، خیالات کی پاکیزگی، انداز بیان کی دلکشی اور معلومات کی فراوانی کے اعتبار سے مطالعہ اور قدردانی کے مستحق ہوتے ہیں۔ اُمید ہے کہ یہ رسالہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زورؔ۔ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی ایسے مخلص اور قابل و فاضل ادیب کی نگرانی میں خوب کامیابی حاصل کرے گا۔

اشرف القواعد مولوی محمد یعقوب صاحب شاہجہانپوری نے یہ آسان قاعدہ مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم کیلئے مرتب کیا ہے اور اسمیں تعلیم قرآن کے لئے جن قاعدوں کا جاننا ضروری ہے اُن سب کو الگ الگ آسان صورت میں لکھا ہے۔ ہر قاعدہ کے ساتھ اُسکی مشق بھی دی گئی ہے اور اُس کیلئے صرف قرآنی الفاظ کا ہی انتخاب کیا گیا ہے تاکہ بچوں میں شروع سے ہی قرآن خوانی کا ذوق پیدا ہو جائے۔ حروف کی کتابت میں بچوں کی رعایت سے تلفظ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور تمام حروف کو اعراب کے ساتھ الگ الگ لکھا ہے۔ یہ قاعدہ حروف تہجی کی شناخت اور تلفظ سکھلانے کے لئے مفید ہے۔

الادب مولوی ضیاء النبی عباسی صاحب فاضل دیوبند کی ادارت میں مدرسہ اشاعت العلوم کانپور سے ہر مہینہ $\frac{20 \times 30}{8}$ کے سائز ۳۲ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ مضامین مذہبی، علمی اور

ابی ہوتے ہیں۔ عربی ادبیات کے زیر عنوان کوئی عربی نظم۔ یا عربی مضمون
جو عربی خواں طلبہ کے لئے مفید ہے۔ ضرورت ہے کہ علمائے کرام موجودہ زمانہ کے رجحانات
کی جدید تحریکات کی حقیقت اور ان کے اثرات و نتائج سے واقف ہو کر جدید قسم کے اصلاحی مضامین
لکھنے کی طرف توجہ کریں اور فقہ کی جزئی بحثوں میں پڑ کر اصل کام سے غافل نہ ہوں۔ کہ آج "جنگ جمل" کا
وقت نہیں "بدر و حنین" کا معرکہ گرم ہے۔ ہمیں امید ہے کہ "الادب" کا ادارہ ہماری درخواست پر توجہ کریگا۔
رسالہ میں زبان کی سلاست اور انداز بیان کی شستگی کا خیال خاص طور پر رکھنا چاہئے قیمت قسم اعلیٰ ۶ر قسم اوسط

(س)

برہان
مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

برھان

جلد اوّل — شمارہ ۴

شعبان ۱۳۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

فہمِ قرآن

قرآن مجید نے خود اپنے تئیں آسان کہا ہے ارشاد ہے :-

وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ — اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو سہل کر دیا تاکہ لوگ اُس سے

فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر — نصیحت حاصل کریں تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنیوالا۔

یہ آیت سورۃ القمر میں متعدد بار آئی ہے۔ سورۃ کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے اور اُن لوگوں پر شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی میں دن رات مشغول رہتے ہیں اور داعیِ حق کی آواز کو بالکل نہیں سُنتے۔ پھر علی الترتیب قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط کی نافرمانی و سرکشی اور قہرِ الٰہی سے ان کے تباہ و برباد ہو جانے کا بیان الگ الگ ایسے انداز میں کیا گیا ہے جس کو سُن کر سخت سے سخت منکر کا بھی دل لرز جائے اور ہر واقعہ کو ذکر فرمانے کے بعد بطور تنبیہ دریافت کیا گیا ہے

فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ — (دیکھو) میرا عذاب دینا اور ڈرانا (اُن کے حق میں) کس طرح پورا ہوا۔

فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر — پس کیا کوئی ہے (اس سے نصیحت حاصل کرنیوالا؟

اور مذکورۂ بالا آیت میں نصیحت حاصل کرنے کے لیے قرآن کی آسانی اور سہولت کو بیان فرما کر اس سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

ایک اور موقع پر سورۂ مریمؑ میں ارشاد ہے :-

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا

اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ تم اُس کے ذریعے پرہیزگاروں کو بشارت سُناؤ اور جھگڑالو توموں کو ڈراؤ دھمکاؤ۔

اب اِن دونوں آیتوں کے نفس مطلب اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیجیے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں اُس کے آسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ پہلی آیت کا سیاق اور اُس کا ماقبل سے ربط آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ اُس سے صاف طور پر یہی متبادر ہوتا ہے کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کی آسان کتاب ہے۔ اُس میں عبرت و بصیرت کے لیے جگہ جگہ اقوام کہن کے واقعات کا بیان ہے، اور خدا کے وجود حق کو ثابت کرنے کے لیے قدرت کی ایسی واضح نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کا ایک ایک ذرہ مبدأ فیاض کے وجود و ثبوت اور اُس کی قدرت بے مثال کا زبانِ حال سے اعلان کر رہا ہے۔ یہ سب باتیں اُن کو قرآن مجید سے ہی معلوم ہوتی ہیں اس لیے اس عالم کون و فساد میں ہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہوا۔ تو کیا پھر کوئی ہے جو اس سے موعظت گیر ہو اور نصیحت حاصل کرے؟

پانی کا برسنا، برق کی چمک، رعد کی گرج، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا آفتاب کا مشرق سے طلوع کرنا اور مغرب میں غروب ہو جانا، موسموں کا تغیر و تبدل، انسان کا عدم سے وجود میں آنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا، چشموں کا اُبلنا، کھیتوں کا سرسبز و شاداب ہونا، پتھروں سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا، اور اونٹ کی عجیب و غریب خلقت یہ اور اسی طرح کی دسیوں نشانیاں جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں، ایک انسان بار بار اُن کو دیکھتا ہے لیکن اُس کا ذہن اُن کے صانع و خالق کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نہایت فصیح و بلیغ پیرایۂ بیان میں اُن کا ذکر کرتا ہے اور لوگوں کو

دعوت دیتا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے اصل منشا روباعث اور اُن کی علتِ فاعلہ پر غور کریں ظاہر ہے یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کا دیکھنا، سمجھنا، ان سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا، چنداں مشکل و دشوار نہیں ہے۔ صرف ضرورت اس کی ہے کہ آدمی اس طرف متوجہ ہو پس اسی بناء پر قرآن مجید نے اپنے تئیں آسان کہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تیسر قرآن کا ذکر کرکے للذکر یعنی نصیحت کے لیے" فرمایا گیا، اور پھر ارشاد ہوا، فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟

دوسری آیت جو اوپر نقل ہوئی ہے اُس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ چنانچہ صاف طور پر ارشاد گرامی ہوتا ہے:۔

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۔ ہم نے قرآن کو اس لیے آسان کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو خوشخبری سنائیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر صاف، واضح اور روشن ہیں کہ وہ لوگ جن کے دل میں عناد و تعصب کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں اُن کو سُن کر شاد کام فلاح ہو جائینگے اور جو فرط عداوت سے انکار و جحود کی قسم کھا بیٹھے ہیں اُن کو قرآن کی آیات وعید سُن کر تنبّہ ہوگا، اور وہ سمجھینگے کہ جو قادر مطلق عاد و ثمود کی سرکش قوموں کو صفحۂ ہستی سے بے نام و نشان کرسکتا، اور قوم لوط پر پتھروں کی بارش کرکے اُنہیں مسمار کرسکتا ہے وہ ان سرکشوں کے ساتھ بھی اگر چاہے تو یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔

اس تقریر سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُس کی تعلیمات آسان ہیں۔ وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے وہ فلسفہ کے اصول موضوعہ کی طرح مخفی نہیں، بلکہ ہر ایک پر واضح ہیں۔ پھر اُن پر عمل کرنا بھی دشوار نہیں۔ کیونکہ قرآن کی راہ اصل

فطرت کی راہ ہے اور اُس کی روش وہی ہے جس کی طرف ہر انسان کی فطرتِ سلیمہ دعوت دیتی ہے

جہاں تک قرآن مجید کی نفس تعلیم کا تعلق ہے وہ بے شبہ اس قدر آسان ہے کہ ہر شخص خواہ عالم ہو، یا غیر عالِم، عربی ہو یا عجمی اُن کو معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، والدین اور اعزاء و اقرباء کے ساتھ احسان و کرم کا معاملہ کرو، شراب نہ پیو، زنا سے بچو، وعدہ پورا کرو، بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ یہ وہ احکام ہیں جن کو ایک عربی داں جس طرح سمجھ سکتا ہے۔ ایک غیر عربی داں بھی اُردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ "فہمِ قرآن" کے معنی کیا یہی ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھ کر بعض چیزوں کے متعلق حسن و قبح کے احکام معلوم ہو جائیں اور بس۔ اگر واقعی مراد یہی ہے تو پھر ہمیں اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ فہم قرآن سے غرض یہ ہے کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اُس کے واقعی اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے، اس کے معیار بلاغت کو دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضیٰ حال کیا ہے اور کسی چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے۔ اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے، اور یہاں مراد کیا ہے، تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد و غرض کے اعتبار سے فہم قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لیے خاص خاص شرائط و آداب ہیں کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں کوئی شخص فہم قرآن کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

ان شرائط و آداب میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری عربیت کا ذوق کامل ہے ذوق صرف مقامات حریری، دیوانِ متنبی اور دیوان حماسہ۔ یا ایم اے عربی کورس کے پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت و سرور حاصل ہو جو اُس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سُن کر حاصل ہوتا ہے۔

وہ عربی کے تمام محاورات، اُن کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔ ایک مفہوم کو مختلف طریقوں سے بیان سے ادا کیا جا سکتا ہے وہ جانتا ہو کہ ہر طریقہ کو دوسرے طریقۂ بیان پر کیا تفوق حاصل ہے۔ فرض کیجیے ایک جملہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ زید، آیا اور آج ــــ ہر صاحب ذوق جانتا ہے کہ ان میں ترتیب بدل دیجیے تو جملہ کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ذوق سے غرض یہ ہے کہ وہ ان باریک باریک فروق سے بھی واقف ہو۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے اور اس بنا پر مختلف معنیٰ مراد لیے جا سکتے ہیں لیکن اہل زبان کے نزدیک اُس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہاں وہی مُراد ہوتا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کا واقعہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے کسی پشاوری مرید سے جس کو دہلی میں رہتے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ فرمایا "میاں ذرا صراحی اُٹھا لانا اور دیکھنا پیٹ پکڑ کر اُٹھانا" مرید نے ایک ہاتھ سے صراحی کی گردن پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور اس شان سے صراحی حضرتِ اقدس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ حضرت مرزا صاحب کے فقرہ بالا میں "صراحی کا" لفظ محذوف ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ صراحی کا پیٹ پکڑ کر اُٹھانا۔ جو لوگ زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہاں صراحی کا لفظ محذوف ہی ہونا چاہیے تھا اگر اُس کو ذکر کر دیا جاتا تو لطف کلام جاتا رہتا۔

اب خیال فرمایئے اگر وہ پشاوری مرید اپنے استدلال میں یہ کہتا کہ آپ نے صرف پیٹ کہا تھا، یہ نہیں بتایا کہ کس کا؟ صراحی کا یا میرا اپنا، اس بنا پر دونوں مفہوم مراد ہو سکتے تھے پس اگر میں نے اُن میں سے ایک کو متعین کر لیا تو اس میں میری کیا خطا ہے۔ تو بتایئے آپ اس

پشاوری مرید کے استدلال کا کوئی منطقی جواب دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ آپ کے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ آپ اُس کو دہلی یا لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا حوالہ دیتے اور کہتے کہ کسی زباں داں سے پوچھو اس طرح کا جملہ بولتے ہیں تو وہاں پیٹ سے مُراد اپنا پیٹ ہوتا ہے یا مرا جی کا؟

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بولا جاتا ہے لیکن کسی خاص موقع پر اُس سے مُراد اُس کے اصل معنی نہیں ہوتے بلکہ اُس کے برخلاف اُس کی ضد مُراد ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک مریض کے پاس اُس کی عیادت کے لیے جائیے اور پوچھیے، کیا حال ہے؟ مریض جواب میں کہتا ہے "اچھا ہوں"۔

اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس جملہ کے دو متضاد مفہوم ہو سکتے ہیں۔ فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر مریض نے بیماری کی درازی اور صحت سے مایوسی کے عالم میں حسرت آمیز لہجہ سے "اچھا ہوں" کہا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ اس وقت مریض کا یہ اچھا کہنا شعر ذیل کا مصداق ہے۔

پوچھنے والوں نے میرا ناک میں دم کر دیا جس نے پوچھا حال دل کہنا پڑا کچھ بھی نہیں

اور اگر بیمار نے انبساطِ خاطر کے ساتھ اپنے تئیں اچھا کہا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی وہ اب اچھا ہے۔

بسا اوقات جملہ استفہامیہ بولا جاتا ہے، اور اس سے غرض کسی شے کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی ہو سکتا ہے اور استفہام انکاری کے طور پر کسی سے انکار کرنا۔ یا بطورِ استفہام اقراری کسی بات کا اقرار کرنا بھی مُراد ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو زبان کے ذوق سے بہرۂ وافر رکھتا ہو

اُس جملہ کو سُنتے ہی معلوم کرلیتا ہے کہ یہاں متکلم کی مراد یہ ہے۔ علمارِ بلاغت نے اسی بنار پر یہ کہا ہے کہ الفاظ میں ترادف ہے ہی نہیں۔ اور ایک کلام کا مطلب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے غیر زباں داں طرح طرح کی تاویلیں اور دور از کار توجیہیں کرتا ہے لیکن صحیح مخاطب جب اُس کلام کو سُنتا ہے تو فوراً ایک ہی مفہوم متعین کرلیتا ہے اور اُس کو توجیہات مختلفہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ بلاغت کے مدارج و مراتب لامحدود ہیں یعنی کسی کلام کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس پر بلاغت ختم ہے۔ کیونکہ بلاغت کی تعریف ہے کلام کا مقتضیٰ حال کے مطابق ہونا، اور ذرا ذرا سے فرق سے حال اور مقتضیٰ حال کی مطابقت کی اس قدر قسمیں پیدا ہوتی ہیں کہ اُن کا کوئی شمار ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فلسفۂ اخلاق میں کسی قوت کے اعتدال سے جو ملکہ پیدا ہوتا ہے فضیلت کہلاتا ہے۔ اور اس کے برخلاف قوت کی افراط یا تفریط سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں رذائل کہلاتے ہیں لیکن کسی ملکہ کا اچھا یا بُرا ہونا ایک دوسرے کے اعتبار سے ہی متصور ہوسکتا ہے۔ درحقیقت اُس کے اقسام کی تحدید و تعیین نہیں کی جاسکتی۔ تھوڑے تھوڑے فرق و امتیاز سے اور قوت کے اعتدال کی کمی بیشی کے لحاظ سے جس طرح رذائل بیشمار نکل آتے ہیں فضائل بھی اُن کے بالمقابل ناقابلِ شمار پیدا ہوجاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بلاغت کے مدارج و مراتب کا ہے۔ ایک کلام خواہ کتنی ہی بلاغت رکھتا ہو، کسی دوسرے کلام سے کمتر ہوسکتا ہے۔ ایک طرف بلاغت کے مدارج کا لامحدود ہونا پیشِ نظر رکھیے۔ اور دوسری طرف علمار بلاغت کا یہ فیصلہ دیکھیے کہ قرآن مجید بلاغت کے اُس انتہائی مرتبہ کو حاوی ہے جو کسی کلام کے لیے انتہائی سے انتہائی مرتبہ بلاغت ہوسکتا ہے۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عربیت کے ذوق صحیح سے مراد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ ائمۂ عرب کے کلام کی مزاولت و ممارست سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پورے طور پر سمجھ سکے۔ اُس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اُس کو فصیح و بلیغ کلام سُن کر حقیقۃً حظ آئے، اور بُرے کلام سے اُس کے ذوق کو صدمہ پہنچے۔ مومن کا یہ شعر مشہور ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہم اور آپ اس کو پڑھتے ہیں اور بقدر ذوق اُس سے لطف بھی اُٹھاتے ہیں لیکن مرزا غالب نے اس کو سُنا تو بیتاب ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان ہی دینے پر آمادگی کا اظہار کرنے لگے۔ پس یہ ظاہر ہے ایک شخص کا ذوق جتنا زیادہ لطیف و پاکیزہ ہو گا اُسی قدر وہ کلام بلیغ سے زیادہ محظوظ و شاد کام ہو گا، اور اُس کو زیادہ سے زیادہ باریکیاں نظر آئینگی۔

اس طرح کا ذوق عربیت سالہا سال کی عرق ریزی، محنت و کاوش، عمیق و وسیع مطالعہ اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ قرآنِ مجید بلاغت کے مرتبۂ قصویٰ پر حاوی ہے، اس لیے کوئی شخص بجز اُن بزرگانِ کرام کے جن کو خود صاحبِ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃ نبوت سے منور کیا ہو ادعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اُس نے سمجھا ہے۔

آج ہر شخص کو زبان و قلم کی آزادی حاصل ہے جو جی میں آتا ہے کہہ گزرتا ہے اور اُس کو اپنی طباعی و جودت قلم کی داد لینے کے لیے سب سے زیادہ آسان قرآن مجید ہی نظر آتا ہے لیکن جو چیز آج سب سے

زیادہ سہل ہے، کل علمائے حق کے لیے سب سے زیادہ مشکل اور احتیاط طلب تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے فقہائے مدینہ کو دیکھا کہ تفسیر قرآن کے باب میں حد سے زیادہ احتیاط برتتے تھے۔ ان میں سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، سعید بن المسیب اور نافع خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت شعبی فرماتے تھے: "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن، روح، اور قیاس (ابن جریر ج ۱ ص ۲۹)

اصمعی کو سب جانتے ہیں عربی لغت و ادب کا کتنا بڑا امام ہے۔ برسوں تحقیق لغات اور صحیح محاورات اور اُن کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے اور لفظ لفظ کے لیے عرب کے بدوؤں میں برسوں تک قیام کیا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں بالکل خاموش رہتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا: "عرب اس کے یہ معنیٰ بیان کرتے ہیں، میں نہیں جانتا اس سے مراد کیا ہے"۔ (المزہر ج ۲ ص ۱۲۰)

ابو الطیب کہتا ہے: "اصمعی سخت خدا پرست تھا۔ وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ کرتا تھا۔

اِن اکابرِ علم و ادب کی یہ احتیاط کوشی دیکھیے اور اِس کے بالمقابل آج کل کے ایک برخود غلط گریجویٹ کا ادعا ملاحظہ فرمائیے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"آج ایک گریجویٹ کو عربی ادب سے واقف کر کے دو سال بطور خود اسلامی مذہبی علوم کا مطالعہ کرنے کے لیے چھوڑ دو تو اگرچہ وہ آپ کی طرح علم و تقویٰ کا مدعی تو نہیں ہوگا لیکن وہ اسلام کو ہزار درجہ اُس قابل عربی داں کو بہتر سمجھیگا جس نے ابتدا میں قال اقول ہو سرمارا اور آخر میں قال رسول اللہ سے"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"مذہب اسلام کے سمجھنے کے لیے فلسفۂ مذہب، تاریخ مذہب، اقوام سامیہ کا لٹریچر، تاریخ انقلاب و علم انساب کی ضرورت ہے جو دیوبند یا ندوہ کی دسترس سے باہر ہے۔ مگر جو ایک انگریزی داں کے لیے ایک معمولی بات ہے۔"

جو لوگ دین کے معاملہ میں اس درجہ تساہل واقع ہوئے ہیں، غور کریں کہ دنیوی معاملات میں خود اُن کی تقلید کا کیا عالم ہے، آپ کسی شخص کو اس وقت تک ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ اُس نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں ڈاکٹری کا کورس پورا نہ کیا کسی شخص کے قانونی مشورہ کو اُس وقت تک درخور اعتنا نہیں سمجھتے جب تک کہ اُس نے باقاعدہ وکالت یا بیرسٹری کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ پھر ڈگری کی حیثیت کے اعتبار سے ڈگری یافتہ کے اعزاز و اکرام میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے ایم بی بی ایس یا ایل ایل بی کے قول کا وہ وزن نہیں ہوتا جو انگلینڈ کی کسی طبی ڈگری یا بیرسٹری کے ڈپلومے والے کا ہوتا ہے۔ "نیم حکیم" کے قول کو آپ "ہمیشہ خطرۂ جان" سمجھتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں آپ "نیم مولوی" کے فتوے کو "خطرۂ ایمان" قرار نہیں دیتے۔ ترجمہ کی مدد یا عربی کی معمولی شُد بُد حاصل کر لینے سے کسی کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ مدعیانہ رنگ میں اُن لوگوں سے دو چار ہو جنہوں نے اپنی عمریں انہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں، اور جنہوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسائشوں کو برباد کر کے قرآنی حقائق و معانی کی چھان بین میں خون پسینہ ایک کیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سائل کی حیثیت سے اپنے شکوک و شبہات کو علماء کرام کے سامنے پیش کریں، اور اُن سے جواب طلب ہوں لیکن آپ کے لیے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ چند مخصوص خیالات کو ذہن میں رکھ کر عربیت سے بالکل ناواقف ہو جانے کے بعد آپ مجتہدانہ رنگ میں کلام کرنے کے خوگر ہوں، اور جس امام کی بات

آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو آپ اُس پر بے تکلف تبرا شروع کر دیں۔ بس آپ کے لیے دو صورتوں کے سوا کوئی اور تیسری صورت نہیں ہے۔ یا خود عربیت کا ذوق پیدا کیجیے۔ علوم اسلامیہ کی تکمیل کرکے اُن میں بصیرت و نظر حاصل کیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو ائمۂ اسلام پر اعتماد کیجیے اور اُن کی بات مانیے۔ آج ہر وہ شخص جو فہم قرآن کا مدعی ہے اُس کو بتانا چاہیے کہ وہ کہاں تک اس دعوے کا اہل ہے قرآن بیشک آسان ہے لیکن کسی شے کے آسان ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اُس کے سمجھنے کے لیے نہ اُس کے مبادی جاننے کی ضرورت ہے اور نہ اُس کے لیے کچھ اصولِ موضوعہ ہیں جن کو سمجھنا اور غور کرنا ضروری ہو۔

امام ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں:۔

من زعم انّہ یمکنہ ان یفھم شیئاً من بلاغۃ القرآن بدون ان یمارس البلاغۃ بنفسہ فھو کاذبٌ مُبطِلٌ	جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت کی مشق و مارست کیے بغیر قرآن مجید کی بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے، وہ جھوٹا اور باطل گو ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغت قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر بھی نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں:۔

لا یتعظ الانسان بالقرآن فتطمئنّ نفسہ بوعدہٖ و تخشع لوعیدہٖ الا اذا عرف معانیہ و ذاق حلاوۃ اسالیبہ	کوئی شخص قرآن سے نصیحت پذیر نہیں ہو سکتا بایں معنی کہ کچھ اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے اور وعید سے لرز جائے جب تک کہ وہ اس کے معانی کو سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کر لیتا اور اس کے طریقہائے بیان کی شیرینی محسوس نہیں کرنے لگتا۔

(باقی)

حضرت یونسؑ کا ذکر قرآن مجید میں

از مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

حضرت یونس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) جن کو توراۃ کی زبان میں یوناہ یا یوناں کہا گیا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے موصل کے مشہور شہر نینوی میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجے گئے۔ نینوی آشوریوں کی زبردست حکومت کا پایۂ گاہ تھا اور بت پرستی اُس زمانہ میں اُن کا مذہب تھا۔

وہ اپنے تمدن اور حکومت کی وسعت و عظمت کے گھمنڈ میں خدائے برتر کی توحید اور دین حقیقی کی معرفت سے نفور، شرک و جہالت کی سرمستیوں میں مخمور تھے۔

خدائے برتر کے قانون "وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" کوئی جماعت ایسی نہیں جس میں ہمارا نذیر نہ آیا ہو، کے مطابق حضرت یونس (علیہ الصلوٰۃ) منتخب کیے گئے کہ وہ اس قوم کو راہِ حق بتائیں، خدائے واحد کا پیغام سنائیں۔ اور شرک اور فسق و فجور کے انجامِ بد سے خوف دلائیں تاکہ خدا کی حجت اُن پر پوری ہو جائے اور اُن کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے۔

وَلَوْ أَنَّا أَهْلَكْنَاهُم بِعَذَابٍ مِّن قَبْلِهِ — اور اگر ہم اُن مشرکوں کو اس (رسول کی بعثت) سے پہلے ہلاک کر دیتے تو وہ
لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَا أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا — یہ ضرور کہتے "اے ہمارے پروردگار ہمارے پاس تونے رسول کیوں
فَنَتَّبِعَ آيَاتِكَ مِن قَبْلِ أَن نَّذِلَّ وَنَخْزَىٰ — نہ بھیجا کہ ہم آج کے دن ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے تیری آیات کی پیروی"

اور رب العزت کا قانون بھی یہی ہے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا — اور ہم کسی قوم کو عذاب میں اس وقت تک مبتلا نہیں کرتے جب تک کہ اُن میں رسول نہ بھیجدیں

یعنی رسول کے شمع ہدایت دکھانے اور صحیح راہ بتانے کے باوجود پھر بھی کوئی قوم نافرمانی و سرکشی پر قائم رہے تو عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے اور اُس کی تباہی و بربادی خود اُس کے اپنے کردار بد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن عذابِ الٰہی آنے کی شرط یہ ٹھہری کہ رسول آئے اور قوم اُس کے سمجھانے پر کسی طرح نہ مانے اور تمرد و سرکشی پر برابر مصر رہے تو ظاہر ہے جو قوم یا فرد نزولِ عذاب سے پہلے اپنے نبی کی ہدایت کو قبول کرلے اور اُس کی دعوتِ حق پر ایمان لے آئے وہ عذاب الٰہی سے محفوظ اور خدا کے فضل و کرم سے محظوظ ہوگی۔ اس لیے نہ ماننے والوں کے لیے کہا گیا:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۔ (الانعام)

کیا اُنہوں نے دیکھا نہیں؟ اُن سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ جن کو روئے زمین پر اس قدر قدرت دی تھی جتنی تم (اہلِ مکہ) کو نہیں دی اور اُن پر خوب بارشیں برسائیں اور نہریں جاری کردیں اُن کے نیچے پھر ہلاک کر دیا ہم نے اُن کو اُنکی نافرمانیوں کی وجہ سے اور پیدا کر دیا اُن کے بعد دوسری قوموں کو۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ (بنی اسرائیل)

اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو اس کے مرفہ الحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں وہ نافرمانیاں کرتے ہیں پس عذاب کا حکم اُن پر ثابت ہوتا ہے تو ہم اُنکو بالکل برباد کر دیتے ہیں۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا

اور یہ بستیاں ہیں ہم نے ان کو ہلاک کر دیا جب کہ بسنے والوں نے ظلم کا شیوہ اختیار کیا اور اُنکی ہلاکت کے لیے ہم نے ایک میعاد مقرر کر دی۔

اور حق کو تسلیم کرنے والوں اور صلاح و خیر کی زندگی بسر کرنے والوں کو یوں بشارت دی گئی۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ

اور نہیں ہے تیرا رب کہ ہلاک کرے بستیوں کو ظلم سے درآنحالیکہ

وَاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۔ (سورۂ ہود)	اس کے بسنے والے نیکوکار ہوں
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور اُنہوں نے
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۔	نیک کام کیے کہ اُنکے واسطے بخشش اور بڑا اجر و ثواب ہے۔
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ	اور جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک کام کیے (اور ہم کسی کو اُسکی
نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ	وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) یہی جنت والے ہیں اور
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (الاعراف)	اس میں ہمیشہ رہینگے۔

نیز دعوت و تبلیغ حق کے سلسلہ میں یہ بھی "سنۃ اللہ" رہی ہے کہ اگر کوئی قوم خدائے برتر کے سچے پیغمبر کو جھٹلاتی اور دعوت حق کو ٹھکراتی ہے تو خدا کا نبی ...... اُس قوم کو دنیا میں عذاب الٰہی نازل ہونے کی خبر سناتا ہے اگر اس پر بھی سرکشی اور تمرد پر ثابت قدم رہتی ہے تو نبی اور اُن افراد کے علاوہ جنہوں نے صحیح ایمان و اعتقاد کے ساتھ پیغام حق کو قبول کر لیا ہے، باقی قوم کو ان کے سامنے ہی عذاب سے تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے واقعہ میں ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِی	پس اُنہوں نے نوح کو جھٹلایا تو ہم نے اُس کو اور اُن لوگوں کو جو
الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ	کشتی میں سوار تھے نجات دی اور اُن لوگوں کو غرق کر دیا،
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۔	جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ ایک اندھی قوم تھی۔

اور حضرت ہود کی قوم عاد کے متعلق ارشاد ہے:۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ	پس ہم نے ہود کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے نجات
قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا	دی اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اُن کی جڑیں کاٹ
مُؤْمِنِيْنَ ۔	دیں اور وہ مومن نہ تھے۔

اور حضرت صالح کی قوم ثمود کے لیے فرمایا گیا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ — پس آلیا ثمود کو زلزلے نے تو وہ اپنے گھروں میں زمین پر اوندھے پڑے رہ گئے۔

اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لیے فرمایا گیا۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ۔ — پس ہم نے لوط (علیہ السلام) اور اُس کے خاندان کو نجات دے دی بجز اس کی بیوی کے کہ وہ رہجانے والوں میں کی تھی اور اُس کی قوم پر پتھروں کی بارش کر دی پس دیکھو مجرمین کا انجام کیسا ہوا۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لیے کہا گیا:۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ۔ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ۔ (اعراف) — پس آیا اُن کو زلزلے نے اور رہ گئے وہ اپنے گھروں میں زمین پر ڈھیر شعیب کے جھٹلانے والے ایسے ہو گئے گویا کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے شعیب کو جھٹلانے والے ہی خسارہ میں ہیں۔

خدائے برتر کے مسطورہ بالا قانون اور تبلیغ و انذار کے بارہ میں مذکورۃ الصدر سنۃ اللہ کے مطابق ہی حضرت یونس اور اُن کی قوم کا معاملہ بھی پیش آیا۔ مگر افسوس کہ انبیاء علیہم السلام کے بعض دیگر قصص و وقائع کی طرح حضرت یونس (علیہ السلام) کے واقعہ میں بھی چند گتھیاں پیدا کر دی گئی ہیں، اور بعض ملاحدۂ عصر نے اپنے مزعوم اور باطل عقائد کی اساس کو محکم و مضبوط بنانے کے لیے مفسرین کے بیان کردہ احتمالات سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی سعی کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں مختلف اقوال و احتمالات کا ذکر اس اعتبار سے تو بہتر و مناسب ہے کہ ایک تحقیق کرنے والے کے سامنے مسئلہ کا خیر و شر پوری طرح آجاتا ہے لیکن یہ طریقہ بیان کہ نقل اقوال کے بعد قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ کی نصوص کی روشنی میں

علمی اقمی مدلل و مبرہن قول کو فیصلہ کن قرار نہ دینا اور سب قسم کے احتمالات کو کم و بیش فرق مراتب کے
بیان کر کے ناظر کے سامنے ایک ذخیرہ کی شکل میں پیش کر دینا نہ صرف مقصد تفسیر کے خلاف اور
مضر ہے بلکہ اکثر ملاحدہ و زنادقہ کو اسلامی عقائد میں رخنہ اندازی کا اور غیر مسلموں کو اسلام کے خلاف
مواد فراہم کر کے رائی کو پہاڑ بنانے کا بہترین موقعہ اسی ذریعہ سے ہاتھ آجاتا ہے اور آتا رہا ہے
چنانچہ حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بھی یہی صورت پیش آئی اور بعض ملاحدہ نے ایک کمزور
احتمال سے فائدہ اٹھا کر اپنے باطل عقیدہ کی بنیاد اس پر رکھ دی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے
کہ حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں سورۂ انعام، یونس، انبیاء، والصّٰفّٰت، اور
القلم میں آیا ہے۔

سورۂ انعام میں تو صرف اُن کی جلالت شان، اور پیغمبرانہ عظمت کا تذکرہ ہے۔

وَاِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَیُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (الانعام)

اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط، ہر ایک کو تمام جہان والوں پر ہم نے فضیلت دی ہے۔

اور سورہ یونس میں قوم کے ایمان لانے اور اس وجہ سے اُن پر سے عذاب الٰہی ٹل جانے
کا مختصر طور پر ذکر ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ۔ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِیْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ لَمَّاۤ

اور تو اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا کہ تو نقصان اُٹھانے والوں میں ہو جائے یقیناً وہ لوگ جن پر تیرے پروردگار کے کلمات ثبت ہو چکے ہیں۔ وہ ایمان نہ لائینگے، اگرچہ اُن کے پاس ہر قسم کی آیت آجائے یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔ پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لے آتی اور اُس کو ایمان لانا نفع پہنچاتا قوم یونس کے

اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۔ سوا۔ جبکہ وہ ایمان لے آئے تو ہم نے اُن سے ذلت کا عذاب ٹال دیا اور ایک مدت تک اُن کو پھلنے پھولنے دیا۔

مفسرین نے اس آخری آیت میں (جس میں حضرت یونس کی قوم کا تذکرہ ہے) دو بحثیں پیدا کی ہیں۔ ایک یہ کہ یونس علیہ السلام کی قوم کا ایمان کامل یعنی حقیقی ایمان تھا یا ناقص کہ محض عذاب کے خوف سے اقرار کیا ورنہ دل میں اسلام کی حقیقت جاگزین نہ تھی، ان دو احتمالات کے بعد یہ بحث پیدا ہوئی کہ اگر ایمان کامل تھا تو خیر ورنہ سوال یہ ہے کہ ایمان ناقص عذاب الٰہی کے ٹل جانے کا باعث ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اور پھر کہا گیا کہ ہاں عذاب دنیا ٹل سکتا ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ حضرت یونس نے اپنی قوم کے سامنے عذاب الٰہی کی جو ڈرانے والی پیش گوئی کی تھی وہ عذاب قوم پر آیا یا نہیں۔ اس میں بھی دو قول یا دو احتمال قائم رہے۔

۱۔ عذاب آیا مگر اُن کے خوف و تضرع کی وجہ سے ٹل گیا۔

۲۔ نہیں آیا صرف علامات دیکھ کر ہی قوم نے واویلا شروع کر دی اور ظاہری ایمان لا کر اپنے تئیں عذاب سے بچا لیا۔

اور پہلی شکل میں جب یہ سوال پیدا ہوا کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ عذاب آنکھوں کے سامنے آجائے اور مشاہدہ ہونے لگے تو اُس وقت ایمان معتبر نہیں ہوتا، کیونکہ یہ ایمان اضطراری ہے اختیاری نہیں، جیسا کہ بحر قلزم میں غرق ہوتے وقت عذاب الٰہی کے مشاہدہ پر فرعون نے اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ کہا مگر اُس کا یہ اضطراری ایمان معتبر نہ سمجھا گیا۔ پھر قوم یونس کا اضطراری ایمان کیوں معتبر ٹھہرا؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ حضرت یونس کی قوم کی خصوصیت ہے کہ قانون عام سے الگ اُن کی خطا کو ایسی حالت میں معاف کر دیا گیا۔

اور ان تمام احتمالات میں ایک نہایت رکیک اور باطل احتمال یہ ہے کہ "عذاب الٰہی محض ظاہری تضرع سے ٹل گیا اور حضرت یونس کی پیش گوئی پوری نہ ہوئی"

مسٹر محمد علی لاہوری نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں اسے نقل کر کے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیشگوئیاں پوری نہیں ہوئیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، حضرت یونس علیہ السلام کی انذاری پیشگوئی بھی پوری نہ ہوئی تھی۔

لاہوری مفسر کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

جہاں انبیاء کے مکذبین کی ہلاکت اور تباہی کا ذکر کیا ایک ایسے نبی کا بھی ذکر کر دیا جس کے مخالفین باوجود نہ ماننے کے آخر توبہ کر کے عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی طرف حضرت یونس کو بھیجا گیا۔

ابن کثیر میں ہے کہ حضرت یونس نے اہل نینویٰ کو عذاب سے ڈرایا مگر انہوں نے نہ مانا۔ تب یونس اُن کے درمیان سے چلے گئے (تاکہ عذاب کے مقام سے الگ ہو جائیں) تب ان لوگوں نے ..... اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ عذاب دور کر دیا پھر دو گروہ ہیں۔ ایک کہتے ہیں کہ اُن سے صرف عذاب دنیا دور کیا گیا اور عذاب اُخروی نہیں (گویا وہ فی الواقع ایمان نہ لائے تھے صرف عذاب کے خوف سے رجوع کیا) اور دوسرے کہتے ہیں کہ عذاب اُخروی بھی اُن سے دور کیا گیا اور وہ ایمان لے آئے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انذاری پیش گوئیاں ٹل بھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ایک نبی کی زبان سے وہ ظاہر بھی کر دی گئی ہوں۔ اور گو رجوع کامل ہو جس میں ایمان صحیح ہو یا ناقص ہو کہ صرف عذاب کے خوف سے رجوع کیا جائے۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ ایک ایسے صاف و صریح واقعہ کے متعلق بھی جو انبیاءِ سابقین اور

اُن کی اُمتوں کے ساتھ سنۃ اللہ کے مطابق ہمیشہ ہوتا آیا ہے محض احتمالاتِ عقلی کی بنا پر کس قدر الجھنیں پیدا ہوگئیں اور کس طرح ایک غلط عقیدہ کی بنیاد کے لیے جگہ پیدا کرلی گئی۔

واقعہ کی حقیقت | نص قرآنی اور احادیث صحیحہ سے واقعہ کی اصل حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ حضرت یونسؑ نے اپنی قوم کو خدا کا پیغام سنایا اور توحید کی دعوت دی۔ قوم نے نہ مانا اور سرکشی و مخالفت کا مظاہرہ کیا، اس پر اللہ کے پیغمبر نے اُن کو عذابِ الٰہی کے نزول کی اطلاع دی اور ایک مرتبہ پھر سعی کی کہ وہ تمرد اور حق کی مخالفت سے باز آجائیں اور دل میں خوفِ خدا پیدا ہو مگر قوم پر کچھ اثر نہ ہوا۔ حضرت یونس بے مدلول ہوئے اور نزول عذاب سے پہلے ہی ہجرت کرکے وہاں سے چلے گئے

قوم پیغمبر کی زبانی یہ سُن چکی تھی کہ گذشتہ قوموں پر عذاب الٰہی کے آنے کی سب سے بڑی علامت یہ ہوئی تھی کہ خدا کا پیغمبر وہاں سے ہجرت کرکے چلا جاتا تھا۔ جیسا کہ آپ انبیاء کے واقعات میں ابھی سُن چکے ہیں۔

قوم یونسؑ اگرچہ ابتداءً اپنے نبی کی تکذیب کرتی اور پیغام حق پر ہنستی رہی، اور اُس نے عذاب کی خبر کی کوئی پروا نہ کی لیکن پیغمبر کے چلے جانے سے اُس کی چشم عبرت وا ہوئی اور وہ گھبرا اُٹھی اور حضرت یونس کی تلاش میں سرگرداں رہی اور جب حضرت یونس نہ ملے تو پھر خود درگاہِ الٰہی میں سرِ نیاز جھکا دیا، انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ توبہ کی اور صداقت ایمانی کے ساتھ مؤمنین کی صف میں شامل ہوگئے اور اس طرح خدا کا عذاب اُن سے ٹل گیا۔ اور تمام امم سابقہ میں صرف قوم یونس ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ پوری قوم مشرف باسلام ہوگئی۔

نص قرآنی کی روشنی میں واقعہ کی تحلیل | اب ذرا انصاف کے ساتھ نص قرآنی کی روشنی میں اس واقعہ کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزء کے متعلق غور فرمائیے کہ صورت حال یہی ہے جو سطور بالا میں

ظاہر کی گئی یا اس کے برعکس دوسرے احتمالات کی بھی کوئی گنجائش ہے۔

۱۔ حضرت یونس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) بھی ایک قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔

وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا (انعام) اور (نبی) اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط۔

۲۔ حضرت یونسؑ نے قوم کو پیغامِ حق سنایا اور قوم کے انکار اور سرکشی پر عذاب الٰہی کی خبر دے کر خود ہجرت کر کے چلے گئے

اَوَذَهَبَ مُغَاضِبًا (انبیاء) اور یونس خفا ہو کر چلے گئے۔

۳۔ قوم امم ماضیہ کی ہلاکت کے حالات سن چکی تھی اس لیے جب اپنے درمیان نبی کو نہ پایا تو حقیقت حال اس کے سامنے منکشف ہوگئی، اور صدق دل سے ایمان لے آئی اور امم ماضیہ میں صرف یہی ایک قوم ہے جو بغیر استثنا سب کی سب مشرف باسلام ہوئی، اور اس طرح خدا کا عذاب ان سے ٹل گیا۔ افسوس کہ دوسری قوموں نے ایسا نہ کیا ورنہ وہ بھی عذاب سے نجات پا جاتیں۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۔ (سورہ یونس)

پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لے آتی اور اس کو ایمان لانا نفع پہنچاتا قوم یونس کے سوا۔ جبکہ وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب ٹال دیا اور ایک مدت تک ان کو پھلنے پھولنے دیا۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۔ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (الصّٰفّٰت)

اور ہم نے اس کو ایک لاکھ بلکہ اس سے زائد انسانوں کی طرف بھیجا پس وہ ایمان لے آئے اور ہم نے ایک مدت تک (دنیا میں) انکو بہرہ مند کیا۔

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بھی مکذبین و مصدقین کے بیان کردہ اعمال اور اعمال کے نتائج نیک و بد سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

وَلَا تَکُوْنَنَّ کَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا (الآیہ) تم اُن لوگوں کی طرح ہرگز نہ ہونا جنھوں نے اپنے نبی کی تکذیب کی۔

اب بتائیے قوم یونس کے ایمان کو ظاہری ایمان اور ناقص ایمان پر محمول کریں تو کیوں اور اس لیے؟ اور لمّا اٰمنوا میں ایمان کے قطعی اور صریح ذکر کے بعد حقیقی معنی کو بلا وجہ ترک کرنے کی کیا وجہ؟ کیا ایسا ایمان جو دراصل نفاق کی ایک خاص شکل ہو، اس قابل ہے کہ قرآن عزیز اُس کا حوالہ دے کر دوسری قوموں کے ایمان نہ لانے اور خدا کے عذاب سے محفوظ رہنے پر اظہار تاسف کرے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے آپ کی اُمت کو مکذبین اُمم ماضیہ کے طرز سے بیزاری، اور قوم یونس کے طرز کی پیروی کی ترغیب دینے کے لیے اس واقعہ کو بطور نظیر و شاہد کے پیش کرے۔

ترغیب تو اُس ایمان کی دیجائیگی جو عنداللہ مقبول و اجر ہو، نہ کہ محض ظاہری ایمان کی۔ اس لیے کہ ایمان ایک حقیقت ہے جو ظاہر و باطن دونوں میں یکسانیت و یکرنگی ہی کو چاہتا ہے۔ یہاں ظاہر و باطن کے فرق کی گنجائش ہی نہیں۔ اور جملہ فی الحیوٰۃ الدنیا سے یہ کس طرح سمجھ لیا گیا کہ آخرت میں اگرچہ وہ مستحق عذاب و نکال ہی رہیں لیکن دنیا میں چھٹکارا پا گئے۔

عذاب کیوں آنے والا تھا، حضرت یونسؑ نے عذابِ الٰہی کی خبر کس لیے دی تھی؟ کیا اس لیے کہ وہ ظاہری ایمان کیوں نہیں لاتے اور حقیقت کا اعتراف کیے بغیر خدا اور اُس کے رسول کو نمائشی ایمان سے کیوں خوش نہیں کر دیتے، حاشا و کلّا۔

اسی طرح جملۂ قرآنی "کشفنا عنھم" کے متعلق یہ کہنا کہ لغت میں "کشف" کے معنی شی کے موجود ہوجانے بعد اس کو دور کرنے کے ہیں۔ اور اُس سے یہ اخذ کرنا کہ عذاب الٰہی آیا اور ایمان لانے کے بعد ہٹا لیا گیا، اور پھر یہ بحث پیدا کرنا کہ یہ ایمانِ مشاہدہ یا ایمان اضطراری ہے جو اگرچہ عنداللہ نامقبول ہے مگر دنیا میں مقبول ہے اور اس کا اس طرح جواب دینا کہ یہ صرف قوم یونس

ہی کی خصوصیت ہو انکی علاوہ نہ تو ماضی میں ایسا ایمان مقبول ہوا نہ مستقبل میں ہو! یہ بلاوجہ کنج وکاوش میں پڑنا اور بے سبب بحث کا دروازہ کھولنا ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک کشف کے لغوی معنی یا قرآن عزیز میں اس معنی کے استعمال کا تعلق ہے اس کا کس کو انکار ہے کہ اس کے یہ معنی آتے ہیں، لیکن کشف کو صرف اس معنی میں محصور سمجھنا یہ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ خازن اور بغوی میں ہے۔

والکشف لایکون الا بعد الوقوع او اذا قرب وقوعہ۔ اور کشف نہیں ہوتا مگر وقوع پذیر ہونے کے بعد یا اس حالت کے بعد کہ وہ شے قریب الوقوع تھی۔

جبکہ لغت ان دونوں معنی کو محتمل ہے تو پھر کیوں نہ ایسے معنی اس جگہ لیے جائیں جو امم ماضیہ کے بارہ میں "سنۃ اللہ" اور قانونِ الٰہی کے عام دستور کے مطابق بھی ہوں اور اس کے ماننے کے بعد سوال وجواب اور بحث وتحیص کی بھی ضرورت باقی نہ رہے خصوصاً جبکہ ضرورت مقام کے اعتبار سے وہی زیادہ سے زیادہ مناسب ہوں

اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز وہ احتمال ہے جو مفسر لاہوری نے اختراع کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ نبی کی انذاری پیش گوئیاں کبھی ٹل بھی جاتی ہیں اور پوری نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ حضرت یونس کی پیشگوئی ٹل گئی۔ اب آپ ایک مرتبہ پھر شروع سے آخر تک قرآنِ عزیز کی بیان کردہ تصریحات کو پڑھیے اور جماعت احمدیہ کے امیر کے اُس باطل ادعار کو مطالعہ کیجیے جس پر ہم نے خطوط کھینچ دیے ہیں، تو آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ قرآن عزیز کے حقیقی معانی کی توضیح وتفسیر اور خود ساختہ عقائد کے زیر اثر قرآنِ عزیز کی آیات کے معانی کی تحریف، کے درمیان کیا فرق ہے نظم قرآنی کس قدر صاف اور صریح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ حضرت یونس کا وعدہ عذاب ایمان نہ لانے کی بنا پر تھا گر جب قوم نے اُس کو پورا کر دیا تو مقصد حاصل ہو جانے کی وجہ سے عذاب ٹل گیا۔

انبیا تفسیر بالرائے پر جرأت کرنے والا انسان اس کو بالکل ہی بھول جاتا ہے کہ نبی برحق اور متنبی کے وعدوں کے درمیان بہت بڑا تفاوت ہے۔ اس لیے متنبی کاذب کی جھوٹی پیشگوئیوں کی پردہ پوشی کے لیے انبیاء معصومین پر غلط تہمت تراشنے کی بیجا جرأت نہ کرنی چاہیے۔

اور تعجب پر تعجب ہے اس کتمان حق پر کہ ابن کثیر کا حوالہ دیتے ہوئے سابق و لاحق عبارت کو حذف کر دیا گیا۔ تاکہ اصل حقیقت پر پردہ پڑا رہے اور نا تمام عبارت سے ناجائز فائدہ حاصل ہو سکے چنانچہ ابن کثیر کی جس عبارت کا ترجمہ مفسر لاہوری نے پیش کیا ہے اُس سے پہلے ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس عبارت سے اس مسئلہ کو شروع کیا ہے۔

والغرض انہ لم یوجد قریۃ اٰمنت بکمالہا بنبیہم ممن سلف من القریٰ الا قوم یونس وھم اھل نینوی وما کان ایمانہم الا تخوفا من وصول العذاب الذی انذرھم بہ رسولھم بعد ما عاینوا اسبابہ وخرج رسولھم من بین اظہرھم فعندھا لجاءوا الی اللہ واستغاثوا بہ وتضرعوا لدیہ واستکانوا واحضروا اطفالھم ودوابھم ومواشیھم وسالوا اللہ تعالیٰ ان یرفع عنھم العذاب الذی انذرھم بہ نبیھم فعندھا رحمھم اللہ کشف عنھم العذاب واجزوا کما قال	(قرآن عزیز کے اس واقعہ کے بیان کرنے کی) غرض یہ ہے کہ زمانۂ ماضی میں ایسی کوئی بستی اور قوم نہیں پائی گئی جو کمال و تمام اپنے نبی پر ایمان لائی ہو صرف حضرت یونس کی قوم اس سے مستثنیٰ ہے جو کہ نینوی کی رہنے والی تھی اور پوری قوم کی قوم اپنے نبی پر ایمان لے آئی۔ اور اُن کا ایمان لانا صرف اُس عذاب کے خوف سے تھا جس سے اُن کے رسول نے اُن کو ڈرایا تھا اور اس کے بعد تھا کہ اُنہوں نے عذاب کے اسباب کا اسی حالت میں مشاہدہ کیا کہ اُن کا پیغمبر اُن کے درمیان سے ترک وطن کر گیا تھا۔ اُس وقت وہ اللہ کی پناہ چاہنے لگے، فریاد کرنے لگے، جناب الٰہی میں گڑگڑانے لگے، ذلیل ہونے لگے، اور اُنہوں نے اپنے بچوں، جانوروں اور چوپاؤں کو ایک جا جمع کیا اور دعا کی کہ اُن کے نبی نے جس عذاب سے اُن کو ڈرایا تھا اُن پر وہ عذاب

تعالیٰ الا قوم یونس لما امنوا کشفنا عنھم عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا ومتعناھم الی حین واختلف المفسرون ھل کشف عنھم العذاب الاخروی مع الدنیوی او انما کشف عنھم فی الدنیا فقط علیٰ قولین احدھا انما کان ذلك فی الحیوۃ الدنیا کما ھو مقید فی ھذہ الآیۃ

نہ آئے اور اُن سے دور ہو جائے۔ اُس وقت اللہ نے اُن پر رحم کیا اور اُن سے عذاب ٹال دیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے الا قوم یونس لما امنوا کشفنا عنھم عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا ومتعناھم الی حین۔ اور مفسروں میں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ دنیوی عذاب کے ساتھ اُن سے اُخروی عذاب بھی ٹل گیا یا نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آیۃ میں فی الحیوۃ الدنیا" کی قید ہے اخروی کا تذکرہ نہیں۔

والقول الثانی فیھما لقولہ تعالیٰ وارسلناہ الی مائۃ الف او یزیدون فامنوا فمتعناھم الی حین. فاطلق علیھم الایمان والایمان منقذ من العذاب الاخروی وھذا ھو الظاھر

اور دوسرا قول یہ ہے کہ قوم یونس عذاب دنیوی و اخروی دونوں سے محفوظ ہو گئی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے متعلق ارشاد فرمایا ہے (ترجمہ) ہم نے اُس (یونس) کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد آبادی پر بھیجا پس وہ ایمان لے آئے اور ہم نے اُنکو ایک مدت تک (دنیا میں) بہرہ مند کیا۔ (انتھیٰ) حق تعالیٰ نے اس مقام پر اُنکے لیے "آمنوا" فرما کر مطلق ایمان کا ذکر کیا ہے اور ایمان اُس شے کا نام ہے جو عذابِ اُخروی سے نجات دلاتا ہے اور یہی قول ظاہر ہے۔

اب اِس پوری عبارت کو ملاحظہ فرمائیے اور بتائیے کہ اس عبارت کے کس جملہ یا کس لفظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت یونس نے جس بناء پر عذاب الٰہی کی خبر دی تھی اُس کے پورا نہ ہونے کے باوجود خدا کا عذاب ٹل گیا اور حضرت یونس کی انذاری پیشگوئی پوری نہ ہوئی اور انھی ابن کثیر نے سورۂ انبیاء کی تفسیر میں کہا ہے فخرج من بین اظھرھم مغاضباً لھم وعدھم

بعد ثلث فلما تحققوا منہ ذلک وعلموا ان النبی لا یکذب خرجوا الی الصحراء الخ

بہرحال محققین علمائے تفسیر کے نزدیک اس آیت کی تفسیر صاف وصریح اور الجھاؤ سے محفوظ وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ باقی احتمالات یا تو محض عقلی ہیں یا ضعیف وموضوع روایات واقوال پر مبنی۔

اور کوئی ایک صحیح روایت بھی نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی ثابت نہیں جو ان احتمالات کی تائید کرتی ہو۔

الغرض حضرت یونس علیہ السلام کے اس واقعہ میں کوئی ایک امر بھی ایسا نہیں ہے جو امم ماضیہ اور اُن کے انبیاء علیہم السلام کے درمیان بیان کردہ واقعات قرآنی سے الگ کسی ایسی صورت میں بیان کیا گیا ہو جس میں اول شک وشبہ کی گنجائش پیدا ہوتی ہو یا اُن کے وعدہ کی خلاف ورزی معلوم ہوتی ہو اور پھر اُس کے جواب کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت پیش آئے۔

اس واقعہ کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ مکذبین (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو غفلت سے بیدار کیا جارہا ہے کہ اُن کو بھی یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کی طرح ایمان لے آنا چاہیے تاکہ عذاب الٰہی سے نجات مل جائے۔ اور نہایت لطیف اشارہ اس جانب ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین پر بھی عذاب عام نہ آئیگا اور وہ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

حضرت یونس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے واقعہ کی دوسری کڑی سورۂ انبیاء کی آیت سے متعلق ہے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ	اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ ہو کر پھر سمجھا کہ ہم اُس پر تنگی نہ
اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ	ڈالیں گے۔ پھر پکارا اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوا تیرے، تو
اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ	بے عیب ہے، میں تھا خطاکاروں میں سے۔ پھر سن لی ہم نے

مِنَ الظّٰلِمِیْنَ. فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ وَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ	اُس کی فریاد، اور بچا دیا اُس کو اُس گھٹن سے، اور یونہی ہم بچا دیتے ہیں ایمان والوں کو۔

اس آیت کے ذھب مغاضباً (غصہ ہو کر چلا گیا) کے جملہ میں با وجود ایک اور صرف ایک معنی کے جو بلا شک وشبہ قطعی اور یقینی ہیں بعض مفسرین نے دوسرا احتمال بھی بیان کیا ہے جس کے باطل اور سرتاپا باطل ہونے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ پہلے معنی کے حق میں ہونے کا۔

بات صرف اس قدر ہے کہ لفظ مغاضباً کے متعلق یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کس سے خفا ہو کر چلے گئے

سلف وخلف میں تمام مستند علماء تفسیر کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت یونس اپنی قوم سے ناراض ہو کر نینویٰ سے اس لیے چلے گئے کہ قوم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اُنھوں نے تین دن کے اندر خدا کے عذاب نازل ہو جانے کی اُن کو خبر دیدی تھی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

والصحیح فی قولہ تعالیٰ اذ ذھب مغاضباً انہ مغاضب لقومہ لکفرھم وھو قول ابن عباس والضحاک وغیرھما لا لربہ اذ مغاضبۃ اللہ تعالیٰ معاداۃ لہٗ و معاداۃ اللہ کفر لا یلیق بالمومنین، فکیف بالانبیاء علیھم السلام۔	اور اللہ تعالیٰ کے قول اذ ذھب مغاضباً میں صحیح بات یہ ہے کہ حضرت یونس اپنی قوم کے کفر کی وجہ سے غصہ میں آگئے، یہی ابن عباس ضحاک وغیرہ کا قول ہے۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنے رب سے ناراض ہوگئے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے غصہ اس کے ساتھ دشمنی کا اظہار ہے اور اُس سے دشمنی ایک مومن کی شان سے بھی بعید ہے چہ جائیکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف اسکی نسبت کیجائے

مگر تورات میں مذکور ہے کہ حضرت یونس اللہ تعالیٰ سے اس بات پر ناراض ہو کر چلے گئے کہ اُس نے اُن کی قوم سے عذاب کیوں ٹال دیا۔ اُن کا یہ خیال جم گیا کہ اب اگر بستی میں جاؤنگا تو قوم

جھوٹا کہیگی اور میں منہ دکھلانے کے قابل نہ رہونگا۔ ایسی باطل اور بیہودہ احتمال کو بعض غیر محتاط مفسرین نے بے سند نقل کر دیا ہے مگر انہوں نے یہ نہ سوچا کہ نبی و رسول تو کجا یہ خیال تو کسی معمولی مسلمان کے دل و دماغ میں بھی نہیں آسکتا، اس لیے ایک نبی معصوم کے متعلق ایسی بات کہنا کس طرح جائز ہوسکتی ہے۔

اس آیت کا دوسرا جملہ " وَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ " (اور اس نے سمجھا کہ ہم اس پر تنگی نہ ڈالینگے یا اس کی گرفت نہ کرینگے) مفسرین میں قابل بحث رہا ہے۔

پہلے اس آیت سے متعلق واقعہ کی تشریح سمجھ لیجیے تاکہ مفسرین کے اقوال سمجھنے میں آسانی ہو۔

یہاں یہ ذکر ہے کہ حضرت یونس نے اپنی قوم کو ان کے تمرد و سرکشی پر جو تین روز کے اندر عذاب الٰہی کے آنے کی خبر دی تھی، قوم نے اس وقت اس کی کوئی پروا نہ کی، تب یہ قوم سے ناراض ہوکر نینوی سے ترک وطن (ہجرت) کرکے چلدیے، اور اپنے خیال میں یہ طے کرلیا کہ چونکہ ان پر عذاب الٰہی آنے والا ہے، اس قوم سے ہجرت کر جانا ہی مناسب ہے، اور ایسا کرنے میں خدائے تعالیٰ نہ مجھ کو کسی مشکل میں پھنسائینگے اور نہ میرے اس عمل پر گرفت کرینگے۔

حضرت یونس کا یہ عمل اگرچہ گناہ نہ تھا کسی قسم کی خطا نہ تھی، نافرمانی نہ تھی۔ اسی لیے قاضی عیاض نے تصریح کی ہے

ولیس فی قضیۃ یونس علیہ السلام نص علی ذنب۔ حضرت یونس کے قضیہ میں ایک لفظ سے بھی گناہ ثابت نہیں ہوتا۔

تاہم ہجرت ایک شرعی امر ہے اس کے لیے اذن الٰہی کی ضرورت ہے اور ایک نبی کے لیے لازم و ضروری ہے کہ وحی کا انتظار کرے اور جب اجازت مل جائے تو اس پر عمل پیرا ہو، مگر حضرت یونسؑ اس میں عجلت کر بیٹھے، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا

ولا تکن کصاحب الحوت اذ ابق الی الفلك المشحون (الصّٰفّٰت)
تو مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جانا جبکہ وہ (جلد بازی میں) اپنی قوم سے چلا گیا کشتی کی طرف جو بھرپور تھی۔

تب بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" (بھلوں کی خوبیاں بھی بارگاہ الٰہی کے مقربین کے لیے برائیاں بنجاتی ہیں" اللہ تعالیٰ نے اُن کی عجلت پر گرفت کی اور اُن کو مچھلی کا لقمہ بنا کر اُن کو تنگی اور ضیق میں ڈال دیا۔ اسی لیے والصّٰفّٰت میں حضرت یونس کے اس فعل کو "ابق الی الفلك" کہہ کر اباق (فرار) سے تعبیر کیا۔ اور ہجرت کے محترم و باعظمت لفظ سے تعبیر نہ کیا چنانچہ حضرت یونس کو تنبہ ہوا اور فوراً ہی اپنی اس لغزش کو گناہ کے برابر سمجھ کر درگاہِ الٰہی میں دعاگو ہوئے اقرار جرم کیا، اور بخشش چاہی۔ خدائے تعالیٰ نے اُن کی فریاد سُن لی اور اُن کو نجات دیدی۔ واقعہ کی اس تفصیل کے بعد اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں بحث کا اصل رُخ کیا ہے؟

بحث کا اصلی رُخ لفظ "قدر" کے معنی کی جانب ہے یعنی اس کے معنی کیا ہیں؟ تاکہ آیت کے اس جملہ کا صحیح مفہوم معلوم ہو سکے۔ ابن کثیر، ابن جریر، اور دوسرے جلیل القدر مفسرین نے اس کے دو معنی بیان کیے ہیں:۔

(۱) لن نقدر علیہ۔ ای لن نضیق علیہ یعنی قَدَر بمعنی ضَیّق (تنگی)

ضحاک، مجاہد کا یہی قول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت اس کے مطابق ہے اور ابن جریر اس کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔ اور راغب، امام لغت بھی اس معنی کی تصدیق کرتے ہیں اور دلیل میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو پیش کرتے ہیں۔ وَمَنْ قُدِرَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ۔ "اور جس پر رزق تنگ کر دیا گیا ہے اُس کو چاہیے کہ جتنا خدا نے اُس کو دیا ہے اسی سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرے"۔

اس آیت میں "قدر" کے معنی ضیق (تنگی) کے مسلّم ہیں۔

(۲) عطیہ عوفی کا قول ہے "لن نقدر علیہ" لن نقضی علیہ یعنی ہم اُس پرحکم نہ کرینگے، اُس کی گرفت نہ کرینگے۔ یہاں قدر بمعنی تقدیر ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ عرب قَدَرَ اور قَدَّرَ کو ایک معنی میں بولتے ہیں۔ اور اس کے لیے عرب شاعر کا شعر سند میں پیش کیا ہے اور دوسری دلیل قرآنِ عزیز کی یہ آیت ہے۔ فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ "پس مل گیا پانی اُس حکم کے مطابق جو طے کردیا گیا تھا یا جس کا حکم کردیا گیا تھا" یہاں قُدِرَ بمعنی قُدِّرَ استعمال کیا گیا ہے۔

ان دونوں معنی کے اعتبار سے آیت کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ حضرت یونس جب نینوی سے اپنی قوم سے ناراض ہوکر چلے تو اُنہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس عمل پر اُن کی کوئی گرفت ہوگی نہ اُن پر اس کی وجہ سے کوئی مشکل ڈالی جائیگی۔ لیکن بعض مفسرین اس لفظ "قدر" کے معنی یہاں قدرت سے ماخوذ سمجھتے ہیں اور اس صورت میں "لن نقدر علیہ" کا ترجمہ "ہم اُس کو نہ پکڑ سکینگے، یا نہ پکڑ پائینگے"، ہوگا

صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے نقدر کو قدرت کے معنی میں سمجھا اور پھر اُن کو سخت مشکل پیش آئی کہ ایسا عقیدہ نبی تو کیا معمولی مسلمان کا بھی نہیں ہوسکتا تب اُنہوں نے حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف رجوع کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اُن کو وہی معنی بتائے جو اُن کے مسلک میں بیان ہوچکے ہیں۔

اس کے بعد "قدرت" کے معنی تسلیم کرتے ہوئے پیدا شدہ اشکال اور اعتراض کو دفع کرنے کے طریق ذکر فرماتے ہیں، لکھتے ہیں۔

"قدرت کے معنی بھی بن سکتے ہیں یا تو مجاز کے طور پر، کہ قدرت سے مُراد "قدرت کو کام میں لانا" ہے یعنی اُس نے سمجھا کہ ہم اُس پر اپنی قدرت کا استعمال نہ کرینگے، یا تمثیل کے طور پر، کہ اس کا یہ طرزِ عمل اُس شخص کا سا تھا جو یہ سمجھے ہوئے ہو کہ ہم اُس پر قدرت نہیں رکھینگے۔

اب اس توضیح کے بعد بآسانی یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ پہلے دونوں معنی بے غل وغش اور اشکال واعتراض سے پاک ہیں، اس لیے اُن ہی کو ترجیح ہونی چاہیے بلکہ قرآن عزیز کا اندازِ بیان اُن ہی معانی کی سفارش کرتا ہے۔

اور تیسرے معنی اگر نقل کے اعتبار سے اپنے عام مفہوم پر محمول کیے جائیں تو وہ کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتے اور ایک معمولی ایماندار پر بھی اُن کا اطلاق نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ ایک معصوم پیغمبر اور نبی برحق پر۔ ہاں اگر توجیہات، تاویلات کی پناہ لی جائے اور باب تمثیل یا باب مجاز کو توضیح آیت کا ذریعہ بنایا جائے تو ایک حد تک معنی اعتراض و اشکال سے محفوظ ہو کر قابل تسلیم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ روح المعانی یا فتوح الغیب وغیرہ تفاسیر کا مطالعہ کرینگے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس تیسرے معنی میں توجیہ و تاویل کا دروازہ کھولنے سے ایک صاف اور سادہ معنی میں کس قدر پیچیدگیاں بڑھتی چلی گئی ہیں۔ اور خدا کے ایک سچے نبی کے ظن کو معمولی انسانوں کے ظنون فاسدہ کی طرح کس کس طرح تختہ مشق بنایا گیا ہے اور پھر ان جلیل القدر مفسرین کو آن اقوال کے ابطال میں کس قدر کاوش کرنی پڑی ہے۔

(باقی)

سحر و صابئیت تاریخ کی روشنی میں

مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی فاضل دیوبند

(۳)

صابئیت کا دوسرا دور طوفانِ نوح کے بعد

طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد مذہب صابئیت کو دنیا کی قدیم ترین قوم سریانیین نے قبول کیا اور ملوک بابل و موصل کی حمایت اس کو حاصل ہوئی مسعودی سریانیین کے متعلق لکھتا ہے:-

تاریخ کے اسفار پارینہ اور کتب نجوم و زیجات میں دنیا کے سب سے پہلے بادشاہ سریانیین سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے بعد سلاطین موصل و نینوی اور ان کے بعد ملوک بابل[1]،

طوفان کے بعد دنیا کے سب سے پہلے بادشاہ سریانیین ہیں[2]

ملوکِ بابل کے متعلق لکھا ہے :-

ملوک بابل عالم کے سب سے پہلے بادشاہ ہیں، جنھوں نے دنیا کو تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنایا[3]۔ سلاطین بابل ہی وہ بادشاہ ہیں جنھوں نے زمین کو آباد کیا، نہریں کھودیں، باغات لگائے سنگلاخ زمینوں کو ہموار کیا، دشوارگزار راہوں کو سہل بنایا[4]۔

جن سلاطین کے عہد میں صابئیت کو سب سے پہلے حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی وہ اولاد

[1,2] مروج الذہب باب ذکر ملوک السریانیین اور اس سے کچھ پہلے۔ [3] مروج الذہب باب ذکر ملوک بابل۔
[4] حوالہ مذکور۔

حام میں سے نمرود بن کنعان بن کوش بن حام ہے اور نبطیوں میں سوریان بن نبیط۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں :۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نوح علیہ السلام کے بعد روئے زمین کا سب سے پہلا بادشاہ کنعان ابن کوش بن حام ہوا، اور اس کے بعد اس کا بیٹا نمرود، یہ بدعت صابئیت کا پیرو تھا۔[1]

سوریان بن نبیط کے متعلق مسعودی کہتا ہے :۔

سوریان، نبیط بن ماش کی اولاد میں سے ہے یہ فالغ کی طرف سے صوبہ بابل کا بادشاہ ہوا اور بدعتِ صابئیت کا اس نے اعلان کیا۔[2]

علامہ ابن خلدون ابن سعید سے نقل کرتے ہیں :۔

سوریان کو فالغ نے بابل کا بادشاہ بنایا اُس نے وہاں پہنچ کر فالغ سے بغاوت اور جنگ کی اور بابل پر قبضہ کر لیا۔ جب فالغ مر گیا اور اُس کا بیٹا ملکان اُس کا جانشین ہوا تو سوریان نے اُس پر خروج کیا اور تمام جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔[3]

اور ملوک بابل کے ذیل میں سوریان بن نبیط کا بھی ذکر کرتے ہیں :۔

ملوک بابل نبطی ہیں۔ یہ بابل میں رہتے تھے ان میں سوریان بن نبیط بادشاہ ہوا۔[4] اسی لیے صابئیت کو نبطی اور سریانی اقوام کا مذہب کہا جاتا ہے۔

نبطی اور سریانی اقوام متحد النسل اور متحد اللسان ہیں، فرق محض جزئی ہے۔ مسعودی اہل نینوی کے متعلق لکھتے ہیں۔

نینوی والے نبطی اور سریانی ہیں، ان کی جنس بھی ایک ہے اور زبان بھی ایک۔[5]

---

[1] کتاب العبر ج ۲، ص ۶۸۔ [2] کتاب العبر ج ۲، ذکر ملوک بابل۔
[3] کتاب العبر ج ۲، ص ۶۸ و مابعدہ [4] کتاب العبر ج ۲، ذکر ملوک بابل۔
[5] مروج الذہب۔ باب ملوک نینوی۔

علامہ ابن خلدون مسعودی سے نقل کرتے ہیں۔

مسعودی کے بیان کے موافق نبطی اہل بابل ہیں کیونکہ وہ نبطیین کے حالات میں لکھتے ہیں

ذکر ملوک بابل والنبط وغیرہم المعروفین بالکلدانیین[1]

فراعنۂ مصر کی طرح ملوک بابل کا لقب نمرود اکبر کے نام پر نمارده" تھا، علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں

ان مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ نام مختلف نسلوں میں آتا ہے کبھی سام کی طرف منسوب ہوتا ہے اور کبھی حام کی طرف[2]

نمرود ابراہیم علیہ السلام بھی انہی نمارده میں سے ایک نمرود تھا بابل میں ابتداءً انہی نمارده کی حکومت تھی۔ بخت نصر بھی انہی بابل کے بادشاہوں میں سے ہوا ہے[3]

یزدجرد بن مہبندار کہتا ہے:۔

سلاطین قدیم یعنی نبطی بادشاہ اور نمرود ابراہیم یہ سب لوگ بابل میں مقیم تھے۔ اسی طرح بخت نصر نے بھی شام کی فتوحات سے واپس آکر بابل میں قیام کیا[4]

یہ لوگ نسلاً حام اور سام حضرت نوح علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کی اولاد میں سے ہیں۔
حام اور اس کی اولاد بابل اور ارض بابل یعنی ساحل فرات پر قابض و حکمراں رہی اور اولاد سام دجلہ کے مشرقی ساحل پر آباد ہوئی، اور عرصہ دراز تک اپنے آبائی دین" وحدانیت" پر قائم رہی اسی وجہ سے انہیں" کلدانیین" کہتے ہیں۔ کلدانی کے معنی ہیں موحد۔ کلدانیین: موحدین

ابن خلدون فرماتے ہیں۔

اولاد سام حنفا رتھی، قدیم کلدانیین کا مذہب" توحید" تھا۔ ابن سعید کہتے ہیں کہ کلدانیین کے

---

[1] مروج الذہب باب ذکر ملوک بابل۔ [2] کتاب العبر ج ۲۔ ذکر ملوک بابل [3] حوالہ مذ [4] معجم البلدان ج ۲۔ ص ۱۸۔

معنی ہیں موحدین[۱]۔ سام دجلہ کے مشرقی ساحل پر آباد ہوا۔ دین حق اور توحید میں وہ اپنے باپ سام کا جانشین تھا[۲]۔

"کلدہ" قدیم زبانوں میں عراق عرب کو بھی کہتے ہیں جس کا دوسرا نام بابل ہے اسی کی چوتھی صدی کے مورخ قاضی ابن صاعدہ اندلسی کلدانیین، بابلین اور سریانیین کا مصداق ایک ہی قوم کو قرار دیتے ہیں۔ (طبقات الامم ص ۲)

ابومعشر کہتا ہے:-

کلدانیین ہی قدیم الایام میں بابل کے اندر رہتے تھے[۳]۔

اصطخری کا بیان ہے:-

مسلمان قدیم اہل بابل کو کبھی کلدانیین کے نام سے یاد کرتے ہیں اور کبھی کنعانیین نبطیین کے نام سے[۴]۔

قاضی ابن صاعدہ اندلسی فرماتے ہیں:-

دنیا کی دوسری قوم کلدانیین ہیں، یہ حکومت و سیادت کے بہت قدیم وارث ہیں ان میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے۔ انہی میں سے وہ نمارد بھی ہوئے جو اپنے ظلم و ستم کے لیے مشہور ہیں ان میں سب سے پہلا نمرود، نمرود بن کوش بن حام تھا جو مشہور قلعہ نمرود کا بانی ہے[۵]۔

کلدہ کی مذکورہ بالا تشریح کے مطابق کلدانیین ان کا وطنی نام ہوتا ہے۔ مگر ان دونوں بیانوں میں کچھ اختلاف نہیں حقیقت یہ ہے کہ طوفان کے بعد اولاد سام میں سے وہ قومیں جو عراق میں آباد اور عرصہ دراز تک اپنے آبائی دین وحدانیت پر قائم رہیں، عاد و ثمود کی طرح بت پرستی

---

[۱] کتاب العبر ج ۲ ص ۶۸ [۲] کتاب العبر ج ۲ ص ۲۴۔ [۳] معجم البلدان ج ۲۔ ص ۱۸

[۴] اصطخری ص ۱۰۱، یاقوت ج ۱۔ ص ۴۴۷۔ [۵] طبقات الامم ص ۲۳

اور اولادِ حام کی مانند بدعتِ صابئیت کو انہوں نے اختیار نہیں کیا، انہیں کلدانیین (موحدین) کہا گیا، اور کچھ بعید نہیں کہ اسی بنا پر ان کے وطن عراق عرب کو کلدہ یعنی سرزمین توحید سے موسوم کیا گیا۔ چنانچہ نسل سام میں سے عابر بن شالخ بن ارفخشذ نے کلدانیین کو ہمراہ لے کر نمرود اکبر کے مقابلہ پر خروج کیا اور بت پرستی کے خلاف علم جہاد بلند کیا لیکن نمرود کی قوت و شوکت کے سامنے ان کی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ نمرود نے عابر اور اس کی اولاد کو ان کے آبائی مسکن کوثیٰ اور نواحی دجلہ سے نکال دیا اور ان لوگوں نے وہاں سے منتقل ہو کر جزیرہ اور موصل میں قیام کیا اور دجلہ و فرات کے مابین تمام سوادِ عراق پر نمرودی حکومت اور صابئیت کا تسلط ہو گیا۔[1]

اولاد سام بھی زیادہ عرصہ تک اپنے آبائی دین توحید و رسالت پر قائم نہ رہ سکی اور نمرود کے جابرانہ تسلط اور بڑھتی ہوئی شوکت و قوت نے انکو بھی صابئیت کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اولادِ سام میں ارغو بن فالغ سب سے پہلا شخص ہے جس نے دین صابئیت اختیار کیا اور پھیلایا۔ اس کا باپ فالغ موحد تھا اور ارض موصل و جزیرہ میں مقیم تھا، باپ کے مرنے کے بعد ارغو اپنے آبائی مسکن کوثیٰ یا کلواذی واپس آگیا اور نمارد کی اطاعت اور انہی کا مذہب صابئیت اس نے قبول کر لیا اور کوثیٰ کی ایک نبطی عورت سے شادی کر کے وہیں رہنے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ آزر کے عہد تک برابر مذہب صابئیت ان کے خاندان میں جاری رہا یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے اور سب سے پہلے انہوں نے اپنے گھر سے ہی صابئیت شکنی شروع کی۔[2]

اسی نمرودِ اکبر نے صابئیت کو سب سے پہلے بت پرستی کے سانچے میں ڈھالا ورنہ اس سے قبل صابئیت اپنی اصلی شکل و صورت پر قائم تھی۔ طبری فرماتے ہیں۔

---

[1] کتاب العبر ج ۲ ص ۴۴ [2] کتاب العبر ج ۲۔ ذکر ملوک بابل۔

یہ تمام اولادِ سام وحام دینِ توحید پر قائم اور بابل میں آباد تھی یہاں تک کہ نمرود بادشاہ ہوا اور اس نے ان سب کو بت پرستی کی طرف دعوت دی اور انہوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔[۱]

حضرت ابراہیم علیہ السلام سامی النسل اور سام بن نوحؑ کی دسویں پشت میں ہیں۔ آپ کا خاندان جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں صابئی المذہب تھا، ان میں سب سے پہلے ارغو ابن فالغ نے صابئیت کی لعنت اور نمارده کی سیادت کو قبول کیا۔ آپ کے والد آزر[۲] نجوم کے بہت بڑے عالم تھے اور کواکب واصنام کی پرستش کرتے تھے۔ سیارات اور احکام نجوم کے موافق بت بناتے تھے، اُن کے بنائے ہوئے بت تاثیرات اور قضاءِ حوائج کے اعتبار سے بہت مؤثر سمجھے جاتے تھے اسی لیے لوگ ان سے بت بنواتے تھے اور آزر بت تراش کے نام سے مشہور ہیں۔ نازک خیال شعراء استعارات وتمثیلات میں بتانِ آزری انہی کی نسبت سے باندھتے ہیں۔ نمرود نے اُن کو شاہی صنم خانہ کا داروغہ مقرر کیا تھا۔ (طبری ج ۱ ص ۱۰۲ وتفسیر طنطاوی جوہری ج ۴ ص ۶۱)

ابراہیم علیہ السلام اسی نمرود اکبر کے عہد میں علیٰ اختلاف الروایات شام کے شہر حران یا کلدان کے شہر اُور یا ارض بابل (عراق عرب) کے شہر کوثیٰ میں پیدا ہوئے[۳]۔ ان کے والد انہیں شہر بابل میں لے آئے اور یہیں انہوں نے پرورش پائی، جوان ہوئے اور شادی کی اور پھر نارِ نمرود سے زندہ و

---

[۱] طبری ج ۱ ص ۱۰۵۔

[۲] قرآن حکیم نے ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر بتلایا ہے۔ اسفار تورات اور اس سے ماخوذ کتب تاریخ سے اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے لیے کوئی قوی سند نہیں چنانچہ مصر کے مشہور ومعروف عالم سید رشید رضا مصری رحمہ اللہ "تفسیر المنار" میں مذکورہ اقوال نقل کر کے فرماتے ہیں:۔

ان اقوال کی کوئی سند نہیں، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کوئی مرفوع روایت ثابت ہے اور نہ قدماء عرب سے، دراصل یہ کعب احبار اور وہب بن منبہ ایسے اہل کتاب کا بیان ہے جو خود بھی اسلام میں آئے اور اپنے ساتھ اس قسم کی بہت سی رطب ویابس اسرائیلی روایات لیتے آئے اور مسلمانوں نے ان روایات کو بلا نقد وجرح قبول کر لیا اس کے علاوہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور امام بخاری نے تاریخ کبیر میں بھی ان سب اقوال کی پرزور تردید کی ہے۔

[۳] ابراہیم علیہ السلام کے مقام ولادت کی تحقیق کے لیے انتظار کیجیے۔

سلامت نکل آنے کے بعد اس ملعون زمین کو خیرباد کہہ کر مصر اور وہاں سے شام کی طرف ہجرت کی[1]

آپ نے سب سے پہلے اپنے گھر اور خاندان ہی سے جو صابئیت یعنی بت پرستی اور کواکب پرستی کا سب سے بڑا مرکز تھا، تردید و تبلیغ شروع کی اور اپنے باپ آزر کو مخاطب کرکے فرمایا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو! میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

سیارات کی کم مائیگی و بیچارگی اور اُن کے لائق عبادت و پرستش نہ ہونے کو ذیل کے حکیمانہ انداز اور موثر اسلوب میں بیان فرماتے ہیں، اور اپنی قوم اور اُس کے مذہب بت پرستی اور سیارہ پرستی یا بالفاظ دیگر شرک سے بیزاری کا اظہار حنیفیت اور توحید خالص کا اعلان فرماتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ

اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمان و زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ کامل یقین رکھنے والوں میں سے ہوجائے۔ چنانچہ جب اس پر رات کی تاریکی چھاگئی تو اُس نے (آسمان پر) ایک چمکتا ہوا ستارہ دیکھا، تو اُس نے کہا، یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ڈوب جانیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے پھر جب وہ (بھی) ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی تو میں راہِ راست سے بھٹکے ہوئے گروہ سے ہو جاؤنگا۔ پھر جب آفتاب کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے، جب وہ بھی غروب ہوگیا تو کہا اے میری قوم! میں اُس سے بری ہوں جس کو تم خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، میں نے

[1] دائرۃ المعارف لفظ بابل۔

فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ تو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اُس ذات کی طرف اپنا رُخ کرلیا ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے اور میں قطعی مشرکین میں سے نہیں۔

جس مذہب سے ابراہیم علیہ السلام نے بیزاری کا اعلان کیا تھا وہ نمرودِ اکبر کا مذہب تھا وہ اپنے مذہب کی توہین بھلا کیسے برداشت کرسکتا تھا لہذا ملک و سلطنت کے نشہ میں مخمور سب سے پہلے وہ ہی حمایت کے لیے آمادہ ہوا اور اُس نے ابراہیم علیہ السلام سے اُس فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے متعلق مناظرانہ رنگ میں استفسار کیا، جس کو ابراہیم نے اپنا رب بتلایا تھا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں حجت کی (صرف) اس لیے کہ اللہ نے اُس کو عظیم الشان سلطنت دی تھی، جبکہ ابراہیم نے کہا "میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے" اُس نے کہا "میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں" تو ابراہیم نے کہا اچھا "اللہ تو (روزانہ) آفتاب مشرق سے نکالتا ہے تو اُسے مغرب سے لے آ" تب وہ جو خدا کا منکر تھا حیران و مبہوت رہ گیا۔ اور اللہ پاک ظلم کرنیوالی قوم پر (فوز و فلاح کی) راہ نہیں کھولتا۔

اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ سے مفسرین دعوئے ربوبیت اخذ کرتے ہیں حالانکہ نمرودِ اکبر تو کیا نمارود کے تمام سلسلہ میں بھی ہمیں کسی نمرود کی جانب سے خدائی کا دعویٰ نہیں ملتا بجز سیارہ پرستی، بت پرستی، ارواح پرستی اور شرک کے کوئی دوسری چیز اُن کے کردار میں نظر نہیں آتی۔ ایسی توہم پرست قوم اور خدائی کا دعویٰ بعید سا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو نمرود صرف ملک و سلطنت کے نشہ میں سرشار، معاندانہ جسارت اور عارفانہ تجاہل کے انداز میں کہتا ہے۔ انا احی وامیت لہذا ابراہیم علیہ السلام اس کے غرور و نخوت کو توڑنے کے لیے جواب ترکی بہ ترکی دیتے ہیں اور فرماتے

ہیں کہ یہ آفتاب جس کا تو پرستار ہے اور "رب اکبر" کہتا ہے یہ میرے رب کا فرمانبردار ہے اور اُس کے حکم سے روزانہ مشرق سے نکلتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے تو لے آ۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی آخر کچھ نہ بن پڑی اور مبہوت وحیران مُنہ تکتا رہ گیا۔ گمراہ انسانوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام مساعیٔ دعوت وارشاد، بت پرستی اور کواکب پرستی کے خلاف ان کے تمام براہین واحتجاجات اور کھلم کھلا بت شکنی اس ممسوخ الفطرت قوم کے سامنے سب بیکار ثابت ہوئیں اور آپ کے مقابلہ سے تنگ آکر اُنہوں نے فیصلہ کیا۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ۔ اُنہوں نے کہا جلا دو اس کو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔

اللہ پاک نے اپنے خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مقہور ومنکوب انسانوں کے نرغے سے بچا لیا۔ اور حکم فرمایا:۔

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ہم نے کہہ دیا اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا، اور اُنہوں نے تو ابراہیم کو نقصان پہنچانا چاہا تھا۔ ہم نے اُنہی کو خسارہ میں مبتلا کر دیا۔"

آخر اللہ کے خلیل نے اس بدبخت قوم اور ملعون زمین سے ہجرت کا اعلان فرمایا۔

وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی جانب ہجرت کرنے والا ہوں بیشک وہ ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

چنانچہ اللہ پاک نے اپنے خلیل کو ارض مقدس یعنی شام میں پہنچا دیا۔

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ۔ اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو اس سرزمین مقدس میں پہنچا دیا، جس میں ہم نے تمام عالم کے لیے برکت مہیا فرمائی ہے۔

الغرض ابراہیم علیہ السلام سامی النسل اور آپ کا مولد و منشا بابل ہے نبطی، سریانی، کلدانی بابل کی قومیں ہیں، اور نمارده اس عہد کے ملوک بابل، ان سب کا مذہب صابئیت تھا سالہا سال تک بابل پر انہی نمارده نے حکومت کی یہاں تک کہ بابل کا مشہور فاتح عالم بادشاہ بخت نصر بھی انہی میں سے تھا۔

مذکورۂ بالا بیانات سے آپ محسوس کرینگے کہ سحر و صابئیت کے ساتھ بابل کو بہت گہرا تعلق ہے۔ سالہا سال تک بابلی اقوام و سلاطین کا مذہب صابئیت رہا ہے۔ سحر و طلسمات اور نجوم وغیرہ بابلی اقوام کے مخصوص علوم ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی تاریخ پر بھی کچھ تبصرہ کیا جائے تاکہ سحر و صابئیت کی تاریخ بالخصوص اس دور ثانی میں زیادہ روشن ہو جائے۔

بابل بابل دنیا کی سات ولایتوں میں سے ایک سرسبز و شاداب ولایت بھی ہے اور مصر و شام کی طرح ایک صوبہ بھی اور دنیا کا ایک قدیم ترین تاریخی شہر بھی۔ ہم ہر سہ پہلو سے اسکی حدود، محل وقوع اور تاریخی حالات بیان کرتے ہیں۔

اقلیم بابل دنیا کی سات ولایتوں میں سے ایک ولایت کا نام بابل ہے۔

ویظہران الفرس کانوا قد اطلقوا اسم بابل علی الاقلیم الرابع مراد فالاسم ایرانشہر۔ (دائرۃ المعارف، لفظ بابل)

تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس چوتھی اقلیم کو بابل کہتے ہیں جو ایرانشہر کے مرادف ہے۔

مگر مسعودی اقلیم اول کو بابل کہتا ہے، اور خراسان، فارس، اہواز، موصل وغیرہ کو اس میں شامل کرتا ہے۔

واما الاقالیم السبعۃ فاولہا بابل منہ خراسان وفارس واہواز والموصل و

سات ولایتوں میں سے پہلی ولایت بابل ہے۔ خراسان، فارس اہواز، موصل اور کوہستانی علاقہ کردستان اس میں شامل ہو

ارض الجبال (مسعودی باب ذکر الاقالیم)

بابل اصل میں شہر کا نام ہے اسی مناسبت سے صوبہ اور ولایت کو بھی بابل کہتے ہیں۔ اقلیم بابل سب سے زیادہ سرسبز و شاداب اور آباد ولایت ہے، تہذیب و تمدن اور آثار عمرانیت کا گہوارہ بلکہ تمام عالم کی روح ہے۔

ویقول ابن خرداذبہ ان بابل قلب ایرانشہر و قلب العالم — ابن خرداذبہ کہتا ہے کہ بابل ایرانشہر (فارس) کا قلب اور عالم کی جان ہے۔

واقلیم بابل اوسط الاقالیم ولهذا کان اشرفها (دائرۃ المعارف) — ولایت بابل تمام ولایتوں کے وسط میں ہے اسی لیے سب سے افضل و اشرف ہے۔

اقلیم بابل کے متعلق طبری مورخین فرس سے نقل کرتے ہیں:۔

مورخین فرس کہتے ہیں روئے زمین سات ولایتوں پر منقسم ہے بابل اور اس سے متصل بحر و بر جہاں تک آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے سب ایک اقلیم ہے۔

بابل تاریخ فرس میں ایرانشہر کا مرادف ہے اور ایران افریدون کے بیٹے ایرج کے نام سے ماخوذ ہے۔ جیم کو نون سے بدل لیا۔ افریدون نے یہ اقلیم بابل اپنے محبوب ترین فرزند ایرج کو دی تھی (طبری جلد ا ص ۱۰۹)

صوبہ بابل | مصر و شام کی طرح بابل بھی ایک صوبہ ہے جس کو سامی زبانوں میں ایرخ (عراق) اور تورات کی زبان میں سنعار بھی کہتے ہیں اس وقت کی تقسیم کے لحاظ سے اس کو سوادِ عراق سمجھیے۔

ارض بابل کا اطلاق صوبہ عراق پر ہوتا ہے یاقوت اپنی کتاب معجم میں جو حدود صوبہ بابل کی بتلاتا ہے وہ مسعودی کے بیان کی بہ نسبت بہت تنگ ہیں یاقوت کہتا ہے: صوبہ بابل دجلہ کی جانب کسکر کی ترائی تک اور فرات کی جانب کوفہ کے اس طرف تک اس درمیان میں

جو علاقہ ہے اسے بابل کہتے ہیں ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے ! انبار جو ساحل فرات پر

ایک مشہور شہر ہے، شمالی حد ہے۔ (دائرۃ المعارف تربیانسائیکلوپیڈیا آف اسلام)

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس ارض بابل سے بالعموم اقلیم بابل اور اہل عرب صوبہ بابل (سوادعراق) مراد لیتے ہیں، اسی بنا پر ایرانی مورخین حدود بابل ہند وسند اور جزیرۃ العرب تک بتاتے ہیں، مسعودی کے پیش نظر یہی ہے۔ اور عرب مورخین اس کو عراق پر منحصر کر دیتے ہیں، یاقوت حموی کا طمح نظر یہ ہے اسی لیے وہ حدود بابل کو اس قدر وسیع بیان نہیں کرتا۔

شہر بابل دریائے فرات کے کنارے ایک نہایت قدیم شہر ہے جس کو قدیم اہل فارس اور نبطی "بابیل" یا "بافیل" یا "بابیلون" کہتے تھے اور کلدانیین خنیرث۔ اور طبری کی روایت کے موافق خارث کہتے تھے۔ اس کا عرض البلد شمالی ۳۲ درجہ ۳۰ دقیقہ ۴۱ ثانیہ ہے، اور طول البلد شرقی ۴۴ درجہ ۲۲ دقیقہ ۳۰ ثانیہ ہے۔ (دائرۃ المعارف لفظ بابل)

بابل اس قدر پرانا شہر ہے کہ اس کے بانیِ اوّل کا پتہ چلانا بہت مشکل ہے حقیقت یہ ہے کہ جو قوم بھی برسرِ اقتدار آئی اور جو بادشاہ بھی حکمراں ہوا اسی نے اپنے حسب منشا اسے تعمیر کیا ع "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" یاقوت کہتے ہیں:-

> علماء تورات کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام بابل میں رہتے تھے لہذا سب سے پہلے وہی بابل کے آباد کرنے والے ہیں۔ "(معجم ج ۲ لفظ بابل)

یاقوت کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر بابل کو سب سے پہلے نوح علیہ السلام نے آباد کیا۔ طوفان کے بعد کشتی سے اتر کر وہ اپنی اولاد و احفاد کے ساتھ یہیں رہے ان کے دونوں بیٹوں حام و سام کی اکثر نسل یہیں پروان چڑھی۔ یہیں انھوں نے شہر تعمیر کیے۔ یہاں تک کہ ان کی آبادی دجلہ سے کسکر کی ترائی تک اور فرات سے کوفہ کے اس طرف تک پہنچ گئی۔ شہر بابل

اس صوبہ کا پایۂ تخت تھا اور سلاطین بابل یہیں رہتے تھے۔ (معجم ج ۲ لفظ بابل)

اولاد حام رفتہ رفتہ قوت و شوکت اور حکومت و سلطنت پر قابض ہو گئی حکومت کے نشہ میں آبائی دین کو بھی خیرباد کہا اور صابئیت اور بت پرستی شروع کر دی۔ اولاد سام ابھی تک آبائی دین وحدانیت پر قائم تھی رات دن بنو حام سے نزاعات اور آویزشیں رہنے لگیں۔ آخر نسل سام کے ایک بہت بڑے حصے یعنی اولاد ارم وغیرہ نے (جن کو عرب عاربہ اور امم بائدہ کہتے ہیں اور عاد و ثمود انہی میں کی بت پرست قومیں ہیں) اپنے آبائی وطن بابل کو خیرباد کہا اور جزیرۃ العرب کو اپنے قیام کے لیے تجویز کیا[1] اور بقیہ اولاد سام میں سے کچھ لوگ دجلہ کے مشرقی ساحل پر مقیم رہے اور کچھ جزیرہ اور موصل وغیرہ کی جانب جا بسے اور نمارده کے ساتھ مذہبی حرب و پیکار کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اولاد حام یہیں رہی اور انہی کی نسل کا سب سے پہلا بادشاہ کنعان بن کوش بن حام بن نوح ہے جس نے بابل پر بڑی صولت و دبدبہ کے ساتھ حکومت کی اور شہر بابل کو ۱۲ فرسخ (۳۶ میل) میں آباد کیا۔ اس کے بعد تخت و تاج اور زمام حکومت کنعان کے بیٹے ظالم نمرود کے ہاتھ آئی، اور اس نے روئے زمین پر کوس "أنا ولا غیری" بجایا۔ (کتاب العبرج ۲)

پھر اسی نمرود نے سب سے پہلے صابئیت کو کوکب پرستی کے ساتھ بت پرستی میں رنگا اور حکومت کی حمایت و قوت سے پھیلایا اور تمام گرد و پیش کی اقوام کو صابئی بنایا۔

فکل ھؤلاء کان علی الاسلام وھم ببابل حتی ملکھم نمرود فدعاھم الی عبادۃ الاوثان ففعلوا[2]	یہ سب لوگ توحید پر قائم تھے یہاں تک کہ نمرود بادشاہ ہوا اور اس نے سب کو بت پرستی کی دعوت دی اور سب کے سب بت پرست بن گئے۔

---

[1] کتاب العبر ج ۲۔ ص ۱۸ و ۲۷　　[2] طبری جلد اول۔

کلدانیین (موحدین اولاد سام) سے بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں بالآخر وہ بھی صابئیت کو نہ بچ سکے اور سب سے پہلے ان میں سے ارغو نے صابئیت کو قبول کیا۔ یہ عرب مورخین کے بیانات ہیں اس کے بالمقابل مورخین فرس مدعی ہیں کہ بابل کو سب سے پہلے کیومرث کے پوتے ہوشنگ نے آباد کیا اور یہ دنیا کے ان دو شہروں میں سے دوسرا شہر ہے جو سب سے پہلے روئے زمین پر آباد کیے گئے[1]۔

مشہور فارسی مورخ یزدجرد بن مہبندار بابل کا بانی بیوراسپ (ضحاک) کو قرار دیتا ہے اور ہشام بن محمد کلبی بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

بابل کی وجہ تسمیہ بابل کا لفظ لغوی حیثیت سے فرقت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے تبلبل بمعنی افتراق و انتشار اسی سے آتا ہے لہذا اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں علماءِ تورات کہتے ہیں:۔

۱۔ ہابیل کے قتل پر جب آدم علیہ السلام قابیل پر ناراض ہوئے تو وہ اپنی اولاد سمیت بابل سے بھاگ کر کوہستانی علاقہ میں جا بسا۔ اس جدائی کی وجہ سے اس کا نام بابل رکھا گیا[2]۔

۲۔ نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد طوفان کے بعد عرصہ دراز تک بابل میں رہی اور اس کے بعد وہیں سے دنیا میں پھیلی اور ان کی زبانیں بھی الگ الگ ہوئیں۔

وقیل ان اللہ فرق انباء نوح فی الارض بابل وفیہا تبلبلت الالسن — کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے اولاد نوح کو بابل ہی سے تمام دنیا میں پھیلایا اور منتشر کیا اور وہیں ہو زبانوں کا افتراق و انتشار وقوع میں آیا۔

مدونین دائرۃ المعارف الاسلامیۃ کی رائے ہے کہ لفظ بابل کا لغوی تعلق اس قصہ سے مشہور و معروف ہے۔

---

[1] طبری جلد اول۔ [2] معجم البلدان ج ۲ ص ۱۹۔

ووصلۃ اسم بابل بھذہ القصۃ من الناحیۃ اللغویۃ امر معروف (انظر سفر تکوین، الاصحاح ۱۱ فقرہ ۹)

بابل کے نام کا تعلق لغوی حیثیت سے اس قصہ کے ساتھ مشہور ہے (دیکھو سفر تکوین، اصحاح ۱۱ فقرہ ۹)

یاقوت حموی بھی افتراق السنہ کو ہی وجہ تسمیہ قرار دیتے ہیں۔

وتبلبلت الالسن فسمیت بابل۔ (معجم البلدان ج ۲ ص ۱۹)

بابل میں زبانوں کا افتراق وقوع میں آیا لہٰذا اس کا نام بابل رکھ دیا۔

طبری اس واقعہ کو ایک عجیب انداز میں نقل کرتے ہیں جو بالکل مستبعد معلوم ہوتا ہے لکھتے ہیں

تمام اولاد سام توحید پر قائم تھی یہاں تک کہ نمرود بن کوش بادشاہ ہوا تو اس نے ان کو بت پرستی کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ سب کے سب بت پرستی کرنے لگے لہٰذا شام کو وقت تو ان سب کی زبان قدیم آبائی زبان "سریانی" تھی پھر صبح جو ہوئی تو اللہ نے ان کی زبانیں جدا جدا کردیں، اور ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھتے تھے۔ (طبری ج ۱ ص ۱۰۵)

رات کو سوئے تو سب کی زبان ایک اور آپس میں ایک دوسرے کی بات سمجھتے تھے صبح کو جو اٹھے تو زبانیں الگ الگ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتا عجیب منظر ہوگا۔ اس حادثہ فاجعہ کو ان مورخین کی اصطلاح میں "بلبلہ" کہتے ہیں۔

یہ واقعہ اس تفصیل کے ساتھ واقعی بعید از عقل وفہم ہے اور اسی بنا پر علامہ ابن خلدون نے اس کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ پھر خود ہی اس واقعہ کی توجیہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ افتراق السنہ وعادات کے بارے میں قدرتِ خداوندی کا ایک کرشمہ ہے اور نظام قدرت کی طرف اشارہ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناقلین نے قصہ میں ندرت و استعجاب پیدا کرنے کے لیے حاشیہ آرائی

سے کام لیا ہے ورنہ اصل حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اولاد نوح طوفان کے بعد ارض بابل میں اُتری اور ایک عرصہ تک وہیں رہی پھر وہیں سے قومیں اور اُن کے ساتھ نسلیں اطرافِ عالم میں پھیلیں دنیا کے جس گوشہ میں لوگ گئے اور آباد ہوئے وہاں کے ماحول اور مقامی تاثرات سے متاثر ہو کر قومیں اور زبانیں الگ الگ بن گئیں۔

۴۔ سریانی زبان میں بابیلو ستارہ مشتری کا نام ہے، اسی کے نام پر ضحاک نے اس شہر کا نام بابل یا بابیل رکھا۔ (معجم ج ۲)

بابلیوں کے علوم و فنون اور مذاہب

ریاست و سلطنت اور عمرانیت و مدنیت کی طرح علوم و فنون کا درس بھی دنیا کو بابلیوں نے ہی دیا ہے اور وہی معلم اول اور اُستاذ الاساتذہ ہیں۔ قاضی صاعد بن احمد اندلسی "طبقات الامم" میں لکھتے ہیں۔

"کلدانیین کے علماء حکمت و فضل میں تمام دنیا سے بڑھے ہوئے تھے جملہ انواع علوم میں وہ کامل دسترس رکھتے تھے خواہ صنائع و حرف کی تعلیمات ہوں خواہ علوم ریاضیہ الٰہیہ۔ حرکاتِ کواکب کی دیکھ بھال میں انہیں خاص شغف و کمال حاصل تھا علم اسرار فلک سے پورے طور پر واقف تھے۔ کواکب کی طبائع اور احکام اور اُن سے پیدا ہونے والی اشیاء اور قویٰ کے متعلق اُن کی واقفیت مسلم اور مشہور ہے۔ ستاروں کی ارواح و قویٰ کو مسخر کرنے کے لیے ہیکل اور مجسمے بنانے کی تدبیر اور مختلف ستاروں کے مناسب نذر و نیاز اور قربانیوں اور طرح طرح کی مخصوص تدابیر سے اُن کی طبیعتوں کو اُن مجسموں پر اُتارنا اور اُن کی شعاعیں اور تاثیرات ان پر ڈالنا یہ وہ راستہ ہے جس کی داغ بیل تمام عالم کے لیے اُنہوں نے ہی ڈالی چنانچہ عجیب و غریب کام اور تعجب خیز نتائج ان سے ظاہر ہوئے۔ طلسمات و نیرنجات اور فنون سحر اُنہوں نے ایجاد کیے۔

ہرمس ثانی

علماء بابل میں سب سے زیادہ بزرگ اور مشہور حکیم "ہرمس بابلی" ہے۔ یہ سقراط کے زمانہ میں

گزرا ہے مشہور منجم ابومعشر نے کتاب الالوف میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہی وہ حکیم ہے جس نے علم نجوم وفلسفہ کی بہت سی متقدمین کی برباد شدہ کتابوں کی تصحیح کی اور اُن کے علاوہ مختلف علوم وفنون میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ قاضی صاعد فرماتے ہیں کہ ہرمس بابلی کے جو اقوال وآرا ہم تک پہنچے ہیں وہ علم نجوم میں اس کے فضل وکمال اور شرف پر واضح دلیل ہیں۔

تیسری صدی کے مشہور امام ابوبکر جصاص احکام القرآن میں فرماتے ہیں۔

"اہل فارس کے استیلاء سے پہلے اہل بابل کے علوم شعبدہ اور طلسمات ونیرنجات اور احکام نجوم تھے۔ یہ علوم سحر ونیرنجات سریانیین وکلدانیین باشندگانِ بابل میں اور قبطیین باشندگان مصر میں رائج تھے۔ ان علوم میں ان کی تالیفات وتصنیفات بھی ہیں مگر ان میں سے بہت ہی کم کتابیں عربی میں ترجمہ ہوسکیں۔ مثلاً تصانیف اہل بابل میں سے "فلاحۃ نبطیہ" (احکام القرآن ج ۱ ص ۴۹)

علامہ ابن خلدون ملوک بابل وموصل کے احوال میں فرماتے ہیں:۔

ملوک بابل وموصل صابئی تھے ستاروں کی پرستش کرتے تھے اور اُن کی ارواح کو بذریعہ طلسم وسحر اُتارتے تھے۔ اسی طریق کا نام "صابئیت" ہے۔ علم نجوم اور طلسمات وسحر میں اُن کو بڑا دخل تھا۔ ستاروں کی حرکات، تاثیرات اور اُن سے پیدا ہونے والے حوادث سے خوب واقف تھے۔ عالم کے ربع غربی حصہ کے لیے ان علوم کی بنیاد اُنہوں نے ہی ڈالی ہے بعض لوگ اس دعوے پر وما انزل علی الملِکین بکسر لام کی شہادت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہاروت وماروت ملوک سریانیین میں سے ہیں یہی بابل کے سب سے پہلے بادشاہ تھے اور قرأت مشہور کے موافق علی الملَکین بفتح لام، یہ دونوں فرشتے تھے، اس صورت میں اس فتنہ کا بابل کے ساتھ مخصوص ہونا بھی اس امر کو بتلاتا ہے کہ اہل بابل سحر وطلسمات میں بمقابلہ تمام باشندگان عالم کے

ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اہل مصر میں علوم سحر و طلسمات کا اس شد و مد کے ساتھ پایا جانا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اہل بابل ان علوم میں معلم اول ہیں اور یہ علوم بابل سے ہی مصر میں آئے ہیں کیونکہ مصر اور مصری قدیم الایام میں بابلیون کی ہمسائیگی کی وجہ سے ہمیشہ ان سے اثر پذیر اور اُن کے علوم و فنون کو قبول کرنے والے رہے ہیں۔ مصر کی سیارہ پرستی بابل سے آئی ہے۔ مصر میں سحر و طلسمات کے عجیب و غریب آثار باقیہ (اہرام مصر) اب تک موجود ہیں اور ہمارے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ (کتاب العبرج ۲۔ ذکر ملوک بابل)

امام ابوبکر جصاص بابلیین کے متعلق لکھتے ہیں۔

اہل بابل "صابی" تھے سیارات سبعہ کی پرستش کرتے تھے اور اُن کو معبود کہتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ تمام حوادثِ عالم ان سیارات کے افعال و حرکات سے وابستہ ہیں۔ یہ بھی انہی دہریوں میں سے ہیں جو کسی ایسے خدائے واحد کو نہیں مانتے جو سیارات اور تمام اجرام علویہ کا پیدا کرنیوالا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ پاک نے اسی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجا بابل، عراق، شام، مصر اور روم کے باشندے بیوراسپ کے عہد تک جسے عرب ضحاک کہتے ہیں۔ اسی عقیدہ پر قائم رہے۔

سیارات سبعہ کے ناموں پر بت بنواکر ان کی پرستش کرتے تھے۔ ہر ستارہ کا ایک معبد ہوتا تھا جس میں اس کے نام کا بت رکھا ہوتا تھا جس ستارہ سے اپنے عقیدہ کے موافق کوئی نیک یا بد کام لینا چاہتے تھے اس کے موافق طرح طرح کے افعال و اعمال کے ذریعہ اس سے قرب حاصل کرتے اور عبادت کرتے۔ (احکام القرآن ج ۱)

(باقی)

سائنس اور اُلوہیت

(از جناب مولوی سید عقیل محمد صاحب بی ایس سی، ایل ایل بی (علیگ))

ہمارے محترم دوست مولوی سید عقیل محمد صاحب علیگڈھ کے بی ایس سی۔ اور میرٹھ کے کامیاب وکیل ہیں لیکن فکر و عمل کے اعتبار سے نہایت راسخ العقیدہ مذہبی مسلمان اور جوان صالح ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی وضع قطع اور ہیئت و صورت کے لحاظ سے بھی صلحائے اُمت کے نمونہ ہیں۔ اُمید قوی ہے کہ موصوف کا مضمونِ ذیل دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔ اور اُن نوجوانوں کے لیے سرمایۂ عبرت ثابت ہوگا جو فلسفہ و سائنس کی رہنمائی قبول کر کے مذہب اور اُس کی روایات قدیمہ میں شک و شبہ کرنے لگتے ہیں۔ اور اس سے اُن حضرات کو بھی اصلاحِ خیال کا موقع ملیگا جو سائنس دانی کو انکارِ مذہب کا مترادف خیال کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ جناب موصوف آئندہ بھی اپنے مضامین عالیہ سے قارئین برہان کو مستفید کرتے رہینگے۔ "برہان"

فکر انسانی کو قدرت نے دو شعاعیں عطا کی ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ بیرونی شعاع حواس خمسہ سے متعلق ہے جو اُس کو پے درپے اطلاعات پہنچاتے رہتے ہیں اور اس کے لیے بہت سے اُمور میں ارادہ کی بھی ضرورت نہیں ہے اور بعض میں ارادہ کی حرکت اس قدر خفیف ہوتی ہے کہ اُس کا احساس نہیں ہوتا۔ بہر حال ہر پیغام جو باہر سے موصول ہوتا ہے لوح دماغ پر نقش ہو جاتا ہے اور یہاں سے فکر انسانی کی دوسری پرواز شروع ہو جاتی ہے

اُس کے پاس سابقہ تجربات کا ایک خزانہ موجود ہے جسے وہ مختلف عنوانات میں تقسیم کر چکا ہے ان عنوانات کو وہ قوانین فطرت کے نام سے موسوم کرنے کا عادی ہے۔ اس کتاب کے اوراق میں بہت جگہ عبارتیں محو ہو چکی ہیں اور صرف سرخیاں باقی رہ گئی ہیں جو ایک دائمی سرمایہ ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی پنیر کے چھلکے کو نکال کر پھینک دیتے ہیں اور مغز کو رکھ چھوڑتے ہیں۔ غرضکہ ہر جدید مشاہدہ یا تصور جو ابتداءً ایک نقطہ معلوم ہوتا تھا قوانین مذکورہ کی روشنی میں خاص قسم کی شرح اور ربط پیدا کر لیتا ہے۔ اندرونی شعاعیں نہ صرف حرکت میں آجاتی ہیں بلکہ پھیلتے پھیلتے عالم محسوسات کے دائرے سے بھی گذر جاتی ہیں اس تگ و دو میں بعض مرتبہ کافی انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ عبارتیں کی عبارتیں قلمزد کر دی جاتی ہیں اور سرخیاں تک ترمیم ہو جاتی ہیں۔ ہم فکر انسانی کی بیرونی شعاعوں کو بصارت کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اور اُس کی اندرونی پرواز کو بصیرت کا لقب دے سکتے ہیں۔

قوتِ بصیرت انسانی فضیلت کی پہلی کڑی ہے اس کے ماسوا عالم حیوانات میں محض تاریکی نظر آتی ہے کیونکہ اُن کی زندگی فطرت کی اندھی تقلید میں گذر جاتی ہے اور اُن کے قوائے عملیہ اور خیالیہ صرف محدود دائروں میں کام کر سکتے ہیں۔ اُن میں محکومیت کے سوا حاکمیت کی شان کسی اعتبار سے نظر نہیں آتی۔ اس موقعہ پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ جس قدر دماغی حرکات بصیرت سے متعلق ہیں وہ اضطراری نہیں ہوتیں بلکہ اُن کے لیے قوی اور مستحکم ارادہ درکار ہے، جیسا کہ شناوری یا شہسواری میں پایا جاتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ بعض تصورات بجلی کی طرح کوند جاتے ہیں اور نامعلوم طبقات کو روشن کر دیتے ہیں جن میں بظاہر ارادہ کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں اکثر غیر محسوس ارادہ بھی شامل ہوتا ہے اور اگر مفقود ہے تو ہر ایسا تجربہ وجدان کی تعریف میں آئیگا جو اس وقت خارج از بحث ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ قوی ارادہ کے لیے قوی تر

محرکات کی بھی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر تامل کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انسان اس مفید مہم پر صرف دو جذبوں کے باعث مستعد نظر آتا ہے ایک اپنی ترقی اور بہبودی کا خیال اور دوسرا تلاشِ حق۔ اول الذکر سعی کا میدان تمامتر محسوسات اور مادیات کے دائرہ میں واقع ہے اور دوسری کوشش محض عالمِ خیال کی پردہ دری میں مصروف رہتی ہے، یہاں ہر منزل پر ایک کیفیت تحیر و عجب کی طاری رہتی ہے جو پائے جستجو کو مضمحل نہیں ہونے دیتی اور مسافت جتنی زیادہ نظر آتی ہے شوق بڑھتا رہتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد سائنس اور فلسفہ کا فرق ظاہر ہوجاتا ہے کیونکہ سائنس تمامتر اُن رموز فطرت کی جانچ میں مشغول ہے جو مادہ کی ترتیب و تشکیل سے متعلق ہیں۔ برخلاف اس کے فلسفہ لطیف حقائق کا متلاشی ہے اور وہ روح، قلب، خیال اور مادہ کی اصلیت وغیرہ اُمور عالی سے بحث کرتا ہے۔ سائنس جزئیات اور اُن جزئیات کی گہرائیوں میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے، فلسفہ جزو سے کل کی طرف بسرعت عود کرتا ہے اور کلیات کے عرض و طول کے پہچاننے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سائنس جدید نے ظنیات میں بہت کچھ دخل دینا، اور اُدھر فلاسفہ نے اپنے خیالات کو سائنٹفک انکشافات سے آراستہ کرنا شروع کردیا ہے مگر ہر دو فنوں میں جو امتیاز چلا آتا ہے وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اِس سے یہ بھی مُراد نہیں ہے کہ سائنس میں باریک قیاسات اور بلند پروازی کا فقدان ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ ان تمام خیال آرائیوں کا رجحان عموماً مادی اشیاء اور اُن کے افعال و خواص کی طرف رہتا ہے۔

یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ علومِ فطرت میں صداقت اور حقیقت کا معیار کیا ہوسکتا ہے۔ اور آیا کوئی معیار ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ مگر اس اہم سوال کا جواب دینے سے قبل یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ حقائق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا تعلق محض مشاہدہ اور تجربات سے ہوتا ہے اور ثانیاً وہ جو اگرچہ کسی تجربہ سے ماخوذ ہوں مگر اپنے موضع میں تجربات سے اس قدر

بعید ہو جاتے ہیں کہ اُن کا ادراک محض ظن اور وہم کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے اور اُن کا تصور خیال کی سطح سے نیچے نہیں اُتر سکتا۔ان علوم کو اگر فلسفۂ سائنس کے لفظ سے تعبیر کریں تو زیادہ موزوں ہوگا۔اس کی مثال یہ ہے کہ یہ امر بے شمار تجربات سے ثابت ہے کہ کسی ثقیل شے کو اگر ہوا میں تولا جائے اور پھر پانی میں ڈبو کر تولا جائے تو اُس کا وزن ہلکا ہو جائیگا اور ہر دو اوزان کے فرق سے اُس کا حجم ٹھیک ٹھیک نکل آتا ہے یا مثلاً یہ کہ پانی ایک مرکب شے ہے مفرد نہیں ہے۔کیونکہ روزہ مرہ بجلی کی قوت کے ذریعہ سے اُس کے دُخانی عناصر جُدا کر لیے جاتے ہیں اور الگ الگ استعمال میں آتے ہیں، یہ سب حقائق تجربات سے متعلق ہیں لیکن اگر اس کے ماوراء ہم اس پر بحث کریں کہ پانی کے اجزاء ایک دوسرے سے کیونکر مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے اور وہ کونسی طاقت تھی جو اس بندش کو روکے ہوئے تھی تو اگرچہ اک ماہر اپنی تحقیقات کی بنا پر جواب دیدیگا کہ ہر مفرد کے ذرات برقی اثرات رکھتے ہیں جو ایک دوسرے کو جذب کر لیتے ہیں چنانچہ برقی طاقت سے اُس کا مقابلہ کرنا اور اُس رشتہ کو توڑ دینا بھی ممکن ہوا تاہم یہ نظریہ نوک خیال پر معلق ہے اور عالم شہود کی ہوا لگنا اس کو کبھی نصیب نہ ہوگا۔یہی وہ علوم ہیں جن میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کا امکان ہے اور جن پر اعتماد کر لینا صریح غلطی ہے۔بلکہ جو حقائق تجربات سے آشکارا ہیں وہ بھی علی الدوام قول فیصل کی تعریف میں نہیں آسکتے۔مثلاً یہ امر مسلّم رہا ہے کہ ایک مفرد دوسرے مفرد میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ ہر مفرد کی خاصیت جزو لایتجزیٰ سے وابستہ ہے۔اور اُس میں شکست و ریخت ناممکن ہے چنانچہ ایک پوری صدی کے کردہا تجربات اس کی تصدیق بھی کرتے رہے، مگر اب حال میں جزو لایتجزیٰ کی اندرونی ماہیت جو دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ خود نہایت باریک برقی ذرات سے مرکب ہے اور نہایت قوی برقی شعاعوں کے ذریعہ ان ذرات کی ترتیب اور نوعیت میں فرق پیدا کرنے سے ایک

مفرد سے دوسرا مفرد تیار کرلینا تجربہ میں ممکن ثابت ہوا۔ اس بے ثباتی اور الجھن کے علاوہ فکر انسانی میں اندرونی کمزوریاں ایسی لاحق ہیں کہ جب وہ فلک بوس رفعتوں کی طرف مائل ہوتا ہے تو بسا اوقات اُس کا دامن خود اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور جو سیر اُس نے راستہ میں کی ہے اُس کے تمام جزئیات پر حاوی نہیں رہتا اس نوبت پر وہ اس قدر مخبوط ہو جاتا ہے کہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرسکتا بلکہ وہم کو حقیقت اور آمیزش کو صفائی سے تعبیر کرنے لگتا ہے۔ مزید براں مبصرانہ امور میں نقطۂ نظر کو بہت بڑا دخل ہے، جیسا کہ خود مادی اشیاء کے مشاہدہ میں پیش آتا ہے کسی چیز کو اگر فاصلہ سے دیکھا جائے اور پھر دوسرے پہلو سے اُس کا معائنہ کیا جائے تو مختلف شکلیں نمودار ہو جائینگی جب ہم خیالی تصورات کو فکر کی دوربین سے دیکھنا چاہینگے تو مغالطہ کے امکانات زیادہ قوی ہیں اور دار و مدار زیادہ تر اس پر ہوگا کہ ہم نے کس نقطۂ نگاہ سے کیسی سیر کو شروع کیا کیونکہ قدرت کا کارخانہ اس قدر وسیع ہے کہ اُس میں ہر قسم کی خیال آرائی کے لیے بخوبی راستہ مل جاتا ہے۔ بیسیوں جزئیات چھوٹ جانے کے بعد بھی اگر ایک جزئیہ ہاتھ آجائے تو بہت کچھ کامیابیاں اُس سے حاصل ہو جاتی ہیں دراں حالیکہ حقیقت سے دوری بدستور باقی رہتی ہے۔ اسی طلسمی کارخانہ کی ہر مشین بجائے خود ایک کارخانہ ہے اور مشین کا ہر پرزہ ایک مستقل مشین ہے۔ اس کی ظاہری مثال علم نجوم سے حاصل ہوسکتی ہے کہ متقدمین کے نزدیک آفتاب کا متحرک ہونا اور کرۂ ارض کا ساکن ہونا مسلم رہا ہے اُنہوں نے دیگر سیاروں کی رفتار اس نقطۂ نظر سے قائم کی اور حساب کے پختہ اُصول بھی مُرتب کرلیے جس میں وہ صدیوں تک کامیاب رہے اور شہرت حاصل کی۔ برخلاف اس کے سائنس جدید آفتاب کو ساکن اور کرہ ارض کو متحرک مانتی ہے اب وہی حساب اس نظریہ کے ماتحت پھیلایا جاتا ہے اور نتیجہ یکساں ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں حالتوں میں کرۂ ارض کا آفتاب سے فاصلہ بدستور

باقی رہتا ہے، صرف فرق ایک یا دوسرے کے متحرک ہونے کا ہے، جو سیارے ہر دو اجسام کے درمیان میں واقع ہیں، اُن کی گردش یا طلوع و غروب کے معلوم کرنے میں بھی بادی النظر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوسکتا۔ غرضکہ فلسفۂ قدیم یا جدید میں ایک مہتم بالشان غلطی صادر ہونے کے باوجود تجرباتی کامیابی یکساں میسر ہوئی۔ اسی پر قیاس کر لیجیے کہ طب قدیم نے ازالۂ مرض کا دار و مدار ادویات اور مریض کے امزجہ کے دریافت پر رکھا اور اُن کے فن کا بیشتر حصہ اسی جانچ میں صرف ہوتا رہا۔ طب جدید یا ایلوپیتھی مزاجی کیفیات کو محض خیالی اور رعاضی چیز قرار دیتی ہے اور جمادات یا نباتات میں مزاجی اثرات کو تسلیم نہیں کرتی۔ جہاں تک ادویات کا تعلق ہے وہ اُس کے کیمیاوی خواص پر نظر رکھ کر استعمال کرتے ہیں اور امراض کی تشخیص کا دار و مدار جراثیم کی نوعیت یا کھار اور تیزابی کیفیت نیز مخصوص معدنیات جن کو اجزاء بدن قرار دیا گیا ہے اُن کے گھٹنے بڑھنے پر ہے۔ ہر دو طرق علاج میں اصولی اور مادی حیثیت سے بعد المشرقین پایا جاتا ہے مگر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی طریقۂ علاج ناکامیاب رہا اور بنی نوع انسان نے اُس کو فضول سمجھ کر ترک کر دیا چنانچہ جن سوالات سے اس بحث کو شروع کیا گیا، اُن کا جواب مندرجہ ذیل نتائج کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے:-

(۱) علوم سائنس میں کوئی نظریہ عقیدہ کی تعریف میں نہیں آسکتا، مگر جزئیات کا ادراک کرنے کے لیے اور اُن پر حتی المقدور دسترس حاصل کرنے کے لیے جو حقائق براہِ راست تجربات سے متعلق ہیں وہ ایک قابل قدر علمی سرمایہ ہیں جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور آئندہ ترقیات و تحقیقات کے لیے ایک موثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔

(۲) جبکہ معلومات حقائق مذکورہ کو دوامی استقلال حاصل نہیں ہے اور تغیر و تردید سے مبریٰ نہیں ہیں تو اُن کو ظنی ادراکات و معارف کا معیار قرار نہیں دیا جاسکتا البتہ تجربات

سکے مین عقب میں جو ظنیات ہویدا ہیں وہ اُس وقت تک معلق ہیں جب تک کہ وہ تجربہ کی گرفت میں نہ آجائیں اور محسوسات کی فہرست میں داخل نہ ہوجائیں۔ بعید ظنی علوم اگرچہ بیشمار جزئیات پر اُن کو چسپاں ہی کیوں نہ کرلیا جائے، مغالطہ سے منزہ نہیں ہوسکتے اور علمی دماغوں کی آزمائش اور تفریح کے سوا اُن سے کوئی استفادہ نہیں ہوسکتا یاتَ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا

مقدمات مذکورہ سے ظاہر ہے کہ سائنس ایک مجازی علم ہے اور اُس کا دفتر مادیات کی طویل داستانوں سے لبریز ہے، مگر انہی علوم کا ایک حقیقی پہلو بھی ہے جو تمام تجربات، قدرتی سوالات اور ہر نقطۂ نگاہ پر چسپاں اور حاوی ہوجاتا ہے۔ عہد سابق میں عقلاء کی ایک کثیر تعداد اسی پہلو سے نہ صرف واقف تھی بلکہ اس کو بطور مسلمہ کے باور کرکے تمام کائنات اور اُس کے ہر ذرہ کو قدرت وجمال خداوندی کا مُظہر قرار دیتی تھی۔ اس کے برعکس دورِ حاضر میں ارباب سائنس کو الوہیت سے مستقل بُعد و انحراف ہے دراں حالیکہ وہ نہ صرف قدرت کے صرصری اور بالائی کرشموں کا معائنہ کرتے ہیں، بلکہ اُن کی نگاہ زیادہ تر اشیاء کے بطون پر پڑتی رہتی ہے۔ جہاں قدرت کی کارفرمائیاں باعتبار اپنے مسلسل موزونیت، دوررس اور لطیف ہونے کے زیادہ دلکش پیرایہ میں نظر آتی ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ علوم سائنس میں خود ایسے نقائص موجود ہیں جو اس حجاب کا باعث ہوتے ہیں۔ بلکہ اُس کے اسباب کی تحقیق انسان کے فطری خواص اور نفسیاتی امور سے متعلق ہے۔ روزمرہ کے قدرتی مشاہدات مثلاً آفتاب کی روشنی اور تمازت جو کارخانۂ حیات کی شرط اول ہے، ماہتاب کی ٹھنڈی شعاعیں جو نباتات کے نشو ونما اور اُن کے پھلنے پھولنے میں خاص طور پر حصہ لیتی ہیں، سطح زمین کے خصوصیات جو ایک طرف باعتبار اپنے معدنیات کے نباتات اور حیوانات کی غذا میں تبدیل ہونے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے اور دوسری جانب آبِ باراں کو بہ سرعت جذب کرکے جرم زیریں کی مخفی شرائین میں اس طور پر منتظر اور محفوظ کردیتی ہے کہ کسی قسم کا تکدر اُس

تک نہیں پہنچ سکتا اور پھر یہ شرائین جا بجا اُس کو چشموں کی شکل میں بہا دیتی ہیں یا بارش کا بروقت نزول جو مقررہ ہواؤں کے کاندھوں پر سفر کر کے بیشمار منتظر مخلوقات کی راحت اور تسکین کا باعث ہوتی ہے وہ ہوائیں جن کی سمت اور رفتار کا راز ابھی عقل انسانی حل بھی نہیں کر سکی ہے، غرضیکہ یہ مشاہدات ارباب سائنس کو متاثر کرنے کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ ان سب چیزوں سے اُن کو مساوات ہو چکی ہے اور اُن کی روزمرہ کی مشقوں نے اُن کو دقتِ نظر کا عادی کر دیا ہے۔ اُن کو اس میں عار ہے کہ وہ سطحی چیزوں سے کوئی سبق حاصل کریں۔ اُن کی نظر واقعات پر نہیں ٹھہر سکتی بلکہ اسباب میں منہمک رہتی ہے اور علت و معلول کی لاانتہا کڑیاں اُن کے سامنے رہتی ہیں اگر کسی جگہ نظر درماندہ یا خیرہ ہوگئی تو اُن کو یقین ہے کہ تجربات کے ناخن سے اس معمہ کو حل کر لیا جائیگا۔ وہ اپنا نقطۂ نظر ایسا قائم کر چکے ہیں جس میں حقیقت اور مجاز کے معروف مباحث کیلئے کوئی رسائی نہیں ہے۔ جو نکات تجربات سے برآمد ہوں اُن کے نزدیک حقیقت کی تعریف میں آتے ہیں۔ اور تجربات امور مجازی ہیں۔ جب کوتاہ نظری کا یہ عالم ہو تو اصل حقیقت شناسی کی توقع کرنا عبث ہے۔ اُن کو یہ خیال بھی دامنگیر رہتا ہے کہ الوہیت کا باضابطہ اعتراف "کیوں" اور "کس طرح" کے سوال کو پھینکا کر دیتا ہے اور تحیر و تجسس کو سکون اور اضمحلال سے بدل دیتا ہے۔ اُن کے نزدیک اس عالی نظریہ کے ماتحت فطرت کی عقدہ کشائی میں جو آزادی درکار ہے وہ میسر نہیں ہوتی۔ بیشک اُن کی تحریر و تقریر سے جا بجا پتہ چلتا ہے کہ کائنات کی گوناگوں نیرنگیوں کے باوجود جو اجزا میں باہمی ربط و تسلسل پایا جاتا ہے اور ایک موضع کے قوانین فطرت کی جو تکمیل بعید مواضعات کے قوانین سے ہوتی رہتی ہے نیز ارضی اور فلکی اجسام میں قیامت خیز طاقتوں کے پنہاں ہوتے ہوئے جو اعتدال کلی طور پر نمودار اور قائم ہے بیشک یہ قرائن ایک حقیقت عظمیٰ کا پتہ دیتے ہیں مگر اس اعتراف کو وہ طویل مباحث

اور موشگافی میں مستور کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور اپنے عمل سے اُس کو بالکل ساقط کر دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انسان ایک معذور و مجبور ہستی تھا جس کو قدرت کی قید و بندش سے جنبش کرنے کا یارا نہ تھا۔ علوم سائنس کے ذریعے سے وہ ان معذوریوں پر بیشتر حاوی ہو گیا اور اب وہ اطراف و اکناف میں فاتح فطرت کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ مثلاً وہ اب ہوا پر، سمندروں کی تہ میں اور سطح زمین پر بہ سُرعت سفر کرتا ہے نیز اپنی سمع و بصر کی طاقتوں میں ریڈیو اور دوربین جیسے آلات سے غیر معمولی وسعت پیدا کرنے کے قابل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تخیل وہم باطل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ صدیوں کی دماغ سوزی کے بعد فطرت کے بعض قوانین کا دریافت کر لینا اور اس علم کے ذریعے سے قانون فطرت پر عمل پیرا ہو کر ترقیات حاصل کر لینا فتح یا غلبہ کے مترادف نہیں ہو سکتا بلکہ طاقت فطرت کے اعتراف کی عین دلیل ہے گردوپیش پر نظر ڈالیے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ جو کرشمے مایۂ ناز سمجھے جاتے ہیں وہ دیگر حیوانات کو بدرجۂ اتم حاصل ہیں جیسا کہ تحقیقات جدید سے ثابت ہے کہ پروانوں اور چیونٹیوں کو لاسلکی پیغام ارسال کرنے کے قدرتی آلات حاصل ہیں۔ ایک پروانہ اُن کو استعمال کرتا ہے اور میلوں سے اپنے جوڑے کو بُلا لیتا ہے۔ ایک چیونٹی جو اتفاقِ وقت سے شیرینی کی خوشبو پا لیتی ہے اپنے بیشمار ہمجنسوں کو دعوتِ طعام دیکر اکٹھا کر لیتی ہے اور یہ چیزیں عام زندگی میں کسی قدر اہتمام اور غور کرنے سے مشاہدہ میں آجاتی ہیں۔ اِن شواہد سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے کمال کو بہت آخر میں پہنچ سکا ہے اور اُس کے مکمل نمونے ادنیٰ جانداروں میں بطور عطیات قدرت کے پہلے سے موجود ہیں۔ ارباب سائنس اگر اس عروج پر ناز کریں تو موزوں ہو گا کہ ہزارہا عالی دماغ انسانوں کے اور صدیوں کے غور و خوض کے بعد وہ حیوانات کے بعض کمالات کو سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں ایک طرف قدرت اپنے حجابات کو اُٹھاتی جاتی ہے اور علم کے بیش بہا دفائن و خزائن منظر

عام پرلاتی جاتی ہے تاکہ ذی ہوش مخلوق کے عقول بھی محوِ تماشائے ازل ہو جائیں اُدھر انسان اپنی کوتاہ نظری، کم ظرفی، اور عجلت پسندی کی بدولت ایک آشکارا حقیقت سے چشم پوشی پر تُلا ہوا نظر آتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر علمی آزادی کی فریبی آہنگ بلند کر کے اپنے نفس کو بے باک بنانا چاہتا ہے۔ بل یرید الانسان لیفجر امامہ۔ دقیق اور طویل سائنٹفک انکشافات میں اَن گنت امثال ونظائر قدرت خداوندی کے ظہور کے پائے جاتے ہیں جس میں سے چند بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں مگر اُن کو بخوبی سمجھنے کے لیے پہلے اشیاء کی حقیقت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ فلاسفۂ قدیم نے کائنات کو چار عناصر پر تقسیم کیا تھا مگر یہ نظریہ اب ایک منٹ کے لیے بھی قابل پذیرائی نہیں رہا، اول تو مخلوقات دو بڑے اجزا میں تقسیم ہوتی ہے۔ مادہ اور طاقت، ہر وزن دار شے مادہ کی تعریف میں آتی ہے مثلاً پانی ہوا وغیرہ اور طاقت اگرچہ متحرک ہے اور اُس کے اثرات بین ہیں۔ مگر اُس میں کوئی وزن نہیں ہوتا مثلاً حرارت یا بجلی وغیرہ میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔ طاقت مادّی اجسام میں رواں اور دواں رہتی ہے مگر اُن سے جُدا نہیں ہو سکتی جس طرح کہ عالم ناسوت میں ارواح بدون ابدان کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔ مادّہ اور طاقت موجودہ احاطۂ مخلوقات میں کبھی فنا نہیں ہوتے بلکہ محض اُن کی اشکال تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مادہ کی دو بنیادی اقسام کو مفرد اور مرکب کہتے ہیں۔ مفرد وہ شے ہے جس کا آخری ذرّہ وہی خاصیتیں رکھتا ہے جو اُس مفرد کے بڑے سے بڑے ذخیرہ میں پائی جاتی ہیں دو یا دو سے زیادہ مفردات مخلوط ہو کر بعض اوقات مرکب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کے آخری ذرّہ میں ہر جزوِ مفرد کا ذرّہ شامل ہوتا ہے۔ اگر اُس کے آخری ذرّہ میں کوئی انشقاق پیدا کر دیا جائے تو مفردات آزاد ہو جائینگے۔ سائنس جدید جزولایتجزیٰ کا عین الیقین رکھتی ہے اور تجربات نے اس حقیقت کو بالکل آشکارا کر دیا ہے۔ بعض فلاسفۂ قدیم جزولایتجزیٰ کے انکار میں یہ دلیل پیش کرتے

تھے کہ اگر اس کو دو متصلہ اجسام کے خطِ اتصال پر رکھ دیا جائے تو بہر حال اس کا ایک جز ایک جسم
پر اور دوسرا دوسرے پر واقع ہونا قیاس کر کے تجزیہ کا امکان لاحق ہو گیا مگر اوّل تو سائنس جدید کہتی
ہے کہ جزو لایتجزیٰ وہ آخری ذرہ ہے جس کو انسانی طاقتیں منقسم کرنے میں کامیاب نہیں ہیں معترضین
سابق کا خیالی تجزیہ اُن کے نزدیک خارج از بحث ہے اور دویم یہ کہ علم ہندسہ اس پر شاہد
ہے کہ کوئی ایسا خطِ اتصال پیدا کرنا غیر ممکن ہے جس میں قیاسی گنجائش نہ ہو تو جزو لایتجزیٰ اگر
اس گنجائش میں سما جائے تو کیا امر محال ہے۔ مادہ کی کیمیاوی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جزو لایتجزیٰ
کا تخیل ایک لازمی شے ہے۔ مادہ کی طبیعی کیفیات صرف تین ہو سکتی ہیں ثقیل، رقیق اور دخانی یا
گیس۔ عام اذہان میں مادہ کی ہر سہ اقسام بخوبی روشن ہیں مگر مادہ کے مختلف ترکیبی تغیرات میں
جو حصہ دخانی عناصر کا ہوتا ہے وہ عام اذہان سے اکثر مستور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یوں کہا جائے
کہ پانی تمام تر دخانی مفردات سے مل کر بنا ہے یا یہ کہ نیلے تھوتے میں بڑا جزو آکسیجن گیس کا ہے تو
عوام الناس کو اُڑ جانے والے لطیف عنصر کی یہ پائدار وابستگی لائق تعجب معلوم ہوتی ہے، مگر
سائنس کے طالبعلموں کے لیے یہ روزمرہ کی واردات ہے اور مسلمہ شے ہے۔ مفردات کے ترکیبی
اتصال جس کا نتیجہ مرکبات ہوتے ہیں، اور محض اختلاط کا فرق بھی قابل لحاظ ہے۔ یہ فرق اس
تعریف سے ظاہر ہوگا کہ جب کبھی ایک سے زائد مفردات اس طرح پر مخلوط ہوں کہ ان کو طبیعی یا
سرسری طریقوں سے جدا کیا جا سکے تو یہ کیفیت آمیزش کی سمجھی جائیگی اور اگر ان کا باہمی اتصال
زیادہ گہرا ہے یعنی بغیر کیمیاوی طریقہ استعمال کیے ہوئے اُن کو جدا کرنا ناممکن ہے تو یہ کیفیت
اتصال ترکیبی کی ہے جو ہر مرکب میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً اگر لوہے کو اور کوئلہ کو ایک جگہ سفوف
کر لیا جائے تو مقناطیس کے ذریعہ سے لوہے کے ذرات علیحدہ کیے جا سکتے ہیں یا پانی میں ڈالکر
لوہے کے ذرات پانی کی تہ سے اور کوئلہ کے ذرات تیرتے ہوئے خالص اخذ کیے جا سکتے

ہیں۔ یہ دونوں ذرائع طبیعی یا سرسری ہیں اس لیے سفوف محض آمیزش کی تعریف میں آئیگا۔ برخلاف اس کے اگر تانبے کے بُرادے کو گندھک کے ساتھ تیز آنچ پر پکا لیا جائے تو نیلا تھوتا حاصل ہوگا، جس میں ہر دو مفردات موجود ہیں۔ مگر اب ان مفردات کو صرف اس طرح پر جُدا کیا جا سکتا ہے کہ اوّل اُس کو تیزاب میں ڈالا جائے تاکہ تانبا بالآخر حل ہو جائے پھر تانبے کو تیزاب سے مناسب طریقوں سے علیحدہ کیا جائے۔ چونکہ یہ سب کیمیاوی تراکیب ہیں لہٰذا نیلے تھوتے میں تانبے اور گندھک کا اتصال ترکیبی سمجھا جائیگا اور نیلا تھوتا مرکب کی تعریف میں آئیگا۔ مرکب اشیا میں اُس کے مفردات کی خاصیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے اور مخلوط مفردات میں اُن کی خاصیتیں نمایاں رہتی ہیں۔

پانی کے فوائد اور جو انتظامات قدرت نے اُس کے سہل الوصول ہونے کے کیے ہیں اُن سے تو بچہ بچہ واقف ہے مگر ہوا کے مخفی عجائبات کو اکثر لوگ محسوس نہیں کر سکتے۔ ہوا کرۂ ارضی کے گرداگرد بطور ایک پانچ میل گہرے بادل کے دائم قائم ہے نسیم صبح، باد صرصر اور تُند آندھیاں سب اس طرح پر واقع ہوتی ہیں جیسے سمندر میں امواج برپا ہوتی ہیں کہ باوجود اس شورش کے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، جیساکہ اوپر مذکور ہے۔ ہوا مفرد نہیں ہے بلکہ دو مفردات کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اس میں آکسیجن گیس ۲۰ فیصدی اور نائٹروجن گیس ۸۰ فیصدی شریک ہے اور قدرت کا سب سے پہلا انعام یہ ہُوا کہ دونوں اجزا اتصال ترکیبی کے ساتھ منسلک نہیں کیے گئے تاکہ ہر دو اجزا اپنے جُداگانہ افعال وخواص سے حیات کے مختلف شعبوں میں نفع بخشتے رہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی صورت اتصال ترکیبی کی پیدا ہو جائے تو تمام نباتات اور حیوانات قلیل عرصہ میں فنا ہو جائینگے جس کی تفصیل آگے بیان کی جائیگی تعلیم حیرت یہ ہے کہ اس خدشہ کے امکانات قوی موجود ہیں۔ کیونکہ ہوا میں آئے دن قوی برقی اثرات

دوڑتے رہتے ہیں بلکہ منجمد برقی اثرات بھی جابجا اُس میں موجود رہتے ہیں اور برقی طاقت جس قدر
مرکبات کے اجزا، کی تفریق کے لیے موثر ہے اسی قدر مفردات کے اتصال ترکیبی کے لیے محرک
دمعین بھی ہے۔ نیز ترکیبی تغیرات میں کثیف دُخانی عناصر کے پیدا ہو جانے کا بھی امکان ہے
اور اگر ایسا ہو جائے تو انسانی بصارت تا حدِ نظر مکدر ہو کر رہجائیگی۔ مگر رب الفطرت کی ربوبیت
اس کو کب گوارا کر سکتی تھی نہ یہ ہوا نہ تا قیام قیامت ہوگا۔ ہوا کے ہر دو عناصر کی موجودہ آمیزش
ایک عظیم اہمیت کو لیے ہوئے ہے کیونکہ حیوانات اور نباتات کے لیے تنفس لازمۂ حیات ہے۔
اوّل الذکر کے لیے تنفس کے معنی یہ ہیں کہ اندرونی سانس پھیپڑوں میں ٹھہر جاتا ہے اور وہاں
آکسیجن گیس خون کی صفائی کر کے فضلات بیرونی سانس کے ذریعہ سے خارج کر دیتا ہے
نیز یہی گیس دورانِ خون میں بھی معاونت کرتا ہے۔ واضح ہو کہ جس طرح پرآلات تنفس آکسیجن کو ہوا
سے اخذ کرتے ہیں وہ ایک طبیعی فعل ہے اگر یہ عنصر کسی اتصال ترکیبی میں محو ہو جاتا تو آلات تنفس
اُس کو حاصل کرنے سے معذور رہتے اور پھر حیات کا امکان باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں
آکسیجن گیس ایک سریع الاثر شے ہے اور وہ اگرچہ خود آتش گیر نہیں ہے مگر کوئی آگ بغیر اُس کی موجودگی
کے پیدا نہیں ہو سکتی چنانچہ ایک فطری مشاہدہ ہے کہ جب آگ بھڑکانا مقصود ہوتا ہے تو انسان
اُس پر پھونک مارتا ہے یعنی آکسیجن کو زیادہ تعداد میں پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پھر دیکھیے
کہ شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں، مگر قدرت کا منشا یہ ہے کہ آکسیجن کی یہ تاثیر مقررہ دائرہ میں کام کرتی
رہے تاکہ مخلوق اُس سے متمتع ہو سکے اور اُس کی مضرت سے محفوظ رہے اس کے لیے تعدیل
کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہوا کا دوسرا بڑا عنصر نائٹروجن بطی الاثر ہے۔ نہ آتش گیر ہے نہ آتش خیز بلکہ
برودت کی طرف مائل ہے اور اُس کی تعداد ۸۰ فیصدی ہے۔ ان سب وجوہات سے وہ آکسیجن
کی صفتِ آتش خیزی کو حد سے نہیں بڑھنے دیتا اور بالکل ایسا سمجھیے کہ ایک سمندِ تیز پر ایک سنجیدہ

سار ہردم موجود ہے تخلیق کے ساتھ تسویہ کی شان کس انداز سے ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ اِنَّ فی ذٰلِکَ لَآیات۔

نائٹروجن کی عدل پروری کو تو آپ نے معلوم کر لیا مگر شاید یہ آپ نہ محسوس کر سکے ہونگے کہ جتنا وہ عادل ہے اتنا ہی سخاوت سے بھی لبریز ہے کیونکہ وہ ایک ایسا جوہر ہے جس سے تمام نباتات اور حیوانات سائنس کی اصطلاح میں اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اسی سبب سے قدرت نے اُس کو زیادہ مقدار میں پیدا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پیچ در پیچ قوالب اور اشکال میں ہو کر گزرتا ہے اور بالآخر بے کم و کاست اپنی جگہ پر لوٹ آتا ہے ؎

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نباتات اپنی غذا بیخ سے حاصل کرتے ہیں جو پانی میں حل شدہ مخصوص مرکبات کو جذب کر لیتی ہے۔ ان مرکبات کا جزو اعظم نائٹروجن ہے۔ اوّل یہ گیس آبِ باراں کے ساتھ یا پانی کے ابخرات کے ساتھ یعنی اوس وغیرہ میں حل ہو کر زمین پر نازل ہوتا ہے۔ اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ مخصوص ترکیبی اشکال کیونکر پیدا کی جائیں کیونکہ بدون اس کے نائٹروجن نباتات کی غذا نہیں بن سکتا۔ یدِ قدرت کا کفِ شیریں پھر ایسے مواقع پر ظاہر ہو جاتا ہے اور اُس نے سطحِ زمین پر باریک جراثیم جن کو بکٹیریا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے پیدا کر رکھے ہیں جن کے ننھے اجسام کے طبعی افعال صرف یہ ہیں کہ وہ حل شدہ نائٹروجن کو اپنی بدنی عروق سے مرکبات کی شکل میں تبدیل کرتے رہتے ہیں اور لطیف نوشادری غذا کا لقمہ بنا کر جڑوں پر رکھ دیتے ہیں، جہاں سے وہ بسرعت جذب ہو کر برگ و بار تک پہنچ جاتی ہے۔ بظاہر ہے کہ حیوانات اپنی غذا نباتات سے حاصل کرتے ہیں۔ مگر حیوانات کو نائٹروجن بہت زیادہ مرتب اور مکمل اشکال میں درکار ہوتا ہے۔ نباتات کی غذا اگر اُن کو دی جائے تو وہ حیوانات کی

جسمانی تربیت کرنے کے بجائے زہر کا کام دیگی۔ قدرت نے اس کی مشین نباتات کے طبعی افعال میں رکھی ہے جس طرح پر بکٹیریا اپنے جسمانی افعال کے ذریعے نباتات کی حیات کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح نباتات کی رگ وپے میں چاند اور سورج کی شعاعوں کے زیر اثر وہ انعامِ الٰہی تیار ہوتے ہیں جن پر الجوع الجوع کے نعرے بلند کر کے انسانوں کے غول جا پڑتے ہیں اور اپنے گھروں میں اُن کے تودے لگا کر نازاں و فرحاں نظر آتے ہیں۔ ان تراکیب میں ہر قدم پر وہ اہمیت درپیش ہوتی ہے کہ اگر اُن مرکبات کو خارجی طور پر تیار کیا جائے تو بڑے بڑے کارخانے درکار ہونگے اور پھر بھی نتیجہ ناقص رہیگا ؎

ابروباد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بہ کف آری و بہ غفلت نہ خوری

یہاں تک نائٹروجن کے نزول کی داستان ہے، اب اس کے عروج کا قصہ سُنیئے اور یہ سمجھیے کہ اتنا سفر کر کے وہ تھک جاتا ہے اور اپنے مسکن کی طرف تیزی سے مائل ہو کر باز گشت کا خواہاں ہوتا ہے۔ قدرت بھی اس کو حق بجانب سمجھتی ہے کیونکہ اپنے مستقر پر جو کارپردازی اُس کے سپرد کی گئی ہے وہ بھی غریب الوطنی کی زیادہ اجازت نہیں دیتی۔ نائٹروجن کا بہت کچھ حصہ حیوانات کے بول و براز میں برآمد ہوتا رہتا ہے یا بعد وفات کے اُن کے اجسام کے اجزاءِ منتشر کی شکل میں رہ جاتا ہے، اسی طرح نباتات کچھ حیوانات کو دیدیتے ہیں اور باقی ماندہ بھی بالآخر خاک میں ملا ہوا رہ جاتا ہے مگر ابھی وہ آزاد نہیں ہوتا بلکہ آخری مرحلہ کے لیے قدرت کاملہ نے ترتیبی جراثیم کے مقابلہ میں تخریبی جراثیم پیدا کیے ہیں جن کے ابدان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ مختلف نمکیات کو توڑ پھوڑ کر نائٹروجن خالص برآمد کر دیتے ہیں جو ہوا میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ جراثیم وہ کام انجام دیتے ہیں جو اتنے وسیع پیمانہ پر انسانی طاقتوں سے باہر بلکہ بعید از قیاس ہے۔

انسان کی تحقیقی نظر مفردات اور مرکبات کی ترتیب و تشکیل کے قوانین تک ہی محدود نہیں ہو گئی ہے بلکہ جزو لایتجزیٰ کی اندرونی ماہیت سے بھی کئی درجہ میں واقف ہوچکی ہے۔ مادہ کے اندر سب سے زیادہ کارفرما طاقت بجلی ہے جس کی دو قسمیں مثبت اور منفی پائی جاتی ہیں یا جن کو بمصداق ارشاد ربانی وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ مذکر و مؤنث بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں اقسام ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ اور ایک ہی قسم کے برقی ذرات ایک دوسرے کو رد کر دیتے ہیں تحقیقات جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ مفرد کے خواص کا حقیقی تعلق برقی ذرات سے ہے جو جزو لایتجزیٰ میں خاص ترتیب کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔ جزو لایتجزیٰ کی اندرونی ہیئت اس طرح پر بیان کی گئی ہے کہ اس کے وسط میں ایک نقطہ ہے جس کے چاروں طرف کچھ فاصلہ پر مثبت برقی ذرات مقررہ دائرہ پر گردش کرتے رہتے ہیں اور اس سے زیادہ فاصلہ پر یعنی محیط پر منفی ذرات اسی طرح سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اصول کشش کے ماتحت ہر دائرہ کے ذرات کے درمیان فصل کی طاقتیں اور دونوں دائروں کے ذرات کے باہم وصل کی طاقتیں خطوطِ مستقیم پر کام کرنے لگتی ہیں جو اس طرح متوازن ہیں کہ برقی ذرات اپنی جگہ پر قائم ہیں اور مقررہ دائرۂ گردش سے جدا نہیں ہوسکتے۔ غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان عجیب و غریب ذرات کا نظام فلکی اجسام کی ترتیب و گردش سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے کیونکہ وہ بھی کشش اجسام کے اصولوں کے ماتحت اپنی جگہ پر قائم رہ کر گردش کرتے رہتے ہیں۔ ذی شعور انسانوں کے لیے یہ معلومات نہایت درجہ سبق آموز ہیں۔ کیونکہ صاف طور پر نظام فلکی اور جزو لایتجزیٰ میں ایک ہی فطرت ظہور پذیر ہے ایک ہی صانع کی قدرت ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ برقی ذرات کی گردش اور ترتیب پر مفرد کے جملہ خواص کا دارومدار ہے تو کیا عجب ہے کہ عرش عظیم کے تابع ستاروں کی رفتار و سکون پر حوادث عالم کو کوئی گہری مناسبت ہو ؎ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار!

خواطر و سوانح

شرافت کہاں ہے؟

از قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

سید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی مصر کے دورِ جدید کے ادبا میں ایک صاحبِ طرز ادیب ہوئے ہیں آپ ۱۸۷۶ء میں جنوبی مصر کے شہر منفلوط کے خانوادۂ قضاۃ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامع ازہر میں تعلیم کی تکمیل کی اور اس کے بعد، دس سال تک مشرق کے مشہور فاضل علامہ عبدہ المصری کے خرمن علم و ادب سے خوشہ چینی کی ۱۹۰۸ء میں آپ نے "المؤید" میں مضمون لکھنے شروع کیے اور وہ اس قدر پسند کیے گئے کہ لوگ ایک ہفتہ تک بڑی بے چینی کے ساتھ آپ کے مضامین کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اپنے نامور اُستاذ کے انتقال کے بعد آپ اُن کی سیاسی و ادبی مسند کے وارث قرار پائے۔

منفلوطی اسلامی و مشرقی رجحانات کے حامل ہیں۔ مغرب کی تہذیب کے ہاتھوں مشرق کے اخلاق و تمدن کو لٹتے دیکھ کر وہ بےحد متاثر ہوئے ہیں، اور اُنھوں نے اپنے مضامین اور افسانوں میں اپنے تاثرات کو بےحد پُراثر اور درد انگیز پیرائے میں پیش کیا ہے۔

ادب کے متعلق مقدمہ "النظرات" میں اپنے عقیدہ کی تشریح اُنھوں نے حسبِ ذیل الفاظ میں کی ہے:-

"میرے نزدیک بہترین ادیب اور بہترین شاعر وہ ہے جو اپنے قلبی احساسات اور مطالعہ

فطرت کے تاثرات کو بے کم وکاست پیش کردے۔ اور اس کمال کے ساتھ کہ پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ گویا ان کیفیات کی تصویر کھینچ دی گئی ہے یا انہیں مجسم کرکے ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے"!

منفلوطی کے مضامین اور افسانوں کا ایک ایک لفظ اس عقیدہ کی تشریح ہے۔ منفلوطی کا طرز بیان کہیں کہیں اس قدر دلدوز ہوجاتا ہے کہ پڑھنے والے کو آنسو ضبط کرنے مشکل ہوجاتے ہیں

منفلوطی کی مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے اخلاقی واصلاحی افسانوں کا مجموعۂ "العبرات" اور مضامین کا مجموعۂ "النظرات" بہت مشہور ہیں۔ (سجاد میرٹھی)

میں نے کسی کہانی میں پڑھا تھا کہ ایک نوجوان نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک خیالی محبوبہ کی محبت میں جس کی جھلک بھی اس نے کبھی نہ دیکھی تھی، بسر کردیا۔

اس نے دنیا کے مختلف حسینوں کے خدوخال کی رنگینیاں لے کر اپنے نگارخانہ دماغ میں ایک مہ جبینی کی تصویر کھینچی، پھر اپنے تصور کی مافوق العادت طاقت سے اسے مجسم کیا اور اس پر ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ وہ برسوں اس مجسمہ خیالی کے پیکر حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہا، اس نے وادی وصحرا اور کوہ وبیابان کی خاک چھان ڈالی، اور آخرکار ایک دن اسے پالیا۔

میں اس کہانی کو جھوٹا نہیں بتا سکتا، کیونکہ میری سرگزشت بھی اس نوجوان کی داستان سے ملتی جلتی ہے، فرق ہے تو یہ کہ اس نے اپنی گم شدہ محبوبہ کو پالیا اور میں نہ پا سکا۔ آہ میری خیالی محبوبہ کا نام شرافت ہے!

میں نے شرافت کو تاجروں کی دکانوں میں تلاش کیا۔ میں نے دیکھا کہ تاجر چور ہے، سوداگر کے بھیس میں۔ ایک اشرفی کی چیز دو اشرفی کو بیچ کر ایک اشرفی چراتا ہے۔ اگر مجھے عدالت کے اختیارات

دو پیسے جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ میں روپیہ کے چوروں کو سزا دوں اور اشرفی کے چوروں کو چھوڑ دوں۔ حالانکہ دونوں آنکھ بچا کر میرا مال ہضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں تاجروں کو نفع لینے سے نہیں روکتا، اُس نے مال تجارت کو حاصل کرنے میں جو کوشش کی، اور اُس کی حفاظت میں جو تکلیف اٹھائی، اُس کا مناسب معاوضہ وہ لے سکتا ہے بلکہ اس سے زیادہ میں جائز نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک حلال و حرام میں یہی فرق ہے کہ وہ کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے اور یہ جھوٹ اور دھوکہ کا۔

میں نے عدالتوں میں شرافت کو ڈھونڈا تو مجھے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ عادل حاکم وہ ہے جو مقدمہ کی مسل پر ملکی قانون کی تطبیق کی پوری کوشش کرتا ہے اور اس خوف سے کرتا ہے کہ کہیں حکومت اس سے یہ بلند کرسی جو اُسے عطا کی گئی ہے نہ چھین لے۔ رہا مظلوم کو انصاف کرنا اور ظالم کو سزا دینا حقداروں کو اُن کے حق دلانا اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا، سو یہ سب فروعات ہیں جن کی اُسے پروا نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ حسنِ اتفاق کے کسی دور لمبے پر انصاف اور قانون کا ملاپ ہو جائے لیکن اگر ان کی گزرگاہیں مختلف ہیں تو حاکم اپنے یقین کے خلاف حکم دیتا ہے، اور اپنی معلومات کے برعکس فیصلہ سُناتا ہے بے قصور کو سزا دیتا ہے اور قصوروار کو بری کرتا ہے۔

اگر کوئی اس سے اس ظلم کی وجہ پوچھے تو وہ بے تکلف قانونی مجبوری کا عذر پیش کر دیگا گویا وہ چاہتا ہے کہ اپنی عقل کو قانون کا پرستار بنا دے حالانکہ عقل خود قانون کی خالق ہے۔

میں نے شرافت کو امیروں کے محلوں میں ڈھونڈا۔ میں نے دیکھا کہ امیر یا کنجوس ہے یا

ح کنجوس امیر کی حالت یہ ہے کہ اگر وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھی پڑوسی ہو،
رات کی خاموشیوں میں ان کے دونوں لالوں کے رونے کی آواز اُس کے کانوں
، تو وہ اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کریگا کیونکہ اُسے یقین ہے
نیں اُس کے سنگین دل کو پار نہیں کرسکتیں اور اس کے حیوانی جسم میں انسانیت کی روح
سکتی۔ رہا فضول خرچ امیر سو اس کی دولت ساقیِ گل اندام، اور بادۂ گلفام کی رنگینیوں کے
، ہو چکی ہے۔
پھر بتایئے امیروں کے محلہ میں شرافت کس کے وسیلے سے بار پائے؟

میں نے شرافت کی سیاسی جماعتوں میں جستجو کی تو مجھے معلوم ہوا کہ عہد، میثاق اور قاعدہ و
لفظ ہیں جن کے معنی ہیں جھوٹ اور فریب۔
میں نے محسوس کیا کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے۔ انسانوں کے گروہوں میں
منے اپنے بھائیوں کے لیے، اسلحہ خانوں میں میگزینوں میں، قلعوں میں، جہازوں کی
ور طیاروں کے سینوں میں طرح طرح کے موت اور عذاب کے سامان جمع کر رکھے ہیں
کی سرحد پر، ایک بالشت زمین پر اختلاف رونما ہوا اور انسانوں نے درندوں کی کھال
روں کے ناخن بنائے، نیزوں کے دانت لگائے اور اپنے بھائیوں کا خون پینے کے
ہیں گتھم گتھا ہو گئے۔
لطف یہ ہے کہ اگر تم ان دو سپاہیوں سے جو میدان جنگ میں دست و گریباں ہیں
دونوں کیوں لڑ رہے ہو؟ بنائے مخاصمت کیا ہے؟ کونسی دشمنی ہے جس کی آگ تمہارے
یں دہک رہی ہے؟ اور یہ دشمنی پیدا کب سے ہوئی؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے تم دونوں

تو ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں، تمہاری تو پہلی ملاقات ہی میدانِ جنگ میں ہوئی ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان بیچاروں کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ یہ اپنے بال بچوں کو تنہا چھوڑ کر صرف اس لیے گھر سے نکلے ہیں کہ اپنے سپہ سالار کے سینہ پر ایک تمغہ آویزاں کردیں۔

میں نے اسے علمار و مشائخ کے حلقوں میں تلاش کیا تو دیکھا کہ (خدا کے چند نیک بندوں کو چھوڑ کر) ان میں سے اکثر جاہلوں کی بستیوں میں عقل کی تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے بھولے بھالے انسانوں کے دماغوں میں سوراخ کرکے اُن کے اخلاق کو برباد اور اُن کے احساسات کو پامال کر رکھا ہے تاکہ وہ ان کے مال و متاع پر آزادانہ تصرف کرسکیں۔

غرض میں نے شرافت کو ہر اس جگہ ڈھونڈا جہاں اس کے ملنے کا گمان ہوسکتا تھا، مگر افسوس کہ میں اسے کہیں نہ پاسکا۔ کیا اب میں اسے شراب خانوں، چوروں کے اڈوں میں اور جیل کی کوٹھریوں میں تلاش کروں؟

اکثر لوگ کہیں گے کہ مضمون نگار نے اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے اور فیصلہ کرنے میں سختی سے کام لیا ہے۔ آج بھی بہت سے سینے شرافت کا دفینہ ہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ میں شرافت کے وجود کا منکر نہیں مگر اس کے محل وجود سے ناواقف ضرور ہوں۔ لوگوں کی ریاکاریوں نے میری آنکھوں کے سامنے کالی گھٹاؤں کا ایسا پردہ تان دیا ہے کہ مجھے کوئی ستارۂ اُمید نظر نہیں آتا۔

یوں تو ہر شخص شرافت کا مدعی ہے، سب نے شرافت کے لبس چڑھا رکھے ہیں اور شرافت کے ڈھونگ رچا رکھے ہیں کہ اچھے اچھے فہیم و فرزانہ انسان دھوکہ کھا جاتے ہیں، مگر کوئی ہے جو اس شب تاریک میں مجھے منزلِ مقصود تک پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

اگر دنیا کے عیش و آرام اور نیک بختی و خوش نصیبی کی کہانیاں جنہیں لوگ بیان کرتے ہیں سچی ہیں، تو میں تو اس متاع میں سے صرف اس قدر کا اُمیدوار ہوں کہ اپنی نامراد زندگی میں کسی دن کسی ایسے دوست کو پالوں جو مجھ سے خلوص کے ساتھ ملے اور میں اُس کے خلوص کا جواب خلوص سے دوں۔ وہ میری طرف سے اسی تحفہ کو کافی سمجھے، اس کی نگاہیں "اغراض" کے حلقوں کی اسیر نہ ہوں۔ اس کے جسم میں شریف روح ہو، اس کے پہلو میں شریف دل ہو، بغض و حسد کروہ نا واقف ہو اور ریا و فریب نا آشنا، اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو اور قلب و زباں ہمنوا، دروغ گوئی فحش کلامی، چغلخوری اور آبرو ریزی سے اُس کو سروکار نہ ہو۔ اسکی محبت شریفانہ ہو، شرافت سے اُسے محبت ہو اور دنائت سے نفرت میری خوش نصیبی جسکی تمنا میرے دل میں ہے صرف اسی پر منحصر ہے۔

کبھی کبھی میں چمنستانوں میں جا نکلتا ہوں، میں دیکھتا ہوں کہ پرند چہچہا رہے ہیں، درخت لہلہا رہے ہیں اور ان کے بیچ میں پانی کی نہریں مست ناگوں کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ نسیم سحری کی نازک انگلیاں، درختوں کے پتوں کو اس طرح بکھیر رہی ہیں جس طرح محبت عاشقوں کے دل کو پراگندہ کرتی ہے، میں بلبلوں کی نغمہ خوانی اور نہروں کی روانی میں وہ آتشیں نغمے سُنتا ہوں جنہیں سُنانے سے چنگ و رباب قاصر ہیں۔ مگر مجھے کوئی منظر اور کوئی نغمہ نہیں بھاتا، کیونکہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں بھی نہیں پاتا۔

دنائت کی صورت سے مجھے نفرت ہے اور اس کا ذکر مجھے ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ کاش میری پہلو کو چیر کر دل نکال لیا جائے تاکہ میں زندگی کی ناکامی و محرومی اور خوشی و غم کا احساس نہ کرسکوں۔ اگر میرے یہ چھوٹے چھوٹے بچے نہ ہوتے جنکی زندگی کی خوشیاں میرے دم سے قائم ہیں، تو میں اس شور و شر کی دنیا سے مُنہ موڑ کر شاعر کی اس بستی میں چلا جاتا جہاں "ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو!

(مصطفیٰ لطفی المنفلوطی)

علمی روزنامچہ

از مولانا حکیم سید ابوالنظر رضوی

اسلام اور نظریۂ تمدن

اسلام ایک فطری مذہب ہے اور اُس کی تعلیم انسان کی انفرادی، اجتماعی اور نفسیاتی زندگی کے ہر رازسے آشنا، یہ چیز مجھے بارہا محسوس ہوئی اور یہ دیکھ دیکھ کر میں اکثر حیران رہ گیا کہ ایک اُمّی انسان کی زبان سے جو کچھ بھی نکلا وہ کہاں تک فطرت انسانی کے ہر پہلو سے آگاہ ہونے کا ثبوت تھا۔ انسان نے جب سے اس کائنات رنگ و بو میں قدم رکھا ہے تاریخ کا ہر ورق اور آثار قدیمہ کا ہر نقش آپ کو بتائیگا کہ اُس نے زندگی کو تابناک اور پاکیزہ بنانے کے لیے ہر طلوعِ صبح پر ایک جدید نظریہ، جدید لائحہ عمل اور جدید قانونِ حیات کا اختراع کیا۔ مگر آفتاب غروب بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُس نے اپنی فکر و تجربہ کے نتائج کو شکست کرتے ہوئے دوسرے راستہ کا انتخاب کرلیا، جمہوریت، شہنشاہیت، اشتراکیت، اشتمالیت نہ معلوم کون کون سی "جاہلیاتی اصنام" اُس کے دماغ نے ہر تمدن کے آغاز پر بنائے مگر کوئی بھی مستقل قانون کے ذریعہ فطرت کی تشنگی نہ بجھا سکا۔ لیکن ایک اسلام کے نظریات ہیں کہ آج تک شکست ہونے میں ہی نہیں آتے نہ صرف یہ بلکہ دنیا جس حد تک ذہنی، سیاسی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی کرتی جارہی ہے۔ اُس کے نظریات پائندہ تر ہوتے جارہے ہیں۔ کیونکہ اُس کا ہر اصول فطرتِ انسانی کے سانچہ میں ڈھالا گیا تھا جو کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا۔ ایک انسان اپنے تمدنی دور میں جس قدر تجربات حاصل کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی

کے رموز و نکات کا صرف ایک حصہ ہوتے ہیں۔ کائنات انسانی کا ہر پہلو اس کی نگاہ میں جذب نہیں ہو سکتا اور اسی لیے اُس میں کمزوریاں باقی رہ جاتی ہیں۔

ایک متبنّیٰ بنانے کے معاملہ ہی کو لے لیجیے۔ اہل عرب نے بھی اسے جائز رکھا تھا اور ہندوستان کا ویدک مذہب بھی اجازت دیتا ہے کیونکہ غالباً ان دونوں قوموں کا نظریہ وہ ہی تھا جو "ایام جاہلیت" میں میرا نظریہ بھی رہ چکا ہے۔ میں نے روزنامچہ کے پچھلے صفحات میں کسی جگہ لکھا تھا اور ایک معنی میں بالکل درست لکھا تھا کہ "حقِ وراثت کا راز محبت میں مضمر ہے نطفہ کے زائیدہ روابط میں نہیں" اگر ہمارے اعزا کو ہم سے محبت نہیں تو ہمارے اوپر اُن کا کوئی حق بھی نہیں ہو سکتا ہم اُس شخص کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اپنا سرمایہ کیوں نہ محفوظ کر دیں جس نے ہمارے احساسات کے زیر و بم پر اپنی زندگی کو رقص کرنے کی فرصت دی ہو۔ دنیا میں ایک محبت ہی ایسی چیز ہے جو حقوق کی بنیاد ہو سکتی ہے نہ کہ نطفہ۔ محض نطفہ کے چند قطرات اتنی جاذبیت نہیں رکھتے کہ وہ زندگی کی تمام تلخیوں کو شیرینی میں تبدیل کر سکیں۔ محبت اور نطفہ کا اخلاقی توازن ہرگز مساوی نہیں ہو سکتا۔ کیا نطفہ کی بیگانگی پر محبت کی یگانگت کو ٹھکرا دینے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ لہذا جب یہ نظریہ تسلیم کر لیا گیا تو پھر متبنّیٰ بنانے اور اپنا سرمایہ کسی ایک نوجوان کو سپرد کر دینے اور نطفہ کے تمام حقوق منتقل کر دینے میں کیا حرج ہو سکتا ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ میں بعض مسامحات ہیں جن تک نہ میری نگاہ پہنچ سکی نہ اُن قوموں اور مذاہب کی جنہوں نے اس کی اجازت دی۔ میری غلط فہمی کا باعث تو یہ تھا کہ میرے ماحول میں کوئی ایسا رشتہ دار نہ تھا جس کو فطری طور پر مجھ سے قریبی تعلق ہوتا۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ماں باپ رخصت ہو گئے۔ بہن بھائی پیشتر سے ہی کوئی نہ تھا یعنی میں اپنے ماحول میں تنہا تھا۔

اور بالکل تنہا۔ میرے گرد پیش جتنے اعزا تھے وہ سب بعید تعلق رکھنے والے اس لیے ان کو قدرتاً مجھ سے وہ تعلق اور محبت نہ ہو سکتی تھی جو میرے جذبات کی تسکین کا باعث ہو سکتی وہ نہ میری تکلیف کا احساس کر سکتے تھے نہ میری مسرت سے اُن کے جذبات میں تازگی پیدا ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں ایک گم کردہ راہ مسافر کی طرح فضا کی تاریکیوں میں روشنی کی ایک ایک کرن کو ترس رہا تھا اور ستاروں کی ایک ایک جھلملاہٹ کے لیے بے چین اور ایسا کرنے پر مجبور بھی تھا۔ ایک پیاسا ہرن جس کے چاروں طرف دور دور تک پانی کا قطرہ نہ ہو جس طرح سراب کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں ایسے ہی میں بھی فطری محبت کے ذوق سے ناواقف ہونے کی بنا پر اکتسابی محبت کو ہی سب کچھ سمجھ رہا، اور نظریات کا اختراع کر رہا تھا۔ میں محبت کا پیاسا تھا اور وہ کہیں نہ ملتی تھی اس لیے میری نگاہ جب کبھی کسی "سرابِ محبت" پر پڑی اُس ہی طرف کو دوڑا اور جہاں محبت کے طور کا جلوہ نظر آیا وہیں پر سجدہ میں گر پڑا۔ مگر تجربات اور پیہم تجربات نے بتا دیا، سکھا دیا اور یقین دلا دیا کہ وہ محبت جو کوشش اور صدہا قربانیوں کے بعد انسان حاصل کرتا ہے اُس محبت سے کہیں فروتر ہے، جسے فطری محبت کہا جاتا ہے۔ آپ کسی دوست کے ساتھ کتنی ہی مہربانیاں کیوں نہ کیجیے لیکن آپ محبت کے اُن نازک ترین احساسات کو ہمیشہ کے لیے مستقل طور پر ہرگز نہیں خرید سکتے جو فطری محبت بغیر کسی قیمت کے ادا کیے ہوئے حاصل کر لیتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دوست آپ کی ایثار پیشگی اور احسانات سے اثر پذیر ہو کر اپنے بیمار ماں باپ اور مجبور بہن بھائی کی امداد کرنے کی بہ نسبت آپ کی طرف جھک جائے۔ لیکن اس سے کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں آپ سے زیادہ کسی دوسرے کی خدمت کا جذبۂ بے تابانہ کشمکش میں مبتلا نہیں ہے۔

فطری محبت ہمیشہ فطری محبت ہی رہے گی خواہ ہزار تلخیاں ہی کیوں نہ حائل ہو جائیں اور اکتسابی محبت اکتسابی ہی رہے گی چاہے ہزار احسانات کسی کے اخلاقی جذبہ کو بیدار کر رہے ہوں۔ اگر آپ پر اور آپ کے کسی دوست کے فطری محبت کرنے والے اعزا پر وقت آپڑے تو آپ کا دوست یقیناً اپنے فطری محبت رکھنے والے اعزا کی زیادہ فکر محسوس کرے گا اور آپ کی فکر اس کو اتنی محسوس نہیں ہو سکتی۔

بعض اوقات جبکہ احسانات کی یاد تازہ ہو آپ میرے قول کے خلاف بھی عمل پائیں گے مگر وہ انسان کے تلون پذیر جذبات کا ایک ہنگامہ ہوگا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں حالانکہ عام طور پر دنیا اس ہنگامی جذبہ کو مستقل سمجھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی اور یہ محسوس کرنے لگتی ہے کہ اصل محبت اکتسابی محبت ہے۔ فطری محبت نہیں۔ لیکن زندگی کے مختلف انقلابات سے گذرنے کے بعد یقیناً میرے ہی نظریہ کی تصدیق کرنا پڑے گی۔ آپ خود بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ فطری تعلق کسی حال میں قطع نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ رگ و ریشہ میں جذب ہے۔ لیکن ایک دوست کی اخلاقی محبت تخیل کا کرشمہ ہے اور بس۔ ابھی کسی بات پر کشیدگی اور عدم احساس کی شکایت پیدا ہو جائے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے؛ عمر بھر کے دوستانہ تعلقات ایک سانس میں ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے کیونکہ دوستانہ احساس آپ کا خود پیدا کردہ ہے۔ آپ اس کے خدا ہیں؛ اور خدا جب چاہے اپنی مخلوق کو زندہ اور مردہ کر سکتا ہے۔ لیکن فطری محبت کا خدا دوسرا ہے۔ لہذا آپ اس کا نہ ایک ذرہ کم کر سکتے ہیں نہ زیادہ۔ ایسی حالت میں غور کیجئے کہ اگر کسی کو متبنیٰ بنا لیا گیا تو کیا وہ آپ کے ناموس اور آپ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو اس خوش اسلوبی سے ادا کر سکے گا جو ایک حقیقی بیٹا کر سکتا تھا۔ آپ کا خود ساختہ بیٹا جانتا ہے کہ میرا باپ دوسرا ہے، میری ماں، میرے بہن، بھائی دوسرے ہیں اس شخص نے بعض مصالح کی بنا پر مجھے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ پھر آپ

اس سے کیونکر امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ یہ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے اصل بیٹے کی بجائے کام کر سکے گا۔ کیا اس کو اپنے اصلی ماں باپ سے تعلق نہیں رہے گا اور کیا آپ کے قریبی رشتہ داروں سے اس کو وہی مناسبت ہو سکتی ہے جو آپ کو تھی ناممکن اور قطعاً ناممکن۔ جس نظام کو آپ قائم رکھنے کے لئے زبردستی بیٹا بنانے پر تُلے ہوئے تھے وہ ہرگز اس غلط راہ روی سے قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ بیٹا ان ہی ماں باپ کا رہے گا جن کا وہ دراصل ہے۔ میں یہاں پہنچ کر اس رواج کی ستائش کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے اصلی ماں باپ سے تمام مادی تعلقات منقطع کرانے کے لئے حقیقی ماں باپ کے حق وراثت سے بھی اسکو محروم کر دیا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلق رکھنے پر مجبور ہو جائے۔ مگر آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ فطری احساسات کو جبری قوانین سے پامال کرنے کی کوششوں کا نتیجہ کبھی بہتر نہیں نکل سکتا اور خصوصاً ایک ابدی اور ہمہ گیر قانون کے لئے تو یہ طرز عمل مناسب خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے؟ جب کہ کسی کو متبنیٰ بنانے کے بعد آپ کو شادی کرنے کا خیال پیدا ہو جائے۔ شادی کے نتیجہ میں ایک بچہ بھی ہو جائے آپ دونوں کو برابر رکھنے کی کوشش کریں گے اگر بفرض محال آپ اس کوشش میں بہ صد مشکل کامیاب بھی ہو گئے تو کیا ان دونوں بیٹوں کے تعلقات خوشگوار رہ سکتے ہیں۔ کیا آپ کے اصلی بیٹے کو اندرونی طور پر اس احساس سے اذیت نہ ہو گی کہ یہ دوسرا بیٹا بلا وجہ میرے حقوق میں شریک ہو گیا میرے حقوق کو غصب کر رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہر چیز کا مالک میں تنہا ہی ہوتا کیا یہ اذیت مناقشات کا باعث نہ ہو گی اور کیا ان خانہ برانداز مناقشات کا باعث آپ کو یقین نہیں کیا جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ متبنیٰ بنانے کی رسم کو مٹا کر اسلام نے اس بات کا بہترین ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ وہ ایک فطری مذہب ہے اور زندگی کا کوئی پہلو اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں

ہو سکتا۔

انسان جن ذہنی اور نفسی محرکات کے تحت اولاد کی خواہش کرتا ہے اُن میں سے ایک اپنی شخصیت کو بقائے دوام دے سکنے کی آرزو بھی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ میری کوئی ایسی یادگار زندہ رہے جو میرے نام، میری شخصیت اور میرے خصائص کے امتیازات کو زندہ رکھ سکے اور یہ آرزو اولاد کے سوا متبنّیٰ سے کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی۔ متبنّیٰ بنا کر یادگار قائم کرنے والا اپنی جگہ پر یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ جو چیز بقائے دوام کی آرزو کو تسکین دینے کے لئے چھوڑے جا رہا ہے ہرگز اُس کی شخصیت کی صحیح نمائندگی نہیں کر سکتی۔ نہ میری شخصیت کا اُس کے رگ و ریشہ میں کوئی جزء ہے نہ وہ میری ذہنی، اخلاقی اور جسمانی خصائص و امتیازات کا کوئی نمونہ۔ نہ میری ذہنی اور نفسیاتی ساخت کے جواہر نمایاں ہیں، نہ ہیکلِ جسمانی کی مخصوص اقلیدسی اشکال۔ مگر بایں ہمہ اپنے ضمیر اور وجدان کو دھوکہ دے کر سراب تخیّل سے ہی آرزو کی تشنگی بجھانے کی کوشش کا یہ غیر طبعی میلان و انجذاب کیا وجہ تسکین اور شرمندۂ معنی قرار دیا جا سکتا ہے؟ نہیں پھر آخر ایسی بے معنی حرکت کیوں کی جائے جو مغالطہ آفرینی کے سوا مرکز امید ہو سکنے کی استعداد ہی نہ رکھتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ انسان اپنی زندگی کو خواب کی شیرینیوں میں گذارنے کے لئے ایسے سیکڑوں مغالطات اپنے نفس و ذہن کو دیتا ہے ذہنی اور نفسیاتی زندگی میں بھی اور مجلسی یا معاشرتی زندگی میں بھی۔ بنا بر ایں اس مغالطۂ ذہنی کی حیثیت بھی جس کو متبنّیٰ بنانے کی آرزو کہا جاتا ہے دوسرے مغالطات سے پست اور مختلف نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اس کو ایسے حقائق میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا جس کی اجازت ایک ٹھوس اور حقیقی مذہب دے سکتا ہو۔ اسلام خدا کا مذہب ہے اور خدا نہ کسی کو فریب میں مبتلا کرتا ہے نہ فریب کھانے کی اجازت دے سکتا ہے اس نے عقل و شعور کی قوتیں اسلئے

ہی ودیعت فرمائی ہیں کہ ان سے حقائق شناسی کا کام لیا جائے۔ اس نکتہ کو یاد رکھئے کہ انسان ایسے مغالطات سے اُس ہی وقت لذت اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے جبکہ اُس کی اخلاقیت پاکیزہ، مستقل اور تابندہ اور اُس کے شعوری رجحانات، روحانی سکون، ابدی ایقان اور شرحِ صدر کی بنیادوں پر اُستوار نہ ہوں جو شخص کہ ارتقارِ روحانیت کی بلندیوں سے ہر حقیقت اور مغالطہ کو دیکھ رہا محسوس کر رہا ہو خواہ مخواہ آنکھیں بند کرنے کی کوشش نہیں کرسکتا۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کیا چیز ہے؟ اُس کی آرزوؤں کی کیا وقعت ہے؟ زندگی اور اُس کے بقائے ودوام کے امکانات کہاں تک اور کون سے اسباب وعلل سے وابستہ ہیں؟ ایسی حالت میں دنیا اور اُس کے مغالطات کیونکر غلط آرزوؤں کو اُس کے دل میں پیدا ہونے دے سکتے ہیں۔ مغالطہ اُس ہی کو شیرینی مہیا کرسکتا ہے جو مغالطہ میں حقیقت کی ایک جھلک محسوس کرنے کی کمزوری رکھتا ہو اور اسلام کا منشا نامکمل احساسات رکھنے والے انسانوں کے گروہ میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ وہ وجدان وشعور کی ہر قوت کو بیدار اور مکمل کرنے کا داعی ہے وہ ہرگز عدمِ تکمیل کی حوصلہ افزائی نہیں کرسکتا۔ تمنّی بنانے کا تخیل غیر مکمل ذہنی اور وجدانی قوتوں کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اسلام ہرگز ایسے نظریہ کی تائید نہیں کرسکتا تھا۔

لطائفِ ادبیّہ

حمدِ محمود

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرّہٗ جہاں ایک کوہِ استقامت، مجاہدِ حریت و آزادی، عارف باللہ، ولی کامل اور اپنے عہد کے عظیم و جلیل مفسر و محدث تھے شعر و سخن کا بھی لطیف مذاق رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کا مجموعۂ اشعار و قصائد "کلیات شیخ الہند" کے نام سے عرصہ ہوا دیوبند سے شائع ہو چکا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا قطعۂ ذیل جو حمد میں ہے آپ کی کلیات میں موجود نہیں ہے اور غالباً کسی اور جگہ بھی شائع نہیں ہوا۔ ہم جناب قاری محمد یوسف صاحب ناظم جمعیۃ القراء دہلی کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے اپنی بیاضِ خاص سے یہ قطعہ نقل کر کے ہم کو عنایت فرمایا، اور اب ہم اس کو "برہان" میں تبرک کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔

سب مراتب میں تیری ذات مقدس سے وری — کس زباں سے کہوں ہر مرتبہ اعلیٰ تیرا

نورِ خورشید چمکتا ہے ہر ایک ذرہ میں — چشم بینا ہو تو ہر شے میں ہے جلوہ تیرا

بیم دوزخ ہے اُسے اور نہ شوقِ جنت — جس کو مطلوب ہے ایک دردکا ذرّہ تیرا

تیرے دیوانوں کو کیا قیدِ علائق سے گزند — دونوں عالم سے بھی آزاد ہے بردا تیرا

ہم سیہ بخت اگر ایسے ہی ناکام رہے
کیسے جانینگے کہ کیا فضل ہے ربّا تیرا

از جناب مُلّا رموزی

گلستاں تک نظر آئیگا ویرانہ ویرانہ
کبھی خود دیکھ لیجیگا جو صحرا کا پریخانہ

فضائے وادیٔ گلریز و موجِ چشمۂ روشن
جمالِ انجم و مہتاب و حسنِ جانِ جانانہ

یہیں بکھری ہوئی زلفوں کی عنبر بیزیاں ہیں
یہیں ہر جانِ موسیقی یہیں ہر روحِ خمخانہ

یہیں تو سینۂ نوخیز میں مستی مچلتی ہے
یہیں فرزانہ عاشق نظر ہوتا ہے دیوانہ

یہیں طوفان اُٹھتے ہیں جوانی کی اُمنگوں میں
یہیں کچھ مُسکراتے ہیں حجاباتِ عروسانہ

یہیں دوشیزگی دلہن بنی جاتی ہے شرما کر
یہیں عاشق ہوا جاتا ہے اب پروانہ پروانہ

یہیں ہیں وادیٔ گلرنگ کی شہزادیاں شاداب
یہیں ہے غمزۂ ترکانہ و نازِ ملوکانہ

یہیں حسنِ شبابِ ماہتاب و کہکشاں لٹ کر
ادب سے پیش کرتا ہے جواہر تاب نذرانہ

یہیں کی بانسری کی لے پہ قدسی وجد کرتے ہیں
یہیں سجدہ کو خود مجبور ہے پندارِ بتخانہ

یہیں اس جانِ عشق و حسنِ دوشیزہ کی تیور میں
نظر آتا ہے اطمینان و استغنائے شاہانہ

یہیں تو اصل شعر و نظم کی رنگینیاں ہیں
یہیں تو ناز اُٹھاتی ہے مری تخئیلِ سلطانہ

رموزی جب ہیں ان رنگینیوں پر بھی ہم غالب
تو فطرت نے دیا مجھ کو مزاجِ تاجدارانہ

ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی
ایم اے۔ فاضل دیوبند

اغراض ومقاصد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) وقت کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر قرآن وسنت کی مکمل تشریح وتفسیر مروجہ زبانوں علی الخصوص انگریزی زبان میں کرنا۔

(۲) مغربی حکومتوں کے تسلط واستیلاء اور علوم مادیہ کی بے پناہ اشاعت وترویج کے باعث مذہب اور مذہب کی حقیقی تعلیمات سے جو بُعد ہوتا جا رہا ہے بذریعہ تصنیف وتالیف اس کے مقابلہ کی مؤثر تدبیریں اختیار کرنا۔

(۳) فقہ اسلامی جو کتاب وسنت کے بعد شریعت اسلامیہ کی سب سے بڑی قانونی تشریح ہے موجودہ حوادث وواقعات کی روشنی میں اس کی ترتیب وتدوین۔

(۴) قدیم وجدید تاریخ، سیر وتراجم، اسلامی تاریخ اور دیگر اسلامی علوم وفنون کی خدمت ایک بلند اور مخصوص معیار کے ماتحت انجام دینا۔

(۵) مستشرقین یورپ ریسرچ ورک کے پردہ میں اسلامی روایات، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب وتمدن یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام صلعم کی ذات (اقدس) پر جو نا روا بلکہ سخت بیرحمانہ اور ظالمانہ حملے کرتے رہتے ہیں اُن کی تردید بخصوص علمی طریقہ پر کرنا اور جواب کے اندازِ تاثیر کو بڑھانے کے لیے مخصوص صورتوں میں انگریزی زبان اختیار کرنا۔

(۶) اسلامی عقائد ومسائل کو اس رنگ میں پیش کرنا کہ عامۃ الناس اُن کے مقصد ومنشاء سے آگاہ ہو جائیں اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ ان حقائق پر زنگ کی جو تہیں چڑھی ہوئی ہیں اُنھوں نے اسلامی حیات اور اسلامی روح کو کس طرح دبا دیا ہے۔

(۷) عام مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو جدید قالب میں پیش کرنا خصوصیت سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر مسلمان بچوں اور بچیوں کی دماغی تربیت ایسے طریقے پر کرنا کہ وہ بڑے ہو کر تمدنِ جدید اور تہذیبِ نو کے مہلک اثرات سے محفوظ رہیں۔

برہان

جلد اول — شمارہ ۵

رمضان سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق نومبر سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

فہمِ قرآن

امام مالک فرماتے تھے" مجھے اُس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو لغت عرب میں مہارت نہ رکھنے کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

مجاہد کا مقولہ ہے" جو شخص اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب کے متعلق کلام کرے، اگر وہ لغات عرب کو نہیں جانتا۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا" جو شخص عربیت سے ناواقف ہے وہ بسا اوقات ایک آیت پڑھتا ہے اور اس طرح کسی لفظ کو پڑھتا ہے کہ وہ اُس کے لیے باعثِ ہلاکت بنجاتا ہے۔

قرآن مجید نے اپنی نسبت آسان ہونے کا ادعا کیا ہے لیکن اس کے باوجود اُس نے خود علم کے اعتبار سے لوگوں میں تفریق کی ہے۔ ارشادِ گرامی ہے:۔

لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط کرسکتے ہیں۔

دیکھیے جہاں تک نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے، صاف طور پر فرمایا جاتا ہے" وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ" کسی عالم وغیر عالم کی تخصیص نہیں کی جاتی لیکن جب اُس کے علم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُسے اُن لوگوں کے ساتھ مخصوص کردیا جاتا ہے جو مفہومِ کلام پر پورے طور سے

حاوی ہو کر احکام کا استنباط کر سکیں اور ظاہر ہے یہ سلیقہ ذوق عربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

کسی زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق ایک نعمتِ خداداد ہے۔ تاہم اس کے استوار ہونے میں علوم ذیل سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اُس وقت تک علوم عربیہ میں سے نہ کوئی علم و فن مدون ہوا تھا اور نہ کسی علم کی ضرورت تھی۔ قواعد زبان سے بنتے ہیں نہ کہ زبان قواعد سے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق اختلاف بہت کم نظر آتا ہے لیکن جب قرآن کی اشاعت عربی زبان نہ جاننے والے ملکوں میں ہوئی، اور وہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اُن کو قرآن فہمی کے قابل بنانے کے لیے عربیت کے علوم و فنون کو مدون کیا جائے۔ چنانچہ صرف و نحو اور دوسرے علوم کی تدوین عمل میں آئی۔

غور کرنا چاہیے کہ جب تک معاملہ اہل زبان تک محدود رہا کسی علم و فن کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی لیکن جب اُن سے گذر کر عجمی اقوام تک اُس کی رسائی ہوئی تو مصحف قرآن مجید کو صحیح پڑھنے اور اُس کو سمجھ سکنے کے لیے ان تمام علوم و فنون عربیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم جن کی تعداد علما نے چودہ لکھی ہے بدرجۂ کامل حاصل نہیں کریگا۔ اُسے حق نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کر سکے۔ اُس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ خود مریض ہے تو اطبا پر اعتماد کرے اور اُن ہی کے تجویز کیے ہوئے نسخہ کو اپنے لیے پیغام شفا سمجھے۔

ان علوم رسمیہ میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ دوسری چیز جو قرآن کے مطالب کو بصیرت

کے ساتھ سمجھنے کے لیے ازبس ضروری ہے، وہ نورِ بصیرت ہی یا دوسرے لفظوں میں اُسے "ذوقِ قرآنی" کہہ سکتے ہیں۔ ایک قرآن پر ہی کیا موقوف ہے، دنیا کا کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لیے عام ذہانت وذکاوت کے علاوہ اُس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو۔ علی گڑھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا، لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے۔ دیوبند نے ہزاروں علماء کو سند فراغت تقسیم کی لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہؒ کی سی نظر بصیرت رکھتے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی انسان کو کسی خاص فن کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے تو اس کی نظر اُس فن کے مسائل کے لیے ایک بیگانہ کی نہیں بلکہ آشنائے دیرینہ کی نظر ہوتی ہے۔ روز مرہ اُس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں کامیابی کا دارومدار ایک بڑی حد تک اُس سے دلچسپی اور فطری لگاؤ پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹری کا اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے والے کیا سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ پھر بیرسٹری کی ڈگری رکھنے والے کیا حذاقت فن اور کمالِ پیشہ و مہارت قانون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟

یہ چیز مزید بحث و نظر کی محتاج نہیں ہے۔ ہر شخص بداہتہً اس کو جانتا ہے، مگر کیا کیجیے اس زمانہ میں جس طرح بعض پرانی نظری باتیں بدیہی بن گئی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بالکل بدیہی اور مسلّم حقیقتیں بھی نظر و فکر کے حجاب میں پوشیدہ ہوتی جارہی ہیں۔

کسی فن کے ساتھ یہ فطری لگاؤ اور اس کا ذوقِ صحیح بالکل خداداد بات ہے۔ یہ نعمت ہر ایک شخص کے حصہ میں نہیں آسکتی ہے۔ اس بنا پر اگر ہم اُس فن کے کسی ماہر خصوصی کی طرف نسبت

کر کے یوں کہہ دیں کہ ہر شخص اُس جیسا نہیں ہو سکتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہوگا۔ اسی طرح ہم اگر یوں کہیں کہ قرآن مجید کو ہر شخص حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی طرح نہیں سمجھ سکتا، تو اہلِ انصاف جانتے ہیں ہمارا یہ سراسر حق ہے، کوئی شخص اس کی تکذیب نہیں کر سکتا۔ اب اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیے اور دیکھیے یہی برخود غلط گوبجویٹ کس قدر مضحکہ انگیز بات کہتا ہے۔

"قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے، نہ یہ ما بعد الطبیعۃ کا فلسفہ ہے، نہ ریاضی کی کتاب کہ اس کے لیے تحقیق کی جائے۔ انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صحیح دماغ دیا ہے وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا کہ ایک علامۃ اللوذعی قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہیے۔ نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت اور نہ کسی تفسیر کی۔"

اس تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فہم قرآن کے لیے اولین طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک علوم عربیہ کی مہارت، اور دوسرا ذوقِ قرآنی۔ پہلی چیز کسبی ہے اور دوسری وہبی جس طرح کوئی شخص شعر و ادب کے فطری ذوق کے بغیر شاعر و ادیب نہیں ہو سکتا ٹھیک اسی طرح "ذوق قرآنی" کے بغیر فہم قرآن کا اہل بھی نہیں ہو سکتا۔

این سعادت بزورِ بازو نیست ۔۔۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

علامہ سید رشید رضا نے اِسی حقیقت کو اس طریقہ پر بیان کیا ہے:۔

"وہ حق جس کے اندر کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام قرآن لوگوں تک پہنچا دیا جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اور اُس کو آپ نے وضاحت کے

ساتھ بیان بھی کر دیا۔ آپ نے علم دین کی کسی شے کے ساتھ کسی کو مخصوص نہیں کیا ہے۔ اور نہ علم دین میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت ہو سکتی ہے، البتہ صرف فہم قرآن کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر برتری دی جا سکتی ہے اور یہ فہم قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک ان میں سے کسبی ہے۔ دوسری وہبی۔ کسبی تو یہ ہے کہ آدمی علم السنت، آثار علماء صحابہ، تابعین۔ اور صدر اول میں جو علما راامصار تھے ان کے اقوال اور مفردات لغت اور اس کے اسالیب و طرق اور اسی طرح دوسرے علوم و فنون میں مثلاً علم فطرت، تاریخ عالم۔ نفسیات انسان۔ ان سب علوم سے قرآن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ سب علوم مکتسبہ ہیں جو کوشش اور جد و جہد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہبی ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ "فہم قرآن ایک خاص نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو ہی نوازتا ہے"۔ اور اس قسم ثانی کی وجہ سے ہی علوم کسبیہ میں مہارت رکھنے والے علماء ایک دوسرے پر باہمی فضیلت و برتری رکھتے ہیں مگر جو شخص علم عربیت سے ناآشنا اور سنن و آثار سے ناواقف ہے اُس کو علم وہبی سے بھی کوئی حصہ نہیں ملتا ہے، کیونکہ علم کسبی تو اصل ہے جو علم وہبی کو بطور نتیجہ پیدا کرتا ہے"

ہم عجمیوں اور خیر القرون سے اس قدر بعد رکھنے والوں کا کیا ذکر! خود صحابۂ کرام جو بلا واسطۂ غیرے نبوت کی زبان حق ترجمان سے قرآن مجید سنتے تھے اور جن کے سینے آفتاب رسالت کی روشنی سے روشن ہو رہے تھے فہم قرآن میں ہم رتبہ نہیں تھے۔ تمام صحابہ میں صرف چھ یا سات تھے جو قرآنی حقائق کی توضیح میں مستند مانے جاتے تھے اُن کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، زید بن ثابت، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

مسروق فرماتے ہیں :-

شاممت اصحاب رسول اللہ فوجدت علمھم انتھی الی ستۃ الی عمر وعلی و عبد اللہ ومعاذ وابی الدرداء وزید بن ثابت (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۴)	میں نے صحابہ کرام سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے ان کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی عبد اللہ بن مسعود، معاذ، اور ابو الدرداء، اور زید بن ثابت

پھر چھ یا سات بھی فہم قرآن میں یکساں نہیں تھے حضرت مسروق اسی روایت میں آگے چل کر فرماتے ہیں :-

فشاممت ھؤلاء الستۃ فوجدت علمھم انتھی الی علی وعبد اللہ	میں نے پھر ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم علی اور عبد اللہ پر ختم ہو گیا ہے۔

یزید بن عمیرۃ السکسکی حضرت معاذ بن جبل کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں "جب حضرت معاذ بن جبل کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے مجھ کو حکم کیا کہ تم علم صرف چار بزرگوں سے حاصل کرنا۔ عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن سلام، سلمان الفارسی اور ابو الدرداء۔

صحابۂ کرام میں جو حضرات تفسیر قرآن کی خدمت انجام دیتے تھے اُن کے حالات و اقوال پر نظر ڈالی جائے تو اُن میں ایک اور اعتبار و حیثیت سے بھی فرق نظر آئیگا حضرت عمر کار و بار خلافت کو انجام دیتے تھے، فتوحات ممالک اور سیاسی امور کی نگرانی کا کام کرتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو احادیث آپ سے زیادہ تعداد میں مروی ہیں۔ اور نہ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہی آپ کے اقوال

کثب سے دیکھنے میں آتے ہیں لیکن دراصل وہ حریم اسلام کے بہترین محرم راز تھے۔ اور اُن کی فطرت وطبیعت کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات واحکام کے ساتھ ایک رازدارانہ نسبت تھی حضرت ابوذر فرماتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے:-

ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول بہ — اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے جس کو وہ کہتے ہیں۔

لیکن اُن کی فہم "عقل قضائی" تھی یعنی جہاں تک اسلامی احکام کا تعلق ہے حضرت عمر کا فیصلہ ایک بڑی حد تک شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشاء سے قریب ہوتا تھا۔ رہی یہ بات کہ اس حکم کی حکمت اور اُس میں رمز کیا ہے تو غالباً اس معاملہ میں حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عمر پر فوقیت رکھتے ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق دعا کی تھی۔

اللھم فقھہ فی الدین — اے اللہ تو ابن عباس کو دین میں نظر تفقہ عطا فرما۔

بعض روایتوں میں بجائے "فَقِّهْهُ فِي الدِّين" کے "عَلِّمْهُ التَّأوِيل" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ تو قرآن مجید کی آیات کا صحیح مصداق ابن عباس کو بتا دے"

حضرت ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کے برخلاف سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے، حد سے زیادہ محتاط تھے۔ دن رات تعلیم وتعلم اور تدریس وتدرس میں بسر کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عموماً انصار کے پاس تھیں، میں حدیث کی جستجو میں کسی انصاری کے پاس آتا۔ اور اُس کو سوتا ہوا پاتا تو وہیں دروازہ پر بیٹھ جاتا تھا۔ ہواؤں کے تھپیڑے مجھ کو پریشان کرتے تھے۔ آخر کار بیدار ہونے کے بعد جب میں وہ روایت سن لیتا تو واپس چلا آتا تھا۔" اس انہماک ومشغولیت کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ شعر جاہلیت، انساب اقوام، اور تاریخ عرب

سے بہت واقف تھے۔ حضرت عمرؓ بھی ابن عباس کی یہ خصوصیت تسلیم کرتے تھے۔ اور جب کبھی انہیں قرآن مجید کے کسی لفظ میں اشکال پیش آیا انہوں نے حضرت ابن عباس کی طرف ہی رجوع کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ قرآنِ مجید کی سورہ عَبَسَ میں جو لفظ "اَبًّا" آیا ہے اُس کے معنی کے متعلق چند صحابہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمر نے فرمایا "چلو ابنِ عباس کے پاس چلیں وہ ہم سب سے زیادہ لغت عرب سے واقف ہیں"۔

حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے ارشاد فرمایا "نعم ترجمان القرآنِ انت" عبداللہ بن مسعود کا قول تھا "نعم ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ وہ آسمان اور زمین کونسی ہیں جن کی نسبت قرآن میں فرمایا گیا ہے "کانتا رتقاً ففتقنٰھما" ابن عمر نے اُس شخص کو خود کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ ارشاد ہوا" ابن عباس کے پاس جاؤ اور اس کے متعلق دریافت کرو اور پھر مجھ سے آکر اُسے کہہ جاؤ" حضرت ابنِ عباس کے پاس وہ آدمی آیا تو آپ نے جواب دیا" آسمانوں کا رتق تو یہ ہے کہ اُن سے بارش نہیں ہوئی تھی، اور زمینوں کا رتق یہ تھا کہ اُن میں روئیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فتق کر دیا تو آسمانوں سے بارش ہونے لگی اور زمینوں میں نباتات پیدا ہونے لگیں"۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ اذا جآءَ نصر اللّٰہِ والفتح کے متعلق صحابہ میں اختلاف ہوا۔ لوگوں نے حضرت عمر سے پوچھا "آپ کیا فرماتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا" میں وہی جانتا ہوں جو ابن عباس جانتے ہیں"

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل لسان اور رسول اللہ صلی

علیہ علم کے شرفِ صحبت سے سرفراز ہونے میں یکساں وہم رتبہ ہونے کے باوجود تمام صحابہ فہم قرآن میں یکساں نہیں تھے۔ بلکہ اُن میں بعض خاص خاص صحابہ ہی ایسے تھے جو درحقیقت ذمہ دارانہ طور پر تفسیر قرآن کی خدمت انجام دے سکتے تھے۔ اور اُن کی اس خصوصیت کو اجلّہ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کی اس برتری اور فضیلت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ذوقِ قرآنی جو محض ایک عطیۂ خداوندی ہے، اُن کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ افراط کے ساتھ مرحمت ہوا تھا۔ وذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

پھر کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ آج ایک مدعی علم جو گو اپنے بغدادی بہرہ کی طرح مروجہ عربی تو شُستہ پشتہ بول سکتا ہے لیکن عربی صرف و نحو سے ناآشنائے محض ہے اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ آج ہر شخص قرنِ اول کے مفسرین کرام کی طرح قرآن مجید کو سمجھ سکتا ہے۔

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے!

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک ایسی متاعِ عزیز و گرانمایہ ہے جس کی حفاظت و بقا کا سوال اختلاف افکار و خیالات کے باوجود ہر مسلمان کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ غور کیجیے آج نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیاء اسلام میں مسلمانوں کی کوئی تعلیمی درسگاہ ہے جس کی بنیاد غزالی وقت حضرت مولانا محمد قاسمؒ، جنید زمانہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور قطب عالم حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ایسے نفوس قدسیہ نے رکھی ہو۔ اور پھر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اور اُن کے بعد حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ ایسے جامع علوم و فنون بزرگوں نے اُس کو پروان چڑھایا ہو۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ملک کے جس عہد پرآشوب میں رکھی گئی۔ اُس پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا قطعاً بے مبالغہ ہے کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر جو کچھ مذہبیت پائی جاتی ہے، اور اسلامی قومیت کا جو تصور اُن کے

دل ودماغ میں موجود ہے، وہ ایک بڑی حدتک دارالعلوم دیوبند کی ہی علمی جدوجہد اور اس کی ہی پرخلوص جانفشانیوں کا نتیجہ ہے، ورنہ مغربی الحاد وزندقہ کے سیلابِ عظیم نے جس طرح ٹرکی ومصر کو اس کی روایتی مذہبیت سے کوسوں دور پھینک دیا ہے، اگر بانیان وخدمت گذاران دارالعلوم اپنے مجاہدانہ عزائم کے ہاتھوں سے مذہب کی حفاظت وبقا کا یہ بند نہ باندھتے تو خدامعلوم اس صنمکدۂ ہند میں ناموس ابراہیمی کے پاسبانوں کا حشر اب تک کیا سے کیا ہوگیا ہوتا! دنیائے اسلام کا وہ کونسا گوشہ ہے جہاں ہندوستان کے اس کوثر علم وفضل کی لہریں نہیں پہنچ رہی ہیں۔ اور وہ کونسا خطہ ہے جہاں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علم ومذہب کی خدمات میں مشغول نہیں ہیں؟

ایک زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں مشارق الانوار اور مشکوٰۃ المصابیح کے ماسوا کوئی حدیث کی کسی کتاب کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ الّا قلیلاً منہم۔ مگر آج مسلمانوں کا بچہ بچہ بخاری ومسلم اور ابوداؤد و ترمذی کے ناموں سے ناآشنا نہیں ہے۔ ہندوانہ رسم ورواج جو یہاں کے مسلمانوں میں باہمی اختلاط وارتباط کے باعث جڑ پکڑ چکے تھے آج چند دور افتادہ دیہات کے سوا بہت کم نظر آتے ہیں۔ جہاں فتویٰ دریافت کرنے کے لیے کوسوں کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ وہاں آج قریہ قریہ، شہر شہر میں مفتی دین و واعظ شرع موجود ہیں۔ یہ سب کس کی برکت ہے؟ دین ومذہب کا یہ عام چرچا، اسلام کی تعلیمات کا گھر گھر یہ ذکر کیا دارالعلوم دیوبند کی مساعی جمیلہ کا صدقہ نہیں ہے؟ پھر ان تعلیمی وعلمی کارناموں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت جو اس کو تمام دنیائے اسلام کی قومی تعلیم گاہوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہاں ہر وقت پانسو سے زیادہ ایسے طلبہ موجود رہتے ہیں جن کے قیام وطعام اور دیگر ضروریات لباس وعلاج کا تمام تر تکفل خود دارالعلوم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ضخیم ضخیم درسی کتابیں ہر ایک کو دی جاتی ہیں، تعلیم کی فیس کسی سے نہیں لی جاتی۔ اس میں مستطیع وغیر مستطیع کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اساتذہ جن میں سے ہر ایک بجائے خود اپنے اپنے فن میں مہارت رکھتا ہے۔ نہایت قلیل تنخواہوں پر کام کرتے ہیں۔ اور کسی بد دلی

کے ساتھ نہیں بلکہ پورے خلوص و یک جہتی کے ساتھ اوقات مدرسہ کے علاوہ خارج میں بھی تعلیم دینے سے ہی نہیں کتراتے۔ اس کی قدر آپ کو اُس وقت معلوم ہوگی جبکہ آپ اس درسگاہ علم و دین کا مقابلہ اُن تعلیمی اداروں سے کریں جہاں کے اساتذہ بیش قرار تنخواہیں پاتے ہیں، اور جہاں کا ایک ایک طالب علم اپنی فیشن پرستی کے طفیل والدین کی زندگی اجیرن بنا دیتا ہے۔ جن کے پاس زرق برق ہال ہیں۔ کلاس روم ہیں۔ سرسبز و شاداب تفریح کے میدان ہیں۔ طویل و عریض صاف ستھرے کھیل کی گراؤنڈس ہیں اور جگمگاتی ہوئی لیبوریٹریاں ہیں۔ لیکن ان تمام فضول خرچیوں اور تکلفات آرائش کے باوجود جب ایک طالب علم ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دماغ مذہبی مسائل کے علم سے خالی ہے اور اُس کی کشکولِ معلومات میں اُن چند ٹکڑوں کے سوا کچھ نہیں ہے جن کو فرنگی علما نے چبا کر اُگل دیا ہے۔

بہر حال اگر مذہب زندگی کی تشریح کا نام ہے۔ اور اس کے بغیر مسلمانوں کا جینا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دارالعلوم دیوبند جو مسلمانوں کی واحد مذہبی مرکزی درسگاہ ہے اُس کا بھی باقی رہنا ازبس ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ آئے دن کی ملکی سیاسی و غیر سیاسی تحریکات کا اثر اب دارالعلوم پر بھی پڑ رہا ہے۔ سخت ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے اولین فرض کا احساس کریں اور دارالعلوم دیوبند کی امداد و اعانت کر کے مذہب کے اس شجرۂ مبارکہ کو زیادہ سے زیادہ سرسبز و شاداب ہونے کا موقع دیں۔ مہتمم صاحب دارالعلوم رمضان کے اس ماہِ مقدس میں چندہ کی عام اپیل شائع کیا کرتے ہیں۔ ہم اس کی پُر زور تائید کرتے ہیں، اور اُمید قوی رکھتے ہیں کہ مسلمان اس پر لبیک کہینگے۔

حضرت یونسؑ کا ذکر قرآنِ مجید میں

(مولانا ابوالقاسم محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی)

(۲)

ان تصریحات کے بعد ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ان واقعات کے سلسلہ میں جن کو قرآنِ عزیز بیان کرتا ہے جو پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں یا کردی جاتی ہیں اُن کے لئے صحیح طریقِ کار بیان کر دیا جائے اِس مقصد کے لئے حسبِ ذیل چند تمہیدی اصول کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) قرآنِ عزیز ہم کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کس عقیدہ کی تعلیم دیتا ہے اور اُن کے لئے ہمارے بنیادی عقیدہ میں کون سی جگہ ہے؟

(۲) انبیاء کے تذکرہ میں قرآنِ عزیز کی بعض آیات میں ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو بظاہر انبیاء کی عظمتِ شان کے منافی معلوم ہوتا ہے ایسا کیوں ہے؟

(۳) قرآنِ عزیز کی کسی آیۃ میں متعدد احتمالات کی گنجائش کب پیدا ہوتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے اہم اور غیر متبدل بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ہم معصوم سمجھیں اور معصومیت کے معنی یہ ہیں کہ ان ہستیوں سے گناہ، یا خدائے تعالیٰ کی کسی قسم کی نافرمانی کا صدور ناممکن اور محال ہے، یہ مامور من اللہ ہوتے ہیں اور خدا کے احکام کی اطاعت ان کا مایۂ خمیر، اور اُن کی فطرت کا جز ہے اور یہ ہر طرح کی تلویث

نفسانی اغراض سے پاک اور مطہر ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن عزیز کی تصریحات یہ ہیں۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝	اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول مگر اُس کو یہی حکم بھیجا کہ میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں سو میری بندگی کرو اور کہتے ہیں کہ رحمٰن نے بیٹا بنا لیا۔ وہ اس سے پاک ہے لیکن وہ برگزیدہ بندے ہیں اور وہ اس سے بڑھکر نہیں بول سکتے اور وہ اُسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔
وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ	جو رسول کی پیروی کرتا ہے پس اُس نے یقیناً خدا کی پیروی کی
وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	اور ہم رسول کو اسی لئے بھیجتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے اُس کی طاعت و پیروی کیجائے۔
وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْ اِلَيْهِمْ (انبیاء)	اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجا مگر مردوں کو وحی بھیجتے تھے ہم اُن کی طرف
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم)	اور وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں بولتے اپنی خواہش سے یہ (قرآن) نہیں ہے مگر خدا کی وحی جو اُن کے پاس بھیجی گئی
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا (مریم)	یہ وہ لوگ ہیں جن پر انعام کیا اللہ نے پیغمبروں میں آدم کی اولاد اور اُن میں جن کو سوار کر لیا ہم نے نوح کے ساتھ اور ابراہیم کی اولاد میں اور اسرائیل کی اور اُن میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا۔

یہ چند آیات ہیں جو اختصار کے طور پر یہاں نقل کی گئی ہیں ورنہ قرآن عزیز میں اس سلسلہ کی اور بھی آیات دلیل میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

بیان کردہ تصریحات میں پہلی، دوسری اور تیسری آیات اس بارہ میں نص قطعی ہیں اور صراحت کرتی ہیں کہ پیغمبر کا کوئی قول اور کوئی عمل "من امر اللہ" اور "وحی من اللہ" سے باہر نہیں ہوتا اور اس کی زندگی ہر قسم کے گناہ کی تلویث سے پاک اور مقدس و مطہر ہوتی ہے، اور وہ دوسرے انسانوں سے الگ ایک معصوم زندگی رکھتا ہے تب ہی اُس کی پیروی خدا کی پیروی شمار ہوتی ہے اور اسی لئے اُن کی بعثت کا مقصد وحید یہی بنتا ہے کہ خدا کی مخلوق اُن کے حکم کے سامنے حکم خداوندی سمجھ کر سر تسلیم خم کردے۔ اور چوتھی، پانچویں، اور چھٹی آیات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اس تقدیس و معصومیت کی تائید کرتی، اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ جن انسانوں کو خدائے تعالیٰ نبوۃ و رسالۃ کے لئے چن لیتا ہے اُن کے مہتدی، مجتبیٰ اور صاحب وحی ہونے کا مقام دوسرے نیک، اور صالح انسانوں کے مقام سے جدا ایک خاص رفعت و بلندی رکھتا ہے۔

گویا پہلی سے تیسری آیات تک معصومیت انبیاء کے لئے جو قطعیت ثابت ہوتی ہے وہ اُن تمام آیات کے لئے تفسیر ہے جن میں انبیاء و رسل کی عظمت شان کو دوسرے برگزیدہ انسانوں سے ممتاز بتایا گیا ہے۔

اور اس قسم کی تمام آیات جو چوتھی، پانچویں، اور چھٹی بیان کردہ آیتوں کی طرح ہیں پہلی اور تیسری قسم کی آیتوں کی تائید، اور تقویتِ مفہوم کے لئے بیان کی گئی ہیں۔

غرض ان تصریحات سے یہ قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہوگیا کہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت کا عقیدہ اسلام کا ایک بنیادی اور اساسی عقیدہ ہے۔

دوسرے سوال کے جواب کی تشریح یہ ہے کہ سابق میں معلوم ہوچکا ہے کہ انبیاء

علیہم السلام کے ساتھ خدائے برتر کا معاملہ عام انسانوں، بلکہ نکوکاروں، اور مقربوں، سے بھی جداگانہ خاص طریقہ کا ہے۔ جس طرح کائنات میں وہ نیابتِ الٰہی کا شرف رکھتے، اور تمام عالم سے افضل ترین مخلوق شمار کئے جاتے ہیں، اسی طرح اُن کے اس رتبۂ عالی کے پیش نظر جو خدا کی جناب میں اُن کو حاصل ہے اُن کی ذمہ داریاں بھی دنیا کی تمام مخلوق سے برتر اور نازک ہیں۔

اس بات کو اس طرح سمجھئے کہ سلاطین عالم کے دربار میں وزراء اپنے مراتبِ علیا میں سب رعایا سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اور اپنے عہدہ کی ذمہ داری کے اعتبار سے اُن کا وہ مقام ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔

لہٰذا امورِ مفوضہ میں گرفت، اور جوابدہی کے لحاظ سے بھی، بادشاہ اُن کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کرتا جو عوام و خواص رعایا کے ساتھ کرتا ہے کیونکہ وہ بادشاہ کے مزاج داں، حکومت کے آئین کے عالم و ماہر، اور درباری قوانین کے سب سے زیادہ رازداں ہیں۔ پس ..... اگر کسی عام یا خاص فرد سے آئین و قوانینِ حکومت و دربار میں کسی قسم کی کوتاہی ہو جاتی، یا نافرمانی تک سرزد ہو جاتی ہے تب بھی بادشاہ یا حاکم اس پر چشم پوشی کرتا، یا بہت معمولی گرفت کر کے معاملہ کو ختم کر دیتا ہے۔ لیکن اس کوتاہی کا ہزارواں حصہ بھی ان وزیروں یا رازدارانِ قوانین شاہی سے سرزد ہو جاتا ہے تو وہ سخت مورد عتاب ہوتے ہیں اور اُن کی اس ادنیٰ کوتاہی کو عظیم الشان جرم کی شکل میں ظاہر کر کے اُن سے سخت سے سخت باز پرس کی جاتی ہے۔ اور اس قسم کا معاملہ کچھ بادشاہ و حاکم پر ہی موقوف نہیں ہے فطرتِ مستقیم اور عقلِ سلیم بھی اسی کی جانب راہنمائی کرتی ہے کہ ناواقفانِ رموزِ آئین کی کوتاہیاں جو ہر طرح نظرانداز کر دینے، اور چشم پوشی اختیار کر لینے کی مستحق ہیں واقفانِ رموز سے اگر سرزد ہوں تو موجب عتاب، اور باعث گرفت ہیں۔

اسی فطری اسلوب پر قرآنِ عزیز میں ہم خدائے برتر اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے

درمیان معاملہ کی نوعیت کو" دیکھتے ہیں۔

وہ ایک طرف اُن کے عظمت و رفعت، اور عصمت و تقدیس کے لئے نصوص قطعیہ سناتا اور اُس کو اساس اسلام قرار دیتا ہے۔

اور دوسری جانب اگر اُن سے معمولی لغزش بھی سرزد ہو جاتی ہے تو سخت سے سخت لہجہ میں اُن کی گرفت کرتا ہے۔

اور چونکہ اُس نے پہلے اسلوب بیان میں اُن کے اصل رتبہ کو صاف اور واضح کر دیا ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے اسلوبِ بیان میں یہ خطرہ باقی ہی نہیں رہتا کہ اُن کے متعلق اُن آیات سے ہمارے جزم و اعتقاد میں تبدیلی ہو جانی چاہیئے یا ادنیٰ سا بھی شک و شبہ ہونا چاہیئے۔

کیوں؟ اس لئے کہ پہلے اسلوبِ بیان کا مقصد ہی یہ ہے کہ اُس کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کی حقیقی شان جو خدائے برتر کے نزدیک ہے وہ ظاہر ہو جائے۔

اور دوسرے اسلوب بیان میں اُن کی کسی لغزش پر اپنے زیادہ سے زیادہ عتاب کے اگر ظاہر کیا جائے تو اصل عقیدہ میں کسی قسم کا تزلزل نہ پیدا ہو۔

دوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھئے کہ پہلے اسلوب بیان میں اس بات کی وضاحت ہی کہ خدا کے ساتھ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جو تعلق ہے اُس کے بارہ میں ہمارا کیا عقیدہ ہونا چاہیئے، اور ہم کو اُن کے ساتھ کیا معاملہ برتنا چاہیئے۔

اور دوسرے اسلوب بیان میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان رازداران آئین الٰہی کی کوتاہیوں پر خدا کا معاملہ ان کے ساتھ کس طرح ہوتا ہے اور احکم الحاکمین کے سامنے بایں رفعت و بلندی اور طہارت و تقدیس، اُن کی نیازمندی، اور اُن کے اعترافِ قصور کا طریقہ کیسا ہے گویا "حسنات الابرار سیأت المقربین" "یا نزدیکان رابیش بود حیرانی" کا ایک عجیب و غریب مظاہرہ

مقصود ہوتا ہے۔

غور فرمائیے کہ حضرت آدمؑ کو پہلے اسلوب کے مطابق سب سے بڑا شرف "خلافتِ الٰہیہ" کا عطا فرمایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ) میں زمین میں اپنا نائب مقرر کرنے والا ہوں۔

لیکن جب شجرِ ممنوعہ سے حضرت آدمؑ باز نہ رہ سکے، تو اگرچہ خود خدائے برتر نے اُن کی جانب سے یہ معذرت فرمادی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا — ہم نے آدم کو اس سے پہلے تاکید کردی تھی، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اُس میں (اس گناہ کے لئے) ارادہ نہیں پایا۔ یا ہمت واستقلال نہ پایا۔

پھر بھی اُن کے اس عمل پر اظہارِ ناراضی کے لئے نہایت سخت تعبیر اختیار کی اور فرمایا۔

وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى — اور حکم ٹالا آدمؑ نے اپنے رب کا اور راہ سے بھٹک گیا۔

گویا ایک اولوالعزم نبی کی نسیانی لغزش بھی حد درجہ قابلِ گرفت ہے اس لئے کہ واقفانِ رموزِ الٰہیہ سے یہ نسیان بھی کیوں ہوا۔

اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے رتبۂ عالی کو ملاحظہ فرمائیے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن خدا کے رسول ہیں اور نبیوں کے آخری نبی ہیں

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ — ہم نے تجھ کو جہاں والوں کیلئے رحمت بناکر بھیجا ہے۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا — ہم نے تجھ کو گواہ، بشیر ونذیر، اور اپنے اذن سے اللہ کی طرف بلانیوالا، اور روشن چراغ بناکر بھیجا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ — اور ہم نے تجھ کو کل انسانوں کیلئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر اس واقعہ پر غور کیجئے کہ ایک مرتبہ ذات اقدس، قریش کے سرداروں سے تبلیغِ اسلام کے شوق میں صرف اس لئے الگ بات چیت کر رہے تھے کہ انھوں نے یہ شرط کر لی تھی کہ غرباء کے برابر بیٹھ کر ہم گفتگو نہ کریں گے۔ حسب اتفاق عبداللہ بن ام مکتومؓ ایک غریب نابینا مگر عاشق رسول صحابی وہاں آ نکلے۔ اور نابینا ہونے کی وجہ سے اصل حال سے غافل آپ کو پکارنا شروع کر دیا۔ آپ کو اُس وقت یہ دخل اندازی پسند نہ آئی اور حسبِ عادت شریفہ محض چشم و ابرو سے ہی غصہ ظاہر ہوا، زبان مبارک سے کوئی درشت کلمہ نہ فرمایا مگر اللہ تعالیٰ کو آپ کی یہ بات پسند نہ آئی اور نہایت عتاب کے ساتھ فرمایا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى — تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا اُس کے پاس نابینا اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا یا سوچتا تو کام آتا اُس کے سمجھانا۔

لغت میں عبوس کے معنی کو پڑھئے اور پھر ذات اقدس کی شان کو ملاحظہ فرمائیے تو آپ کو خود حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جب اللہ تعالیٰ کے اور انبیاء علیہم السلام کے درمیان اُن کی کسی لغزش پر (خواہ وہ کسی صورت سے بھی گناہ نہ ہو) گرفت ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کی جانب سے کس قدر سخت تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

تیسرے سوال کا جواب اتنا صاف ہے کہ وہ کسی تفصیل کا محتاج نہیں یعنی اگر کسی آیت کی توضیح و تشریح بمصداق "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" قرآن کا ایک حصہ خود اپنے دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے، "قرآن عزیز کی آیت، یا صحیح روایتِ حدیث" کے ذریعہ ہو جاتی ہو تو پھر احتمالات عقلی

اور ضعیف روایات (کے پیش نظر مختلف وجوہ کے ذکر سے بجز انتشار اور اصل حقیقت کے مستور ہو جانے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے۔

خصوصاً انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات و قصص کے بارہ میں اس قسم کی موشگافیاں یا بے احتیاطیاں نہ صرف نامناسب بلکہ بعض مرتبہ سخت ضرر رساں ثابت ہوتی، اور متوسط و عامی مسلمانوں کے عقیدہ تک میں رخنہ انداز ثابت ہوتی ہیں اور غیر مسلم متعصبین کو حرف گیری کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ ہاں اصل حقیقت کے منکشف اور واضح ہو جانے کے بعد دوسرے ایسے مختلف معانی و وجوہ بیان کرنا جو اسرار و حکم کی شکل میں اصل معنی کے لئے باعث تائید و تقویت ہوں نہ کہ باعث انتشار و اضمحلال تو اُن کے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور اگر قرآن عزیز، حدیث صحیح، یا اس آیت کے بارہ میں اجماع امت کی نصوص و تصریحات موجود نہ ہوں تو پھر اصل لغت عربی کی راہنمائی میں جو احتمالات ایسے نکل سکتے ہوں کہ دوسرے مسلمہ اصولِ اسلامی پر اُن سے زد نہ پڑتی ہو تو اُن احتمالات کو بیان کرنا اُس آیت کی تفسیر و تحقیق کے لئے بہتر ہوگا، اور وہ ہر طرح قابل تسلیم ہوں گے، کیونکہ قرآن عزیز عربی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اُس کے مفہوم و معنی سمجھنے کے لئے یہ ایسی ہی ہے جیسی کہ کلید قفل کے لئے۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۔ ہم نے اس (قرآن) کو عربی قرآن اتارا ہے تاکہ تم سمجھو

ان تمہیدی گذارشات کے بعد اب اگر حضرت یونس (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے واقعہ میں ولن نقدر کے معنی قدرۃ سے ماخوذ تسلیم کرلئے جائیں (اگرچہ تصریحاتِ بالا کے مطابق اس کی قطعاً ضرورت باقی نہیں رہتی) تو بقول صاحب روح المعانی اس معنی میں یا مجاز اختیار کرنا پڑے گا یا استعارہ تمثیلیہ مجاز کی صورت میں معنی یہ ہوں گے۔

یونس نے سمجھا کہ ہم اس پر اپنی قدرت کا استعمال نہ کریں گے یعنی قدرت کہہ کر استعمال

قدرت مراد لیں۔

اور تمثیل کی شکل میں اس طرح کہا جائے گا۔

حضرت یونس کے چلے جانے کا طرز ایسا تھا جیسا کوئی یہ سمجھ کر کہیں سے چلا جائے کہ ہم اس پر اپنی قدرت نہ رکھ سکیں گے اور اس کو پکڑ نہ سکیں گے۔

اگر اس دوسرے معنی کو تسلیم کر لیں تو پھر گذشتہ تمہیدی اصول میں سے دوسری جس کے مطابق یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر حضرت یونس کا ہجرت کر جانا باعثِ عتاب ہوا اور حق تعالیٰ نے اس سخت سے سخت تعبیر کے ساتھ اُن کے اس عمل پر گرفت فرمائی۔

چونکہ شاہ عبدالقادر صاحب جیسے مترجم قرآنِ عزیز نے اس جگہ یہی ترجمہ اختیار کیا ہے اسلئے ہم نے اس کے محل کو نقل کر دینا مناسب سمجھا ورنہ تمام محقق علماءِ تفسیر نے "لن نقدر" میں قدر کے معنی قضاء وحکم یا ضیق وتنگی ہی کے لئے ہیں اور یہی بے غل وغش صحیح اور درست ہیں۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حضرت یونس کا دعاء کے وقت انی کنت من الظلمین کہنا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ انھوں نے گناہ کیا تھا۔ بلکہ ایک برگزیدہ نبی ہونیکی حیثیت سے اپنے اس طرزِ عمل کو انکساری اور نیازمندی کے طور پر جرم شمار کیا اور استغفار کیا، نیز لغت عربی میں ظلم "وضع الشئ فی غیر محلہ" یعنی کسی چیز کو بے محل رکھ دینے کو کہتے ہیں۔ اور یہ جس طرح بڑے سے بڑے گناہ "شرک" پر صادق آتا ہے "ان الشرک لظلم عظیم" اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی لغزش پر بھی صادق آتا ہے۔

عرب کا محاورہ ہے لم یظلم منہ شیئًا یعنی اس میں سے ایک بھی کم نہیں ہوا۔ یہاں ظلم کے معنی کم ہونے کے ہیں۔ جواہر الحسان میں ہے۔ وقولہ انی کنت من الظلمین یرید فیما خالف فیہ من ترک مداز قومہ والصبر علیہم ھذا احسن الوجوہ فاستجاب اللہ لہ ولیس فی ھذہ الکلمۃ ما یدل انہ اعترف بذنب کما اشار الیہ بعضھم

حضرت یونس بن متیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں تیسری آیت والصّفّت کی آیات ہیں۔ اس کی ایک آیت کا تذکرہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ ان آیات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِذْ اَبَقَ اِلَی	اور تحقیق یونس ہے رسولوں میں سے، جب بھاگ کر پہنچا
الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ	اس بھری کشتی پر، پھر قرعہ ڈلوایا تو نکلا خطاوار پھر لقمہ
الْمُدْحَضِیْنَ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ	کیا اُس کو مچھلی نے اور وہ الزام کھایا ہوا تھا، پھر اگر نہ
فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ	ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو، تو رہتا اُسی
بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ	کے پیٹ میں جس دن تک کہ مردے زندہ ہوں، پھر
وَهُوَ سَقِیْمٌ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ	ڈال دیا ہم نے اُس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا،
وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ	اور اُگایا ہم نے اُس پر ایک درخت بیل والا، اور بھیجا اُس
فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ ط	کو لاکھ آدمیوں پر یا اُس سے زیادہ، پھر وہ ایمان لائے
	پھر ہم نے فائدہ اٹھانے دیا اُن کو ایک وقت تک۔

ان آیات میں سے بعض جملوں کی تحقیق و تفسیر تو بیان ہو چکی۔ البتہ اس مقام پر صرف یہ مسئلہ قابلِ تشریح ہے کہ حضرت یونس کو مچھلی نے نگل لیا اور بعد میں اُن کو کنارہ پر اگل دیا۔

مچھلی کا حضرت یونس کو نگل لینا، اور بعد میں زندہ اگل دینا ایک اچنبھی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے بعض ان جدید مفسروں نے جو دین و مذہب کے پردہ میں الحادی سمیّت کو نہایت خوش اسلوبی سے پھیلانے کے عادی ہیں اس واقعہ سے انکار کرنے کی سعی کی ہے لیکن تمام روایات، اور اقوال مفسرین سے قطع نظر، ہم اگر قرآن عزیز کے جملہ " فالتقمہ الحوت " کی تفسیر صرف لغتِ عرب ہی سے اخذ کریں تب بھی ادنیٰ سا اشکال پیدا نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ تمام اربابِ لغت اور ائمۂ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ التقم کے معنی نگل لینے کے ہیں۔

اقرب الموارد میں ہے التقمہ۔ ابتلعہ اور ابتلع کے باب میں ہے (ابتلعہ) انخولہ من حلقومہ الیٰ جوفہ ولم یمضغہ۔ اُس نے اُس کو اپنے حلقوم سے پیٹ میں اتار لیا اور چبایا نہیں۔

قاموس۔ فقہ اللغہ۔ لسان العرب۔ ان تمام سلف وخلف ائمہ لغت کی کتابوں سے باتفاق التقم کے معنی ابتلع کے ثابت ہیں اور ابتلاع نگلنے کی ایسی حالت کا نام ہے کہ چیز کو گلے سے نیچے اتار لیا جائے اور چبایا نہ جائے۔ صاحب اقرب الموارد نے قدیم ائمہ لغت سے ایک مثل بھی پیش کی ہے جو اہل عرب کے محاورات میں بولی جاتی ہے "لا یصلح رفیقًا من لم یبتلع ریقا" وہ دوست بننے کی قابل نہیں ہے جو دوست کے تھوک کو نہ نگل جائے۔

اور کسی ایک لغت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ التقم کے معنی بغیر نگلے ہوئے فقط منہ میں لئے رہنے کے ہیں۔ لہٰذا کسی مدعی تفسیر قرآن عزیز کا یہ دعویٰ کہ لغت میں التقم کے دونوں معنی ہیں نگل لینا بھی اور فقط منہ میں لئے رہنا بھی یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ بلکہ التقم جب ہی صادق آئیگا کہ اس کو گلے سے نیچے حلقوم میں اتار دے پس ایسی صورت میں یہ کہنا۔

"قرآن کریم میں حضرت یونس کے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کے متعلق صریح لفظ نہیں ہیں"

(بیان القرآن مسٹر محمد علی لاہوری)

واقعہ کے خلاف بلکہ دیانت کے بھی خلاف ہے۔ رہا حدیث وروایت کا معاملہ سو اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی نقل کی ہے یہ روایت بعض محدثین کے نزدیک حسن کے درجہ کی سمجھی جاتی ہے لیکن اگر یہ روایت کسی درجہ میں بھی صحیح نہ ہو، تب بھی اس سے نفس معاملہ کا انکار نا ممکن ہے اس لئے کہ جب لغتِ عربی "جس میں قرآن نازل ہوا ہے" اس بات کی شہادت

سے رہا ہے اور کوئی روایت اس کے خلاف موجود نہیں اور اگر ہے تو حمایت ہی میں ہے تو پھر کون سی وجہ ہے کہ ہم نفس معاملہ کا انکار محض اس لئے کر دیں کہ ہماری طبیعت اس کو اچنبھی بات سمجھ کر ماننے کے لئے ہچکچاتی ہے۔ یا خوف پیدا ہوتا ہے کہ اس کے تسلیم کر لینے سے روشن دماغ انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیئے جائیں گے۔ نیز التقم کے یہ معنی ۔۔۔ کہ مچھلی نے اُنکو نگل لیا۔ اس کی تائید آیت کے اس جملہ سے بھی ہوتی ہے۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِىْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ
پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے

اس سے زیادہ صاف اور واضح دلیل اور کن الفاظ سے ہو سکتی تھی کہ مچھلی نے یقیناً اُن کو نگل لیا اور اگر وہ خدائی تسبیح و تقدیس کرنے والوں میں نہ ہوتے تو کبھی اُن کو اس سے نجات نہ ملتی۔ ایسی حالت میں یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

"دوسرے اگر مچھلی کا پیٹ بھی مراد لیا جائے تو یہاں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ تسلیم کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ مچھلی کے پیٹ میں جانے کا کوئی قطعی ثبوت ان الفاظ میں نہیں"

اگر یہ معنی مراد لئے جائیں جو یقیناً مراد ہیں تو پھر یہ کہنا کہ "مچھلی کے پیٹ میں جانے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں" اس کے کیا معنی؟ اگر یہ معنی نہیں تو آخر قرآنِ عزیز کی اس آیت کے حصہ کے یہاں اور کیا معنی ہیں جو سیاق و سباق کے مطابق چسپاں ہوں۔

سب سے زیادہ مہمل یہ استبعاد ہے کہ مچھلی قیامت تک زندہ نہیں رہ سکتی، اور اگر مچھلی کو مردہ مان کر حضرت یونس کو صحیح و سالم مانا جائے تو مردہ کے اجزاء قائم نہیں رہتے "اسلئے کہ اس فلسفیانہ موشگافی کا یہاں موقعہ ہی کیا ہے۔ یہ عرب کا اور نہ صرف عرب کا بلکہ ہر زبان

کا محاورہ، اور مثل ہے کہ جب کسی شے کے متعلق یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ آخر تک یہ اسی حالت میں رہیگی تو کہا کرتے ہیں کہ "اب تو قیامت تک ایسی ہی رہیگی" تو کیا کوئی عاقل بھی اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز فانی نہیں بلکہ اسی حال میں قیامت کے خاص دن تک باقی رہے گی۔ یا یہ سمجھتا ہے کہ اس چیز کی جو عمر و بقا بھی ہے اسی ایک حالت پر گذر جائے گی۔ لہٰذا یہاں بھی صرف یہ کہا گیا ہے کہ حضرت یونس کو کبھی مچھلی کے پیٹ سے نکلنا نصیب نہ ہوتا اگر وہ خدا کے تسبیح گذار نہ ہوتے۔

اسی طرح سورۂ انبیاء میں فنادیٰ فی الظلمات میں یہ کہنا کہ ظلمۃ سے مراد شدۃ ہے صحیح نہیں اس لئے کہ ظلمۃ اصل نسبت کے اعتبار سے تاریکی اور اندھیری کو کہتے ہیں کتب لغت میں ہے۔ (الظُلمۃ والظُلُمہ) ذھاب النور، وقیل ھی عدم الضوء عما من شانہ ان یکون مضیًا اور شدت کے معنی بعض مقام پر کنایۃً قرینہ سے لئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اگر دریا اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی مراد لی جائے تو نہ صرف مناسب بلکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی معنی درست اور صحیح ہیں اور بالفرض اگر شدت کے معنی ہی لئے جائیں تو بھی اصل حقیقت کے خلاف لازم نہیں آتا یعنی جب مچھلی نے بغیر چبائے نگل لیا تو دریا اور پھر مچھلی کا پیٹ، ان شدائد کی حالت میں یونس نے خدا کو پکارا بہر حال قرآن عزیز نہایت صاف اور واضح طور پر یہ ثابت کر رہا ہے کہ حضرت یونس کو اس آزمائش میں ضرور مبتلا کیا گیا اور پھر ان کے اعتراف لغزش، اور مشغولیت تسبیح و تقدیس کے ساتھ جناب باری میں دعا کی وجہ سے ان کو مچھلی نے کنارہ پر اگل دیا اور وہ صحیح و سالم اس سے نجات پا گئے اور خدا اپنے برگزیدہ بندوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتا ہے۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے متعلق پانچویں آیت سورہ ن والقلم میں مذکور ہے۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے کہا گیا ہے

کہ تم کو دشمنوں کی ایذا پر صبر کرنا چاہیئے اور حضرت یونس کی طرح جلد بازی اور بے صبری نہ دکھانا چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ لَّوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ۝

اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی۔ اور مت ہو صاحب حوت جیسا۔ جب پکارا اُس نے اور وہ رنج میں بھرا تھا۔ اگر نہ سنبھالتا اُس کو تیرے رب کا احسان تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر پھر نوازا اُس کو اُس کے رب نے پھر کر دیا اُس کو برگزیدہ لوگوں میں۔

رہا یہ کہنا کہ اس میں اختلاف ہے کہ کون سے دریا کا واقعہ ہے اور اگر فرات کا واقعہ ہے تو اُس میں اتنی بڑی مچھلیاں کہاں؟ سو یہ بھی تجربات ہے اس لئے کہ جہاں تک جارو قوع کا سوال ہے تو محققین اس پر متفق ہیں کہ یہ فرات کا واقعہ ہے اور صاحب روح المعانی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود فرات میں ایسی ایسی مچھلیاں دیکھی ہیں جو عظیم الشان جثہ رکھتی تھیں۔ یعنی انسان کو لقمہ بنا سکتی تھیں۔

اس تمام تحقیق و تفصیل کی اگر تحلیل کی جائے تو اس سے حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) حضرت یونس خدائے برتر کے برگزیدہ انبیاء میں سے ایک نبی و پیغمبر تھے۔

(۲) حضرت یونس نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو خدا کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ قوم نے اول نہ مانا مگر حضرت یونس کے ترک وطن کے بعد ایمان قبول کر لیا اور اس وجہ سے عذاب الٰہی ٹل گیا۔

(۳) یہ صرف قوم یونس ہی کی خصوصیت تھی کہ وہ تمام کی تمام قوم مشرف بہ ایمان ہو گئی۔

(۴) حضرت یونس کا ترک وطن کر جانا اگرچہ گناہ نہ تھا مگر نبی کی ہجرت اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے جلد بازی تھی۔

(۵) خدائے تعالیٰ انبیاء کی معمولی لغزش پر بھی نہایت سختی سے باز پرس کرتا اور اس کو بہت بڑے جریمہ سے تعبیر کرتا ہے۔

(۶) حضرت یونس کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا اور مچھلی کے پیٹ میں مقید کر دئے گئے۔ حضرت یونس نے اعتراف جرم کیا، دعا مانگی اور خدا نے ان کو معاف کر دیا اور برگزیدہ انسانوں (نبیوں) کے زمرہ میں شامل رکھا۔

(۷) حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بتایا گیا کہ تمہاری قوم پر بھی عذاب عام نہ آئے گا اور آخر میں وہ ایمان لے آئیگی۔

(۸) ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ تم جلد بازی سے کام نہ لینا جس طرح حضرت یونس نے ہجرت کرنے میں لیا۔ بلکہ اولوالعزم رسولوں کی طرح خدا کے حکم کے منتظر رہتے ہوئے صبر کو ہاتھ سے نہ دینا

یہی وہ امور ہیں جو قرآن عزیز میں حضرت یونس کے واقعہ کے متعلق پانچ سورتوں میں صاف صاف مذکور ہیں اور جن میں باقی احتمالات، وتاویلات رکیکہ و باطلہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔

اب ہم اپنے اس مضمون کو صرف دو جزوی اور ضمنی امور کی تشریح کے بعد " جو اسی سلسلہ سے متعلق ہیں " ختم کرتے ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ ناظرین کو اس سے فائدہ پہنچے گا اور انبیاء علیہم السلام کے قصص و وقائع میں جو گتھلکیں نظر آتی ہیں ان میں سے سلسلہ کی اس دوسری کڑی سے وہ تسلی و تشفی حاصل کریں گے۔

(۱) سورۂ انبیاء میں کہا گیا ہے۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ — سو ہم نے اس کو چٹیل میدان میں ڈالدیا اور وہ بیمار تھا۔

اور سورۂ ن والقلم میں ہے۔

لَوْلَا اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ

اگر اس کو نہ سنبھالتا تیرے رب کا احسان تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس کو چٹیل میدان میں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈال دیا گیا، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خدا کا احسان شاملِ حال نہ ہوتا تو چٹیل میدان میں ملزم بنا کر ڈال دیا جاتا تو ایک جگہ اثبات اور دوسری جگہ اس کی نفی معلوم ہوتی ہے اور یہ تضاد ہے جو قرآن عزیز میں نہ ہونا چاہیے۔

صاحب روح المعانی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ دوسرے واقعہ میں نبذ بالعراء کیساتھ وھو ملیم کی قید ہے اور پہلے واقعہ میں فقط نبذ بالعراء کا ثبوت ہے لہذا مطلب یہ ہے کہ دریا کے کنارے کھلے میدان میں وہ ڈالے تو ضرور گئے لیکن خدا کے فضل و احسان کے ساتھ نہ کہ ملزم و مجرم بنا کر ذلت و رسوائی کے ساتھ۔ اسلئے پہلی آیت میں اصل واقعہ کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں اس خصوصی صفت کا انکار ہے جس کا شبہ قاری کے دل میں پیدا ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں کتنی مدت رہے؟ اس کے بارہ میں مختلف اقوال منقول ہیں زیادہ رجحان یہ ہے کہ تین روز یا ایک ساعت۔ باقی قرآن عزیز سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں کچھ مدت رہے۔ کتنی مدت رہے؟ اس سے ساکت ہے لہذا بیان کردہ اقوال میں سے جس قول کو قرینہ کے مناسب سمجھا جائے اختیار کیا جائے ورنہ بغیر تعیینِ مقدار نفس واقعہ پر ایمان لانا کافی ہے۔

وللہ الحمد وبہ نستعین

اسلام کا نظریہ اجتماع

عقیدۂ توحید کا مقصد وحید

از مولانا حامد الانصاری غازی

اسلام ان تمام جدید تحریکوں اور نئے میلانات کا سرچشمہ ہے جن کا تعلق زمانۂ حال کی تمدنی گلکاری سے ہے اور جس پر ہماری دنیا کے موجودہ ترقی پسند دماغوں کو ناز ہے۔ اسلام کا اجتماعی تصور دنیا کے اُن قیمتی خزانوں میں آخری اور مکمل اضافہ ہے جو زمانہ کے عقلی رجحانات اور ذہنی تصورات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے ہیں۔ اور آج پورے طور پر ہماری دسترس میں ہیں۔

اجتماعیات کے اکثر و بیشتر نظریے اس وقت دنیا کے سامنے آچکے ہیں۔ دنیا میں اس وقت کروڑوں مسلمان ہیں اور وہ ان نظریوں سے اگر کسی ایک منزل میں ایک نوعیت سے وابستہ ہیں تو کسی دوسری منزل میں اُلجھ رہے ہیں لیکن جب ایک مسلمان تمام ذہنی اور فکری الجھنوں سے آزاد ہوکر غور کرتا ہے تو اُسے سب سے پہلے اپنے مذہب کو اجتماعی مذہب ماننا پڑتا ہے۔ اور پھر عقیدہ کے درجے میں یہ اعلان کرنا پڑتا ہے۔

۱۔ اسلام انسانی وحدت کا بانی ہے، ایسی وحدت کا جو براہ راست عقیدۂ توحید سے پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ اسلام بنی نوع انسان کی تقسیم و تفریق کے خلاف ہے اور تمام مذاہب کو ایک مذہبی

سرچشمہ پر پہنچا کر انسان کی فکری تنظیم کا فرض انجام دیتا ہے۔

۳۔ اسلام ایک برادری ہے جو ہزار قومیتوں کی جگہ ایک قومیت (عالمگیر انسانی قومیت) قائم کرتی ہے اور دنیا کی مختلف نسلوں اور طبقوں کو ایک عجیب و غریب خاندان یا مجلس اقوام کی صورت میں جمع کر دیتی ہے۔

۴۔ اسلام اجتماعیات کا ایک جامع قانون ہے اور کل بنی انسان کے لیے ہے۔ اسلام ایک عظیم جد و جہد اور ایک عظیم الشان تحریک ہے جس کا مقصد معاشی رسوم اور غلط قسم کے مذہبی رواجوں کو ختم کر کے تمام دنیا کو ایک زبردست اصلاحی اور عمرانی انقلاب کی طرف دعوت دیتا ہے۔

ایک گزشتہ اشاعت میں عقیدۂ توحید سے بحث کرتے ہوئے اسلام کے متعلق جو کچھ پیش کیا گیا تھا، سطور بالا کو اُسی کا خلاصہ اور ضروری اختصار سمجھنا چاہیے

اجتماعی حجت

قرآن کا اعلان ہے کہ تکمیل دین کی تاریخ آخری صورت میں مکمل ہو چکی ہے۔ پروردگار عالم جس نعمت عظمیٰ کو عام کرنا چاہتا تھا وہ منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ قرآن جو ہماری زبان میں کتاب توحید ہے اور جس کا ہر صفحۂ توحید کی شاہکاری اور اُس کے نقش و نگار کی گلکاری سے آب و رنگ پائے ہوئے ہے۔ انسانی ناموس سے عام خطاب کرتا ہے۔

"تمام نسل انسانی سُن رکھے کہ حجت پوری ہو چکی ہے، دلیل اپنا کام کر چکی ہے۔ پروردگار بُرہان کو ظاہر کر چکا ہے۔ روشنی کا مینار صاف طور پر منور نظر آ رہا ہے۔"

"جو لوگ یقین کی آنکھ سے اللہ کو دیکھ رہے ہیں، اللہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اللہ کو پختہ طور پر اپنی زندگی کے لیے اجتماعی مرکز قرار دے چکے ہیں اُن سے رحمت خدا قریب ہے، اُن کے

لیے خدا کا فضل ہے۔ اور ان کے لیے ہدایت کی راہ ہے۔ صراطِ مستقیم کی طرف"۔

قرآنِ حکیم کے اصل الفاظ دیکھیے اور غور کیجیے کہ ایک بیش قیمت مقصد کے لیے کس قدر قیمتی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ خطاب عام ہے، مقصد خاص، اظہار و بیان کی حکمت خاص ہے، تشریح و تعبیر کا انداز عام۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا. فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا

یہاں دو باتیں واضح صورت میں موجود ہیں۔

۱۔ انسانی فطرت کے لیے جو حجتیں اور دلیلیں وحی الٰہی کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہیں۔ ان کا مقصد ایمان باللہ یعنی اللہ کی ہستی کا یقین پیدا کرنا ہے۔

۲۔ اللہ کا یقین، محض یقین کے درجہ میں نہ ہونا چاہئے بلکہ زندگی میں صراط مستقیم اور سیدھی سچی راہ کے حصول کا حق پیدا کرنے کے لیے اس یقین کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ انسان کا ضمیر یہاں آکر ٹھہر جائے کہ اللہ کی ذات ہی زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز محکم ہے اور وہی قابل اعتصام ہے۔ یہی قرآن سے جو علم حاصل ہوا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام ایک تخلیقی اصل ہے یعنی اسلام موجود ہے اور آغاز تخلیق سے ہے وہ آغاز میں جو کچھ تھا آج تکمیل دین اور تشریح احکام کے اعتبار سے کچھ اس سے بھی زیادہ ہے، مگر مختلف نہیں ہے۔

مومنین و منکرین

یہ بات ہمارے لیے قابل غور ضرور ہے لیکن ہمیں اپنی راہ سے جدا نہیں کر سکتی کہ دنیا کی آبادی کا ایک حصہ اس وقت تک اس منزل پر نہیں پہنچ سکا جہاں ہم تیرہ سو سال سے ہیں اور

بھان انسانیت کا حقیقت رس دماغ انسان کی پیدائش کے وقت سے پہنچا ہوا ہے۔ ایک سچے مسلمان کے ضمیر کے اطمینان کے لئے پہلے اور آخری درجے میں یہ کافی ہے کہ وہ دنیا میں ایک کارفرما قوت کو موحدانہ رنگ میں تسلیم کرتا رہے اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے لیے کام کرنے پر آمادہ رہے۔ اگر منکر طبیع اور کافر دل انسانوں کا کوئی طبقہ اپنی فطرت کے جوہر عالی کو بلند پروازی کے دائرۂ عالی سے پستی اور گراوٹ کی تشبیہی منزل کی طرف لیجانا چاہتا ہے تو اس کے متعلق توحید ہی کے قانون کی زبان میں کہا جائیگا۔

۱۔ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ جو شخص سیدھی راہ اور سچی رہنمائی کو قبول کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کی بھلائی اور بہتری کے لیے قبول کرتا ہے۔

۲۔ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔ اور جو شخص ہدایت اور روشنی کے مینار کو دیکھنے کے باوجود اپنے جہاز کو کفر و انکار کی چٹان سے ٹکرانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ راہِ مستقیم سے ہٹ کر ایک گمراہ انسان کی جگہ لیتا ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فخر یہ ہے کہ ہم موحد ہیں اور توحید ہمارے سینوں کی امانت ہے، ہم اسلام کی سرگرمیوں میں جس شئے کو سب رس اور ہمہ گیر پاتے ہیں اس کا اجتماعی رجحان بناوٹ کے ساتھ نہیں بلکہ حقیقی طور پر تمام دنیا کی وحدت کی طرف ہے۔ دنیا توحید کی اس اصل کو آج نہ سہی کل ماننے پر مجبور ہوگی۔ انکار کرنے والی قوتیں اپنے مخالف احساس کی بنیاد پر اس رجحان کو مسلمان کے دل کا چور سمجھ سکتی ہیں لیکن مسلمانوں کی اُمیدوں اور ارادوں کے سمندر میں جو طوفان نظر آتا ہے اُس کی مثال اُس جوار بھاٹے کی طرح ہے جس نے موسم کی شدید مزاحمتوں اور ہوا کے مخالف طوفانوں، آج اور کل کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود اپنے سینے کے سچے موتی کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایک مسلمان ایک سچا مسلمان یہ چاہتا ہے اور بغیر شک وشبہ یہ چاہتا ہے

کہ تمام دنیا ایک مذہبی نصب العین پر جمع ہو جائے۔

مسلمان کی نظر میں توحید ایک صداقت ہے اور وہ اپنی جگہ اس صداقت پر مطمئن ہے سچائی کو سچائی ماننے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم دنیا کی نظر کے آسمان پران ستاروں کو دیکھیں جو ہوا اور فضا کی موجودگی کے باوجود گم رہیں اور کجروی کو اپنے لیے کافی سمجھتے ہیں اگر ہم اپنی آنکھوں سے ہدایت کے پردہ پر روشنی کو دیکھ رہے ہیں اور ہمیں اس روشنی میں حقیقت کا چہرہ صاف نظر آرہا ہے تو ہم دنیا کے سامنے آنے اور ذکرِ حق کا پیغام دینے کے لیے کسی نئے معجزے کا انتظار نہیں کرینگے بلکہ جب ہمیں موقع ملیگا تو ہم اپنے دل کے نوشتوں کو صاف زبان میں دنیا کے سامنے پیش کرینگے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دینگے کہ توحید کا عقیدۂ عظیم دنیا کے جسم میں روح کی طرح کارفرمائی کا حق رکھتا ہے اور دنیا کی ابتداء سے اس وقت تک خدا کے نیک نہاد پیغمبروں کی معرفت اہل دنیا کے قلوب میں جگہ حاصل کرتا رہا ہے۔

نسل انسانی اور توحید۔

حضرتِ آدمؑ کے عہد سے ظہور قدسی تک ہر زمانہ میں انبیاء آتے رہے اور برابر توحید کا پیغام دیتے رہے۔ قرآن اسی سلسلہ میں عوام کے دو طبقوں کا ذکر کرتا ہے۔ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ (ان میں سے ایک جماعت میں وہ لوگ ہیں جو ایمان پر قائم رہے اور دوسری جماعت میں وہ افراد جنہوں نے کفر اور انکار کو اختیار کیا)

قرآنِ حکیم کی، ابتداء ہی میں نسلِ آدم کو توحید کی طرف عام دعوت دی گئی ہے اس دعوت میں عالمِ خلق کا ذکر ہے، انسانی پیدائش کا تذکرہ ہے۔ زمین و آسمان کے ایک نظام کو حجت کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور آخر میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ایک جملہ میں شرک کو اس طرح محدود کر دیا ہے کہ انسان پر ہر طرف سے شرک کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

قرآن علم و تحقیق کا کتنا اچھا اسلوب اختیار کر کے کہتا ہے :-

"اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ اُس کو پرستش کا مقصود و منشاء قرار دو دیکھو وہی ہے جس نے تم کو اور تم سے پہلے انسانی افراد کو پیدا کیا۔ کاش تم اس حقیقت کو سمجھ سکو کہ تمہاری پیدائش کا مقصد خدا ترسی تقویٰ اور نکوکاری ہے وہ بے خبر ہستی کی ذات ہے جس نے زمین کو فرش بنا کر بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنا کر بلند کر دیا ہے۔

پھر یہ تو دیکھو کہ اس نے پانی برسا کر تم کو کتنا فائدہ پہنچایا۔ تمہارے لیے پھول اور پھل پیدا کیے اور اُنہیں تمہارے کھانے کی چیز بنایا۔ یہ سب اس لیے تاکہ تم اللہ کے مقام الٰہیہ کو علم و بصیرت کی نظر سے دیکھو اور کسی دوسرے کو اس کا شریک اور اس کا ہمسر و ہمپایہ نہ بناؤ کیونکہ تم خود حقیقتِ توحید کا علم رکھتے ہو!

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ

شرفِ توحید اور جرمِ شرک

قرآن نے بار بار اس امر کو ظاہر کیا ہے کہ ہماری دنیا کا ایک نظام ہے اور اس نظام کا مرکزی نقطہ توحید کا اقرار اور شرک سے انکار ہے۔ جس طرح مذکورہ آیت میں آخری طور پر فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا پر زور دے کر یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ اللہ کا کوئی ہمسر نہیں اسی طرح قرآن میں بہ شانِ عمومیت یہ تعلیم بھی موجود ہے :-

(۱) وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا۔ اللہ کی پرستش کرو اور اُس کے لیے ادنیٰ درجہ میں بھی

شرک کو روا نہ رکھو۔

(۲) إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ میں مامور ہوں کہ یہ کہوں کہ میں اولین مسلمان ہوں، تو مشرکین میں داخل نہ ہو (الانعام)

(۳) إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرسکتا۔ شرک کے علاوہ دوسرے گناہوں کو معاف کردیتا ہے جس کو چاہتا ہو۔

(۴) وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا۔ جو شخص توحید کے عقیدہ سے علحدہ ہوکر شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ گمراہی کی بعید ترین راہ پر پہنچ جاتا ہے۔

(۵) إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک دنیائے انسانیت کے لیے ایک بڑی زیادتی ہے۔

(۶) وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اور کافر ہی ظالم ہیں۔

(۷) مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ، جو شخص ایمان کو کفر سے بدل ڈالتا ہے، لاریب راہ راست سے گمراہ ہوجاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا مقصد یہ ہے کہ شرک اختیار نہ کرو، مشرکوں میں داخل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کریگا۔ شرک زبردست گمراہی ہے، شرک بڑی زیادتی ہے۔ توحید کے منکر کافر ہیں اور کافر ظالم ہیں۔ جو شخص ایمان کو کفر سے بدل ڈالتا ہے وہ سیدھی راہ کو چھوڑکر غلط راہ اختیار کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم توحید پر جس قدر بھی زور دیتا ہے اس کی اجتماعی اصل یہ ہے کہ دنیا جب توحید کو اختیار کرلیتی ہے تو انسانی وحدت ضرور بروئے کار آتی ہے! انسانی ناموس زندہ ہوجاتا ہے۔ انسان کا شرف ومجد بڑھ جاتا ہے عام خیالات میں ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ نظر میں بلندی اور مساوات ظاہر ہوتی ہے۔ روح ایک بلند وبرتر ذات کے علاوہ کسی کے سامنے

ہیں جھکتی۔ اس کے برعکس پوری قوت اور صحت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی تاریخ کے جس زمانے میں بھی توحید کے مرکز اجتماعی سے علیحدہ ہوکر شرک میں مبتلا ہوتی ہے اسی زمانہ میں زندگی کا شیرازہ اجتماعی درہم برہم ہوجاتا ہے۔ زندگی اپنے تمام مظاہر خارجی میں ایک قسم کا انحطاط محسوس کرتی ہے، اتحاد اور امن باطل ہوجاتا ہے، مذہب کو زوال شروع ہوجاتا ہے اور سلطنت کے نظام میں رخنے پڑنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ توحید کا زمانہ زندگی کی تنظیم و توحید کا دور ہوتا ہے اور شرک کے دور میں زندگی کے اجزا متفرق اور منتشر ہوکر انسان کی بدبختی اور پستی کو نمایاں کردیتے ہیں۔

قرآن شرک کو ظلم عظیم قرار دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ شرک ناقابل معافی جرم ہے اسلامی اجتماعیات کے امام اور عصر حاضر کے مشہور شارح قرآن علامہ سید رشید رضا مرحوم قرآن کے اس اعلان کے حق میں دلیل پیش کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الشرك فی نفسہ ھو منتھی فساد الارواح وسفاھة الانفس[1] یہ اس لیے کہ شرک فی نفسہ روح کے فساد اور نفس انسانی کی انتہائی پستی کو ظاہر کرتا ہے۔

جب ہم توحید کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس دنیا کی ہر شئے انسان کے لیے ہے اور انسان ایک خدا کے لیے ہے۔ انسان اشرف ہے اور دنیا کی ہر شئے سے اشرف ہے مگر شرک انسان کے درجے کو گرا دیتا ہے اور اس کی جبین شرف کو حقیر تراشیدہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کردیتا ہے جب انسان کی روح کسی جامد پتھر، انسان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اور گھڑے ہوئے خدا، آسمان کے عناصر اور زمین کی پستیوں کے معبودانِ باطل کے سامنے جھکتی ہے تو اس کو شرک کا نام دیا جاتا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے مقام شرف سے گر کر اپنی جمعیت کے حقیقی مرکز کو ضائع کر رہا ہے۔

[1] تفسیر المنار

انسانی فطرت اور انسانی وحدت

اسلام توحید سے انسانی وحدت کو پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی وحدت کا یہ اسلامی تصور جس اجتماعی شعور پر مبنی ہے ہم اس کو انسانی فطرت کے مغائر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسلام سب سے پہلے نفس انسانی اور انسانی فطرت کو تسلیم کرتا ہے، خدا نے انسانی فطرت کو بنایا ہے۔ اُس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہ استعداد عطا کی گئی ہے کہ خدا کے قانون کے مطابق چلے۔

قرآن حکیم میں تصریح ہے:-

(۱) فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (روم)

وہ اللہ کی فطرت ہے جس فطرت پر انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے خدا کا قانونِ فطرت انقلاب و تغیر سے بدل نہیں سکتا فطرت کا یہی مطمح نظر ایک مستقل اور محکم مذہب ہے۔

قرآن اسی نکتہ کو ایک اور عنوان سے سمجھاتا ہے اور توحید کے کلمہ کو بلند کرتا ہے۔

وَمَا لِیَ لَا اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ (یٰسٓ)

ایک انسان شرک سے علیحدہ ہو کر بول اٹھتا ہے میں اتنا پست تو نہیں ہوں کہ میں اس معبود کو نظرانداز کر دوں جس نے مجھ کو فطرت خلق پر پیدا کیا ہے۔

صحیح بخاری جو کتاب اللہ کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب ہے، دوسرے الفاظ میں انسانی فطرت پر گواہی دیتی ہے۔

عن ابی هریرة مامن مولود الا یولد علی الفطرة ابو ہریرہ روایت فرماتے ہیں کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسلام میں انسانی فطرت کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ قرآن خود اسلام کو دینِ فطرت قرار دیتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے دین فطرت تمام انبیاء کا دین ہے۔ چونکہ ہر رسول توحید کا پیامبر رہا ہے۔ اس لیے آغاز تحقیق سے آج تک انسانی تنظیم کا تصور اسلام کے ساتھ رہا ہے۔ احکام الٰہی کا جو

مجموعۂ قوانین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ضابطۂ پیغمبری رہا ہے وہی حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء کے لیے اصول قرار دیا جاچکا ہے جس طرح نبی آخر الزماں کو توحید کا حکم ملا ہے اُسی طرح ماضی میں اقوام و ملل کو توحید کی تعلیم دی گئی ہے اور تفریق سے احتراز کرنے کی ہدایت کی گئی۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا۔

تمہارے لیے بھی مذہب کا وہی قانون ہے جو نوح کے لیے تھا اور جو تمہارے لیے قانون قرار دیا گیا ہے یہی قانون ابراہیم اور موسیٰ کو دیا گیا تھا تم مامور ہو قیام دین کے فرض کو پورا کرو اور دفطرت سے علیٰحدہ ہوکر منتشر اور آپس میں منقسم نہ ہو۔

انسان کا نظریۂ اجتماع

قرآنِ حکیم انسانی فطرت کو درجہ امتیاز عطا کر کے توحید و تنظیم کا جو اصول پیش کرتا ہے اس میں عالمگیر اجتماعی اصول بننے کے لیے پوری لچک ہے۔ انسانی وحدت کا تصور اسلام کے علاوہ دوسری شکلوں میں دنیا پر حاوی رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ دوسرے نظریے عموماً عقل کی خامکاری کی وجہ سے اصل مرکز تک نہیں پہنچتے اور اسلام نے اپنے اجتماعی نظریہ کو ان تمام الجھنوں سے آزاد کر دیا ہے جنھوں نے انسان کو غیر طبعی معتقدات میں گرفتار کر رکھا تھا۔

مشہور جرمن مقنن جے کے بلنچلی عام نظریۂ اجتماع سے بحث کرتا ہے۔

"اعلیٰ مذہبی احساس کے لیے بنی نوع انسان کی وحدت پر ایمان لانا ضروری ہے مہذب سلطنتیں نوع انسان کی اجتماعی یکجہتی کو مانتی ہیں اور یہ تسلیم کرتی ہیں کہ پست درجے کی نسلوں اور قبیلوں تک میں انسانی فطرت موجود ہے۔"[1]

ژان ژاک روسو جس کو انقلاب فرانس کا روحانی باپ کہا جاتا ہے اور جس کے فلسفہ کو

---

[1] نظریۂ سلطنت جے کے بلنچلی صفحہ ۸۱

انقلاب وتجدد کے اس دور میں خاص اہمیت حاصل ہے انسانی وحدت کو ایک تخلیقی ضرورت قرار دیتا ہے۔ روسو کہتا ہے :-

"انسان کے لیے اب نئی قوتوں کی تخلیق ممکن نہیں بلکہ اس کے پاس جو قوتیں ہیں وہ انہیں ہی اجتماعی صورت دیکر کام میں لاسکتا ہے"[1]

انگلستان کا مشہور شارح قانون لارڈ برائس اپنی کتاب موڈرن ڈیماکریسی[2] میں انسانی جمعیت کے تصور کے ارتقا کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی ارتقائی حالت کو تدریجی قرار دیتا ہے۔ لارڈ برائس کی تصریح ہے کہ انسانی جمعیت کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ

"جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا آبادیاں بڑھتی گئیں چھوٹی چھوٹی بستیاں آپس میں متحد ہوتی گئیں، رفتہ رفتہ بڑے بڑے فرقے بنے اور فرقوں سے قومیں بنیں انسان کی یہ اجتماعی تنظیم اس وقت رونما ہوئی جب انسان وحشیانہ زندگی سے منظم طریقۂ تمدن کی طرف ترقی کر رہا تھا"

بلنچلی، روسو، برائس اُس نظریۂ اجتماع کے وکیل ہیں جو انسان کے دماغ کی پیداوار ہے اُنھوں نے اجتماعیات پر جو رائیں پیش کی ہیں اُن کا تعلق صرف آج سے نہیں ہے بلکہ وہ دورِ ماضی کی بھی اسی طرح شرح پیش کرتی ہیں جس طرح آج کے نظریۂ تنظیم کی لیکن اسلام اسی اجتماعی تصور کو ایک فطری عقیدہ کی بنیاد پر فطری مذہب بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لارڈ برائس کا قلم آبادیوں سے بڑی بستیوں تک اور فرقوں سے قوموں تک پہنچ کر رُک جاتا ہے لیکن اسلام آگے قدم اُٹھاتا ہے وہ بڑی بڑی بستیوں سے ایک مکمل عمرانی دنیا تیار کرتا ہے اور بڑی بڑی قوموں کو توحید کی حاکمیت کے ماتحت ایک بڑی قوم کی صورت دینا

---

[1] معاہدۂ عمرانی (روسو) [2] دیکھو فصل ۱۲۔

چاہتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام ایک ایسی تنظیم کو منظور کرتا ہے جس کا رجحان پہلے ہی لمحہ میں خدا کی طرف ہو سکے، دوسرے نظریے اس خوبی سے خالی ہیں۔ روسو ایک مرحلہ پر اپنے نظریہ کی خامی کو محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"انسان کی تخلیقی قوتیں اس وقت تک بیکار ہیں جب تک انہیں کام میں لانے کے لیے ایک قوت محرکہ نہ موجود ہو اور جب تک ان میں ہم آہنگی اور یکجہتی نہ پائی جائے"

اگر روسو اس مرحلہ پر خدا کا نام لینے کی جرأت کر سکتا تو ہم اس کو ایک ایسے یقین کی منزل میں دیکھتے جہاں پیغمبرانِ عالم کے صادق پیروکار اب سے قبل نظر آچکے ہیں اور جو اپنے کیریکٹر اور توحید کی تعلیم سے مطلوبہ ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کر کے دنیا کے سامنے سرخرو ہو چکے ہیں

عالمگیر انسانی تنظیم اور انسان

درحقیقت ایک مسلمان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ انسان، انسانی وحدت کی ضرورت کو ایک واقعی ضرورت تسلیم کرنے کے بعد توحید کے دائرہ سے کس طرح علیحدہ رہ سکتا ہے اور خدا کو زندگی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے دین فطرت کے اقتدار سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ توحید اپنی جگہ ایک مستقل اور وحید مقصد ہے لیکن یہ امر افسوسناک ضرور ہے کہ دنیا کی ایک بڑی آبادی اس وقت تک اس سے علیحدہ ہے اور فرزندانِ اسلام کو ابھی اس عقیدۂ عظیم کے لیے ساری دنیا کو فتح کرنے کا عزم کرنا ہے۔

ہم اس مرحلہ پر جب کبھی دنیا کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں رنج ضرور ہوتا ہے اور ہم دکھ کے ساتھ اس کو محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی اکثریت نے آج تک اسلام کے اجتماعی نظام اور نظریۂ اجتماع کو کیوں نہیں سمجھا۔ اور اس وقت تک کیوں اُن نتائج سے آگاہی نہیں حاصل کی جو عقیدۂ توحید کی رو سے خدا کو ایک جاننے اور ایک ماننے سے پیدا ہوتے ہیں۔

سائنس داں ہمیں بتلاتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ ہم ان کی باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ ہماری نظر کا آسمان اور اس کے جملہ عناصر ایک نظام شمسی کے ماتحت ہیں یقین کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور انسان کا یقین اُس کو قبول کرتا ہے کہ کائنات کے اس نظام میں ایک سورج ہے، یہ سورج ایک کارفرما وجود رکھتا ہے۔ اس کے گرد متعدد سیارے، بہت سے تارے کئی چاند، ہماری زمین (جس میں دو ارب انسان آباد ہیں) ہمارا چاند جو ہماری دنیا کو ٹھنڈی روشنی پہنچاتا ہے، اس طرح گھوم رہے ہیں جس طرح زندہ انسانوں کی ایک بڑی جماعت کسی خاص مقصد کا عشق دل میں لے کر ایک محور پر گردش کرتی ہے، کتنے تعجب کی بات ہے عقل وخرد سے محروم۔ ان ہزارہا مادی عناصر کے بیے تو یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک واحد نظام کی گرفت میں ایک واحد تاجدار کے ماتحت ایک واحد سلطنت میں اپنے روزمرہ کے فرائض ادا کر سکتے ہیں اور یہ بات انسان کی عقل میں آجاتی ہے اور ایک مستقل "مذہب عقل" کی اساس بن جاتی ہے لیکن انسان جس نے خدائے واحد کی مہربانی سے شرف وناموس کا اعلیٰ درجہ حاصل کر کے تفکر و تدبر کے مقام پر پہنچ کر امامت اقوام کا منصب حاصل کیا ہے اور جو عقل و دانش کی وجہ سے دلیل و برہان سے روشناس ہے جب اپنے لیے عالمگیر تنظیم کے اصول پر غور کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کا ایک نظام ہے اور اس نظام کا مرکز ایک ایسے قادر اور واحد آمر کی ذات ہے جس کو قریب قریب تمام انسان کسی نہ کسی نوعیت سے مانتے ہیں تو یہ آسان اور عقل میں آنے والی بات انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہے۔

انسانی وحدت اور توحید کا انکار

انسان کی وحدت اگر ایک اچھا مقصد ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا بروئے کار آنا خود انسان ہی کے لیے مفید ہے اور اگر اسلام اس مقصد کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ کر کام کرتا ہے تو

اس کا یہ اقدام انسان ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔

اگر ہم اسلام کے مقابلہ میں انکار کی قوت کو کارفرما دیکھتے ہیں تو ہمیں تعجب ضرور ہوتا ہے یہ بات یقیناً رنج میں اضافہ کرتی ہے کہ انسان کی تاریخ قدیم، دورِ جدید کی طرح عقیدۂ توحید کی قطعی بالادستی اور عالمگیر حاکمیت سے خالی ہے۔ ہم انسانی تاریخ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں، کھول کر دیکھتے ہیں صفحے کے صفحے الٹتے ہیں اور ہر صفحہ کی ایک ایک سطر سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ انسان ماضی میں کیا تھا اور اس کا ماضی کیسا تھا۔ انسانی جمعیت کی شیرازہ بندی کس طرح ہوتی اور زمانہ قدیم کی سوسائٹی اپنے مختلف دوروں میں فسنہ و خیال سے گذر کر عملاً کس حد تک عالمگیر وحدت کی طرف مائل ہوئی۔ اگر مائل تھی تو اس کے اس میلان کا مرکز اور اس رجحان کی بنیاد کونسا قانون تھا اور اس بنیاد میں کس قسم کا اصول کارفرما تھا؟

جب ہم تاریخ کے سامنے یہ سوال پیش کرتے ہیں تو ہمیں اس کا جواب، اُس جواب سے بالکل مختلف ملتا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ تاریخی زمانہ سے لے کر اور اس زمانہ تک تاریخ ہمیں جواب دیتی ہے اور علم و آگاہی کے دروازے ہمارے لیے کھول دیتی ہے۔ ہم تاریخ کے صفحات پر گزشتہ واقعات کو دیکھتے ہیں اور اس طرح دیکھتے ہیں کہ ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا ہم آج کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ہمیں انسانیت کے پردہ پر ایک حقیقی روشنی کی جگہ بہت سی روشنیاں نظر نہیں آتیں بلکہ نور کے پردہ پر چند سیاہ تصویریں نظر آتی ہیں جن میں سے ہر تصویر الگ الگ ہے۔ ان میں سیاہی کی نمود جس قدر یکساں ہے، اسی قدر ہر تصویر اپنے مجموعی نقوش کے لحاظ سے مختلف ہے۔

بصیرت کی آنکھ دیکھنا نہیں چاہتی مگر مجبوراً دیکھتی ہے کہ انسان ایک خدا کی جگہ خدا کی مخلوق کو پوج رہا ہے کہیں انسان خدا ہے کہیں خدا کا بیٹا۔ کہیں پتھر پروردگار ہے تو کہیں پتھر

کی مورت معبود کہیں خدا کی جگہ دریاؤں کی جے ہے تو کہیں پیپل کے پتوں کو دھنباد ہے کہیں خیر وشر کے محرکات میں خدا کی تلاش ہے اور یزدان و اہرمن کا مقابلہ ہے تو کہیں چاند دیوتا اور سورج مہادیوتا انسان کے سر عقیدت پر سوار ہیں۔

جس طرح توحید کا قدرتی نتیجہ دنیا کی تنظیم اور عالمگیر انسانی وحدت ہے اسی طرح توحید سے روگردانی کا بالکل قدرتی نتیجہ دنیا کے شیرازہ کی درہمی برہمی اور دنیا بھر کے انسانوں کی تقسیم وتفریق، واضح اختلاف اور کھلا ہوا انتشار ہے تاریخ اپنے ہر دور میں اس دعوی کی دلیل پیش کرتی ہے کہ توحید سے انسانیت کی توحید کا ظہور ہوتا ہے اور توحید کے عقیدۂ عظیم کا انکار کرنے سے انسان اپنے درجہ سے گر کر لا انتہا تقسیموں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے قدیم زمانہ میں انسان نے جب کبھی توحید کے اصول سے سرکشی کی تو ہم نے دیکھا کہ انسان مختلف قوموں، ملتوں، مذہبوں، مسلکوں، طبقوں اور سوسائٹیوں میں بٹا ہوا ہے۔ اگر کسی جگہ ہزار انسان ہیں تو ان کی سو جماعتیں بنی ہوئی ہیں۔ اگر بیس مذہب ہیں تو وہ ایک سو بیس فرقوں میں تقسیم ہیں۔ اور اگر پچاس فرقے ہیں تو ہزار طرح کے خیالوں کی وجہ سے باہم مختلف اور آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

انسانی زندگی کی تاریخ

انسان کی تخلیق اور انسانی زندگی کے مختلف زمانوں اور انسان کی عمر کے متعلق قدیم اور جدید نظریوں میں کافی اختلاف ہے، اس لیے صحیح طور پر اس بات کا تاریخی اندازہ پیش کرنا دشوار ہے کہ انسان کتنے ہزار سال قبل پیدا ہوا، اپنی پیدائش کے بعد مختلف دوروں میں کس کس طرح اجتماعی زندگی بسر کرتا رہا اور خدائے پاک کے متعلق ہر دور میں کس کس قسم کے خیالات پر قائم رہا۔

سائنس کی تحقیقات بھی اس خاص مرحلہ پر ہماری یقینی امداد سے قاصر ہیں۔ کیونکہ سائنس

تحقیق کے درجۂ کمال پر پہنچنے کے باوجود قدرت کے تاریخی تصرفات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے اور قیاس کی منزل پر پہنچ کر بارہا اپنے عجز کا اعتراف کرچکا ہے۔ سائنس کے روز روز کے بدلنے والے نظریے انسانی عقل کے ادعا پر اکثر ہنستے رہتے ہیں۔ نظریوں کا قائم ہونا اور ٹوٹنا مسلمات کا یقین بنکر سامنے آنا اور انکار کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جانا وہ امور ہیں جو قدرت کی بالادستی کو ثابت کررہے ہیں اور اس کی وجہ سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کائنات کے عناصر پر قبضہ حاصل کرنے والے انسان کو خود اپنی صحیح تاریخ پر بھی دسترس حاصل نہیں ہے۔

نئے آثار کے کشف و اکتشاف کے باوجود ہمارے پاس کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی بنا پر ہم یہ دعویٰ کرسکیں کہ انسانی زندگی اور تاریخ و تمدن کا آغاز موجودہ دنیا کے کس حصہ سے ہوا ہے۔ وہی لوگ جو کل تک طوفان نوح کے منکر تھے آج قرآن کی تائید کررہے ہیں اور علم الارض کے پیمانے سے طوفان کی وسعت کو ناپ رہے ہیں۔ انسانی تمدن اور تنظیم کے آغاز میں آج بھی اختلاف ہے علمائے آثار اس باب میں مختلف الرائے ہیں۔

بطلیموس اور میلاد مسیح سے قبل کے علمار جغرافیہ انسان کی عمر سے بحث کرتے ہیں مگر ان میں اور ان کے بعد آنے والے علمار میں قیاس و تجربہ کے معاملہ میں واضح اختلاف ہے بطلیموس کے قیاس کی رو سے انسانی زندگی کو پینتیس ہزار سال ہوئے ہیں۔ ڈیوڈور۔ جو میلاد مسیح کے زمانہ کا یونانی مؤرخ ہے تینتیس ہزار سال کا عدد پیش کرتا ہے۔ کلدانی مؤرخ بیروز جو تین صدی قبل مسیح کے علمار میں سے ہے طوفانِ نوح سے ملکۂ بابل سمیرامیس تک ۲۵ ہزار سال کی مدت قرار دیتا ہے۔

دورِ جدید کے علما، قدیم نظریوں کے مقابلہ میں مختلف اسلوب سے اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ ان کی رائے کا انحصار قیاس، علم، تجربہ، آثار اور آثار کی تحقیقات پر ہے وہ دیکھتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے اجزا منتشر ہیں۔ ہمہ گیر اجتماعی نظام سے محروم اور مختلف صورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بنی نوعِ

انسان ایک تخلیقی وحدت ہے مگر بعد کے تصرفات کی وجہ سے بُری طرح پراگندہ اور متفرق ہے اس وحدت کے اندر نسلوں کا اختلاف ہے۔ زبانوں کا اختلاف ہے رنگوں کا اختلاف اور جسم کے اعضا اور نقش و نگار کا اختلاف نمایاں ہے۔ پھر جسم کے اختلاف میں لمبی اور چپٹی ناکیں مختلف قسم کے بال اور طرح طرح کی کھوپریاں آتی ہیں، جن کو چار ہزار سال قبل کے مصری آثار اور جدید تجربہ کی روشنی میں علیحدہ علیحدہ خصوصیات کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔

علماءِ عصر کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے اس اختلاف کے لیے بہت بڑی مدت درکار ہے جس کا احاطہ کرنا صرف علم و قیاس ہی سے ممکن ہے۔ انگلستان کی رائل اکاڈمی نے مسٹر آرز کو انسانی عمر کا پیمانہ بنانے کے لیے مقرر کیا تھا اُنھوں نے مصری آثار کی امداد سے کام لیا اور فیصلہ کیا کہ انسان کی عمر تیس ہزار سال ہے[1]۔ قدیم اور جدید علماء کے یہ نظریے عرصہ سے نظام عالم میں کار فرما ہیں انسانی عمر کی طرح انسانی اطوار کے تاریخی زمانوں کے متعلق بھی ان میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہ اختلاف ہمارے مقصد کے خلاف نہیں بلکہ معاون ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی میں جس قدر اختلاف زیادہ نمایاں ہوگا اسی قدر اس کا ردعمل وحدت کی طرف ہوگا اور ہم توحید کے مقصد کو اُسی قدر کامیابی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرسکیں گے۔

اس مرحلہ پر ہمیں اگر بحث کرنی ہے تو صرف انسانی زندگی سے بحث کرنی ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ اسلام سے پہلے توحید کا عقیدہ کس قدر کمزور تھا اور توحید اقوام کا رشتہ کس طرح ہاتھ سے جاچکا تھا اور جب اسلام دنیا میں جہانگیری اور جہاں بانی کی عالمگیر قوتوں کو لے کر ظاہر ہوا تو اُس نے کروڑوں انسانوں کے اختلاف کو مٹا کر اُن کو کس طرح ایک کردیا۔ اس موقع پر ہمیں تاریخ کے اختلافات سے نہیں بلکہ صرف تاریخ سے بحث کرنی ہے۔

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی۔ ج ۲-۱ ص ۷۰۹۔

انسانی اختلاف کا پس منظر

قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی نے جو پانچویں صدی کے اسلامی مورخوں میں سے ہیں اپنی کتاب طبقات الامم میں اقوام و امم کے عادات و اطوار پر تاریخی تصریحات پیش کی ہیں ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا تاریخی پس منظر اختلاف اور مخالفت کے دو دھاروں کی نواکاری سے بھرا ہوا تھا۔ قاضی صاحب اسی اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: (وجدنا ھذہ الامم علی کثرۃ فرقھم و تخالف مذاھبھم طبقتین فطبقۃ عنیت بالعلم وطبقۃ لم تعن بالعلم)

تاریخ قدیم کی یہ تمام قومیں جو مختلف فرقوں، مختلف طبقوں اور مختلف مذہبوں میں بٹی ہوئی ہیں دو بڑی شاخوں میں منقسم ہیں

(۱) ایک شاخ میں وہ قومیں ہیں جن میں قدامت کے ساتھ علم اور تمدن کے محرکات بھی کارفرما ہیں۔

(۲) دوسری شاخ ان قوموں پر مشتمل ہے جنہیں علم اور تمدن کو پورا پورا واسطہ نہیں رہا

پہلی شاخ میں ہندوستانی، فارسی، کلدانی، عبرانی، یونانی، رومی، مصری اور عربی اقوام شامل ہیں۔ دوسری شاخ میں چینی، یاجوج ماجوج، قدیم ترکمان، روسی، بربری، سوڈانی اور حبشی وغیرہ ہیں۔ دوسری شاخ کی اقوام کے متعلق قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ اگرچہ جغرافیائی حالات اور مولد و مدفن کے لحاظ سے ان اقوام کی حالت مختلف تھی لیکن بالعموم جہل، بلادت طبع، عصیان اور طغیان کے اعتبار سے اُن کے کوائف و احوال یکساں تھے۔ پہلی شاخ کی قومیں اپنے دور کی متمدن قومیں ہیں لیکن ان کی مذہبی زندگی توحید سے خالی نظر آتی ہے۔ ان اقوام کے اطوار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں شرک میں مبتلا، توحید کے اعتقادی مرکز سے دور اور انسانی وحدت کے ہمہ گیر تصور سے محروم تھیں۔

ہمارے مخصوص نقطۂ نگاہ سے تاریخ کے قدیم زمانہ میں اقوام کی اعتقادی حالت کیسی تھی اور انسان دنیا کے بعید ترین حصوں میں ایک خدا کے علاوہ خدا کی مخلوق، قدرتی مناظر، مادی عناصر بتوں، مجسموں، پتھروں اور اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کو کس طرح پوجتا تھا اور اُن کے سامنے کس قدر ذلت جہالت اور بے عقلی کے ساتھ سرخم کرتا تھا؟ ہم یہاں اس کی مختصر اور جامع تفصیل کرتے ہیں:۔

(۱) قدیم ہندوستانی | ہندوستانی اقوام زمانۂ قدیم میں کیسی کچھ تھیں اس کا حال ہمیں اس دور میں بجائے خود معلوم ہے۔ مندروں میں بتوں اور پیپل کی شاخوں کی پوجا۔ ہمالہ کے دامن میں گنگا کی پوجا، سڑکوں پر چلتی پھرتی گایوں کی پوجا، رامچندر جی، کرشن جی، ہنومان جی، مہابیر جی، شیوجی، مہادیو اور کالی دیوی کی پوجا۔ شودروں اور کم ذات کے لوگوں کا یہ عقیدہ کہ آسمان کے عناصر خدا کی طرح دنیا کی زندگی میں موثر ہیں۔ اور ان کی پوجا کرنی چاہیے۔

یہی اعتقادات ہیں جو اس زمانہ تک ہندوؤں کی پستی، پست خیالی اور تقسیم و تفریق کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں مشہور مستشرق ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ منوجی کے ورن آشرم کے پست ترین تصورات پر بحث کرتے ہوئے انسانی زندگی کے انتشار پر آنسو بہاتے ہیں۔

"مذہب براہمہ (یعنی ہندو مذہب) غالباً سب سے زیادہ تنگ نظر اعتقادات کا مجموعہ ہے

تاریخی حصہ کے ماٴخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) علامہ فرید وجدی کی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) جلد ۲-۱- ص ۷۰۹ - (۲) طبقات الامم (قاضی ساعد اندلسی متوفی سنہ ۴۶۲ھ مطبوعہ مصر) (۳) فلسفۂ عجم ڈاکٹر اقبال حصہ اول باب اول (The Development of Melaphysia in Pensia) (۴) العقائد۔ استاذ عمر عنایت مصری

(۵) تاریخ ملل شیر محمد افغان کابلی (روسی زبان سے فارسی میں ترجمہ) (۶)

(۶) تاریخ ملل قدیمہ۔ موسیو سنوبس فرانسیسی (ترجمہ انجمن ترقی اردو)

(۷) تاریخ ملل قدیمہ (مطبوعہ کابل) ہاشم شائق افغان نائب صدر علمی اکاڈمی افغانستان)

لہ دیکھو دھرم شاستر منو۔ اشلوک ۱۸۱ تا ۱۸۱ ادھیائے ۱۔

کیونکہ یہ مذہب انسانی سماج کو ایسی لاانتہا ذاتوں میں تقسیم کرتا ہے جن کے درمیان کوئی باہمی ربط ممکن نہیں[1]۔

کلدانی اقوام | آرمینیا کے بلند اور برفانی پہاڑوں سے دو بڑے دریا جنہیں دجلہ و فرات کہتے ہیں، یہ دونوں دو مخالف سمتوں میں بہہ کر آخر میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں جو نشیبی اور وسیع علاقے میں ان دونوں دریاؤں کا سنگم ہے جس کو آج کل عراق کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کلدہ کہتے تھے۔ یہی علاقہ کلدانی اقوام کا تاریخی مرکز تھا۔ تین ہزار سال پرانی اس تہذیب میں تمام ارتقاء کے باوجود کوئی اعتقادی وحدت نہیں تھی جب انسان ایک خدا سے بغاوت کرتا ہے تو اُس کی گردن پر ہزار خداوند سوار ہو جاتے ہیں۔ موسیو سنوبس فرانسیسی لکھتے ہیں کہ کلدہ کے ہر شہر میں ایک خاص خداوند کی پرستش کی جاتی تھی[2]۔ بادشاہ ان خداوندوں کو اپنے سے بالاتر سمجھتے تھے۔ بابل کا حکمراں حمورابی کا ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ میرے خداوند نے مجھ کو شومیر واکد کے ملک کا فرمانروا کیا ہے۔ ایک اور بادشاہ تکلا فالازر خود کہتا ہے "خداوند آشور کے حکم سے میں نے جنگی گاڑیوں اور فوجوں کو جمع کیا"۔

کلدانی تمدن کی یہ تاریخ اختلاف سے معمور ہے۔ اس اختلاف کو خود شاہان کلدہ کی زبان میں سنیے :-

۱۔ "میں نے اپنے خداوند کے حکم سے شہر پر یورش کی۔ وہ تیر جو ایان نامی دیوتا برسا تا ہے اولوں کی طرح برستے رہے"۔

۲۔ "میں نے نصف آدمیوں کو قتل کر ڈالا اور نصف کو غلام بنا لیا، اور اپنے مخالف باغیوں کی کھالیں کھنچوا لیں۔ ان کو دیوار میں چنوا دیا اور بہت سوں کے بدن میں لکڑی داخل کر دی"۔

کلدانیوں کی تفریق اور زبان کے اختلاف کا منظر بھی دیکھیے۔

"بابل کے باشندوں نے آسمان تک بلند برج بنانے کی جسارت کی خداوندوں کو اس پر غصہ آیا اور انہوں نے ان کی زبان میں اختلاف پیدا کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے محروم ہو گئے اس لیے تمام دنیا میں پراگندہ اور منتشر ہو گئے۔"

مصری اقوام | قدیم مصری اقوام میں فرعون کا نعرہ "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ" اور اُس کے پرستاروں کی ایک جماعت کا وجود قرآن شریف سے ثابت ہے۔ فرعون غرق ہو گیا، اور اس کا غرق ہونا یقیناً مذہبِ توحید کی فتح تھی۔ مگر تاریخ نگار لکھتے ہیں کہ قدیم مصری اقوام نے مُردوں کی پرستش شروع کر دی۔ ان مُردوں کا ایک دیوتا تھا جس کے نام سے ہر معبد میں پتھر کی ایک سل پر یہ عبارت لکھ کر رکھی جاتی تھی:۔

"ہم اموات کے خداوند ازریس کو سجدہ کرتے ہیں کہ وہ کھانا جن کو وہ خود استعمال کرتا ہے مردے کی روح کو بھی عطا کرے۔"

انسانی عقل کی گمراہی کا یہ منظر جس کے ساتھ قدیم تمدن کی تائید بھی ہے کس قدر دردناک تھا، اس کو اس زمانہ کے وہ انسان جو قبرستان سے وحشت کھاتے ہیں، اور مرگھٹ تک جاتے ہوئے خوف سے مرے جاتے ہیں بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔

فینیقی اقوام | موسیو سنولیس لکھتے ہیں: "قدیم فینیقی پتھروں اور درختوں کو خدا کا درجہ دیتے تھے اور بعض پتھروں کو خدائی درجہ دے کر انہیں بیت ایل (خدا کا گھر) کہتے تھے۔ ان پتھروں کی عظمت اس سے ظاہر ہے کہ وہ انڈے یا گاجر کے برابر ہوتے تھے۔"

فینیقی حضرت عیسیٰؑ سے سولہ صدی قبل لبنان اور سمندر کے درمیانی رقبہ میں رہتے تھے۔

اہل فارس | فارس کے قدیم باشندوں کا وطن حلوان کے قلہ کوہ سے عراق کے شمال میں پہاڑوں سے شروع ہوتا تھا۔ ماہان، کرخ، دینور، ہمدان، قم، کاشان کے منطقوں سے بلاد آرمینیہ تک اور بحر آذربائیجان سے بلاد خراسان، مرو دہرات اور بلاد سجستان تک ان کا علاقہ تھا۔

تاریخِ قدیم کے علماء یہ تصریح کرتے ہیں کہ اہلِ فارس موحد تھے اور وہ یوذاسف کے دور سے طہورس (تیسرے ایرانی بادشاہ) تک توحید پر قائم رہے اور اس شان کے ساتھ کہ ان کا ملک متحد تھا، ان کی سلطنت منظم تھی اور اُن کی زبان بھی ایک تھی، مگر آخرکار اُنھوں نے توحید کے عقیدہ سے روگشی کی اور مجوسی ہوگئے اور آگ کو پوجنے لگے۔ تاریخ کا بیان ہے اور اس کی صحت کے لیے تاریخ ہی ذمہ دار ہے کہ گشتاسپ (شاہ ایران) کے زمانہ میں مصلح کی حیثیت سے زرتشت کا ظہور ہوا جس نے آتش پرستی کی دعوت دی اور قوم نے اس دعوت کو قبول کرلیا۔

مجوسی اعتقاد کے پانچ ارکان تھے۔ (۱) باری تعالیٰ (جیسا کہ مجوسیوں کا تصور تھا) (۲) شیطان (۳) ہیولیٰ (۴) زمان (۵) اور مکان۔ مجوسیت کا کلمۂ آتشیں یہ تھا کہ دنیا نور اور تاریکی، روشنی اور ظلمت کا مجموعہ ہے۔ چنانچہ ایرانی لوگ توحید اسلام کے ظہور سے قبل تیرہ سو سال تک اسی مجوسی کلمہ پر قائم رہے۔

زرتشت سے قبل ایران دو حصوں میں منقسم تھا، ایک حصہ خیر کو فاعل مختار مانتا تھا دوسرا بدی کو، ایک بھلائی کے معبود کو پوجتا تھا دوسرا شیطان کو اور شیطانی قوتوں کو۔ درحقیقت قدیم ایرانیوں کی یہ پیکار دو قدیم طبقوں کے نزاع کا نتیجہ تھا۔ جو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی تصریح کے مطابق اولاً ایک دوسرے کے ارباب (دیوتاؤں) دیوا اور اہورا کی تحقیر کی صورت میں نمودار ہوا۔ درحقیقت یہ تفرق کا ایک عمل تھا جس نے عقیدہ کے اختلاف کے ساتھ ایک ایرانی شاخ کو دوسرے آریائی قبائل سے علیحدہ کردیا اور بالآخر یہی اختلاف زرتشت کے نظام میں رونما ہوا۔ درحقیقت یہ نزاع عقیدۂ توحید سے علیحدہ ہونے کا قدرتی نتیجہ تھا کیونکہ اعتقادی اور فکری اختلاف کا اثر لازماً انسان کی اجتماعی زندگی پر پڑکر رہتا ہے، جو ایران میں پڑکر رہا۔

زرتشت بدی کے وجود اور خدا کی نیکی میں مطابقت پیدا کرنا چاہتا تھا اُس کے اسلاف نے

کثیر التعداد ارواح صالحہ کی پرستش کی تھی جن کی کثرت کو انہوں نے ایک وحدت میں تبدیل کر کے اس کا نام اہورا رکھا تھا۔ اور دوسری طرف شر کی تمام قوتوں کو یکجا قرار دے کر درج اہرمن اس کا نام رکھا۔ اس عمل توحد کے ذریعہ سے وہ دو اساسی اصولوں تک پہنچا۔ اسی بنا پر ڈاکٹر ہاگ کتا ہے کہ ایرانِ قدیم کا پیغمبر (!) دینیاتی نقطۂ نظر سے موحد اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ثنویہ (یعنی دو قوتوں کو ماننے والا) تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ اس تصور نے ایرانی قوم کو ٹکڑے ٹکڑے اور توحید کے عقیدۂ عظیم کی روح کو پامال کر دیا۔ اس نے دینی توحید اور فلسفیانہ ثنویت (ایک سے زائد قوتوں پر ایمان لاکر) دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی اس میں ایک خلقی کمزوری صاف نظر آتی ہے[1]۔ انسانی گمراہی کا یہ منظر کس قدر افسوسناک ہے کہ ایران میں زمین و آسمان کے نورِ حقیقی اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی جگہ نور کے مادی عناصر کی پوجا شروع ہو گئی مجوسی روشنی کے پوجاری تھے اس لیے ہر نوری شے کو پوجتے تھے۔ آگ چونکہ نور کا سب سے زیادہ بھڑکتا ہوا شعلہ ہے۔ اس لیے اسی درجہ میں اس کو اہمیت حاصل ہو گئی۔

ایرانی تیرہ سو سال تک آتش پرستی کی شریعت پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ نے فارس کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کو اسلام کی مجلس اقوام کا ایک رکن بنا دیا[2]۔

---

[1] فلسفۂ عجم ڈاکٹر اقبال، حصہ اول، باب اول۔
[2] طبقات الامم صفحہ ۲۲۔

سحر و صابئیت تاریخ کی روشنی میں

مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی فاضل دیوبند

(۴)

سحر بابل | امام ابوبکر اقسام سحر کے ذیل میں فرماتے ہیں :۔

منہا سحر اھل بابل الذین ذکرھو اللہ تعالیٰ فی قولہ یعلمون الناس السحر و ما انزل علی الملکین ببابل ھاروت و ماروت ۔	سحر کی ایک قسم ، اہل بابل کا سحر ہے جن کا ذکر اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے " شیاطین لوگوں کو سحر اور وہ جادو سکھلاتے ہیں جو بابل میں ہاروت ماروت نامی دو فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا "

گذشتہ بیانات میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ سحر ارواح اور کواکب کی پرستش کی پیداوار ہے چنانچہ امام موصوف فرماتے ہیں

" جادوگروں کی اُن تمام خلاف عقل باتوں کو عوام قبول کر لیتے تھے ۔ کیونکہ وہ کواکب کے پرستار تھے ۔ جس چیز میں کواکب کے احترام و تعظیم کا نام آجاتا اُس کو وہ مانتے ۔ جادوگر اس پردہ میں اپنی شعبدہ بازی سے عوام کو ان باتوں کا یقین دلا دیتے اور دعویٰ کرتے کہ وہی شخص فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور مُراد کو پہنچ سکتا ہے جو ہماری باتوں پر یقین رکھے ، اور جو کچھ ہم کہتے ہیں اُس کی تصدیق کرے ۔ اس زمانہ کے بادشاہ بھی کچھ گرفت نہیں کرتے تھے بلکہ جادوگروں کا اُن کے دربار میں بڑا وقار رہتا کیونکہ ان کو عوام میں بڑا رسوخ اور اثر حاصل تھا اور وہ

اُن سے خائف رہتے تھے اور خود پادشاہ بھی کواکب پرست ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں جادوگروں کی باتوں کو سچا سمجھتے تھے"۔

غرض بابل اور اس کے گرد و پیش کے بلاد و امصار کی ساحری، کواکب پرستی یا بالفاظ دیگر صابئیت کی رہین منت تھی۔ جادوگروں کے لیے یہ عقیدۂ صابئیت بہت معین و مددگار رہتا اور اس کے ذریعہ تمام فنون سحر و شعبدہ بازی کو وہ کام میں لاتے تھے اور لوگ باور کرتے تھے۔

امام موصوف ایک مقام پر فرماتے ہیں :۔

"یہ تو خاص سحر بابل ہے اس کے علاوہ باقی تمام اقسام سحر و شعبدہ و نیرنجات بھی وہ استعمال کرتے تھے اور ان سب کو کواکب کی طرف منسوب کرتے، اور لوگوں کو فریب دیتے تھے تاکہ وہ اس عقیدتمندی کی وجہ سے کھود کرید نہ کریں اور مان لیں"۔

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں :۔

سحر کی قسم اوّل کلدانیین و کسدانیین کا سحر ہے یہ ایک بہت قدیم الایام قوم ہے یہ لوگ تاروں کی پرستش کرتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ یہی ستارے اس تمام عالم کا انتظام کرتے ہیں اور انہی سے اچھائیاں اور برائیاں نیز سعادت و نحوست صادر ہوتی ہے یہی لوگ ہیں جن کی طرف ابراہیم علیہ السلام کو ان کے نظریہ کے ابطال اور اعتقاد کی تردید کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

علامہ ابن خلدون مقدمہ میں فرماتے ہیں :۔

"اہل بابل یعنی کلدانیین کے ہاں جو بلحاظ نسل نبطیین و سریانیین ہیں، سحر کا وجود بہت زیادہ ہے قرآن کریم کا بیان بھی یہی ہے اور تاریخی روایات بھی اس کی شاہد ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے زمانہ میں تو بابل و مصر میں سحر کا بازار بہت گرم تھا۔

ہاروت و ماروت اور چاہِ بابل

بابل کے ساتھ سحر کا تعلق قرآنِ حکیم سے بھی مفہوم ہوتا ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم حضرت سلیمان علیہ السلام کو سحر سے بری اور اس کے برعکس شیاطینِ جن وانس کو سحر کا مرتکب و معلم قرار دیتا ہے اور اس کے ذیل میں سحر کے مولد و منشا کی طرف بھی اشارہ فرماتا ہے۔

وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا	سلیمان نے تو کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے بیشک کفر کیا کیونکہ
یعلمون الناس السحر وما انزل علی	وہ لوگوں کو سحر اور وہ جادو سکھلاتے ہیں جو بابل میں ہاروت و
الملکین ببابل ھاروت وماروت	ماروت نامی دو فرشتوں (یا فرشتہ صفت بادشاہوں) پر نازل
	کیا گیا یعنی دیا گیا تھا

لفظ ملکین میں مشہور قرأۃ بفتح لام بمعنی فرشتہ ہے اور شاذ قرأۃ جس کے راوی حضرت ابن عباس، حسن، ابوالاسود اور ضحاک وغیرہ ہیں، بکسر لام بمعنی بادشاہ ہے اور ھاروت و ماروت ملکین کا عطف بیان ہے۔ یعنی یہ ان دونوں کے نام یا لقب ہیں۔

مفسرین کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ ہاروت و ماروت بابل کے دو سریانی النسل بادشاہ ہیں[1]۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۳۰۸ و خازن)

یہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے اور اس کے استعمال سے منع بھی کرتے اور کہہ دیتے تھے کہ ہم اور ہماری تعلیم سحر ایک فتنہ ہے تم اسے بیجا اور غلط استعمال کر کے خلق اللہ کو ایذا نہ پہنچانا اور کفر کے مرتکب نہ ہونا

---

[1] ہاروت و ماروت کے وزن پر قرآنِ حکیم میں ہمیں دو نام اور ملتے ہیں ایک طالوت اور دوسرا جالوت یہ دونوں بادشاہوں کے نام ہیں اول الذکر مومن ہے جس کو اللہ پاک نے موخر الذکر کافر اور اس کی قوم عمالقہ سے جنگ کرنے کے لیے بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ اسی طرح عبرانی زبان میں اور الفاظ بھی اس وزن پر ملتے ہیں۔ لہٰذا کچھ مستبعد نہیں کہ ہاروت و ماروت بھی بادشاہوں کے نام ہوں اور دنیا کو مضرت سحر سے بچنے کے لیے سحر کی تعلیم دیتے ہوں جس طرح آج کل میڈیکل کالجوں میں طرح طرح کے زہروں اور سمیات کی تعلیم دیجاتی ہے اور ملٹری کالجوں میں قسم قسم کے مہلک گیس اور گلا گھونٹنے والے، اندھا کرنے والے مادوں سے واقف کیا جاتا ہے۔ اور سائنس کالجوں میں مسمریزم وغیرہ اعمال پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں تاکہ لوگ ان سے واقف و باخبر رہیں اور مضرت سے بچیں۔ (دیکھو تفسیر الجواہر طنطاوی جوہری)

اس عہد میں عام طور پر لوگوں کو ساحروں سے حسن اعتقاد تھا ورنہ کم از کم ان کی مضرت سے بچنے کے لیے اُن کو نظر احترام تو ضرور دیکھتے تھے۔ یہ دونوں بادشاہ چونکہ بذات خود نیک اور نیکوکار تھے عام ساحروں کی طرح موذی اور ضرر رساں نہ تھے سحر کو صرف ایک فن کی حیثیت سے سکھلاتے تھے۔ جیسا کہ ان کی تنبیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں حسن شمائل کے ساتھ فرشتہ صورت بھی تھے۔ اس لیے لوگ ان کو فرشتہ سمجھتے اور کہتے تھے۔ اسی بنا پر مشہور قرأۃ میں انہیں مَلَکَ سے تعبیر کیا گیا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن وجمال کی وجہ سے زنانِ مصر کی زبان میں قرآن نے انہیں اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اور اُنزل سے وحی یا الہام کے طور پر نازل کرنا مراد نہیں بلکہ یہ لفظ یہاں محض پیدا کرنے یا دینے کے معنی میں مستعمل ہے اور یہ خود قرآن کا استعمال ہے ملاحظہ ہو۔

۱۔ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ۔ تمہارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے نازل کیے یعنی پیدا کیے۔

۲۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت قوت کا سامان ہے یعنی پیدا کیا

۳۔ وَیُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا۔ اللہ پاک آسمان سے تمہارے لیے رزق اتارتا ہے یعنی دیتا ہے

۴۔ (وفی الحدیث) مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ دَآءٍ اِلَّا وَلَهٗ دَوَآءٌ۔ حدیث میں آتا ہے۔ اللہ پاک نے جو مرض نازل کیا ہے۔ اس کے لیے علاج بھی نازل کیا ہے یعنی پیدا کیا ہے۔

۵۔ وکما یقال انزل اللہ الخیر والشر اور کہا کرتے ہیں خدا نے خیر و شر سب خود نازل کیے یعنی پیدا کیا۔

بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ بابل سحر اور تعلیم سحر کا مرکز تھا، وہاں اکثر و بیشتر تو بد باطن شیاطینِ جن و انس خود بھی سحر کرتے تھے اور لوگوں کو بھی سکھلاتے تھے اور کچھ ایسے نیک نفس لوگ بھی تھے جو صرف سحر کی مضرت سے بچنے اور خلق اللہ کو حقیقتِ سحر سے آگاہ کر کے ساحرین کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے سحر کی تعلیم دیتے اور کہہ دیتے کہ دیکھو بچا اور بے محل استعمال کر کے کفر کے مرتکب نہ ہونا۔ مگر ان شیاطین کی خباثت دیکھیے کہ مرورِ ایام کے بعد ان کے تعلیم کردہ جادو کو بھی اپنی تعلیم میں شامل کر لیا اور اُن کے

تقدس اور نیکی اوصاف سے سحر کی ترویج میں بالکل ناجائز فائدہ اُٹھایا اُن کی تعلیم کو سند صحت کے طور پر پیش کیا۔

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ہاروت و ماروت حقیقت میں دو فرشتے ہیں جن پر بابل میں سحر نازل کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں سحر و صابئیت کا استیلاء عالم پر نہایت شدید تھا ساحر اعمال تو خود کواکب کی تاثیرات اور ارواح طیبہ و خبیثہ کے اعمال کی جانب منسوب کر کے اس کی حقیقت کو لوگوں سے مخفی رکھتے تھے اور لوگ اُس کو معجزہ و کرامت یا علوم باطنیہ الٰہیہ میں سے سمجھ کر قبول کر لیتے اور جادوگروں کو بنظر احترام دیکھتے ورنہ کم از کم ناراضگی اور ایذا رسانی سے خائف ہو کر ان کی اطاعت کرتے تھے۔ لہٰذا ایک طرف اللہ پاک نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو بھیج کر صابئیت کا طلسم توڑا، بت پرستی و کواکب پرستی کی بیخ کنی، دوسری طرف ان دونوں فرشتوں کے ذریعہ دنیا کو سحر کی حقیقت اور اس کی خباثت سے آگاہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ سحر کو سیکھ کر احتراز و اجتناب کرنے کے بجائے خود ہی اس میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس لیے وہ تعلیم سے پہلے تنبیہ کر دیتے تھے

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ہم اور ہماری تعلیم سحر تمہارے لیے ایک فتنہ ہے تم اس سے کافر نہ ہو جانا۔

یا یوں کہیے کہ اللہ پاک کو اپنے بندوں کی آزمائش مطلوب تھی اس لیے سحر یا سحر کی قسم سے کوئی چیز اپنے فرشتوں پر نازل کی اور اُن سے کہہ دیا کہ دیکھو ہر شخص کو تعلیم سے پہلے اسکی حقیقت سے آگاہ کر دینا چنانچہ وہ کہہ دیتے :-

اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ہم تو صرف آزمائش کے لیے ہیں، تم ہم سے سحر سیکھ کر کافر نہ ہو۔

بہر صورت بابل میں فرشتوں پر سحر نازل کیا گیا خواہ حقیقت سحر سے آگاہ کرنے کے لیے خواہ آزمائش و ابتلاء کے طور پر۔ بابل کی مذکورہ بالا تاریخی حیثیت سمجھ لینے کے بعد بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ بابل کو اس مقصد کے لیے انتخاب کرنا صرف اس بناء پر ہے کہ وہ سحر و صابئیت کا مرکز تھا اور دنیا میں سحر و

صابئیت وہیں سے پھیلی۔

ہاروت و ماروت اور زہرہ کا مشہور افسانہ اور چاہِ بابل کی حقیقت

باقی رہا ہاروت و ماروت اور زہرہ کا مشہور حیا سوز قصّہ، چاہِ بابل اور اس میں ہر دو فرشتوں کے اُلٹا لٹکنے اور اسی حالت میں سحر کی تعلیم دینے کی داستان سو اس کے متعلق ہم اپنی زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہتے ہمارے بعض محترم اس بارے میں ہم سے ناراض ہیں ہم صرف علامہ آلوسی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ علامہ موصوف اس قصّہ کی ایک چیستاں کی قسم کی تاویل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"جو کوئی حقیقۃً اس قصّہ کو صحیح کہتا ہے اور اسی صورت پر اس کو تسلیم کرتا ہے وہ حدِ جواز سے تجاوز کرتا ہے غلط کہتا ہے اور درحقیقت سحر کا ایک ایسا دروازہ کھولتا ہے جو مُردوں کو ہنسانے والا اور زندوں کو رُلانے والا ہے اور وہ اسلام کے مقدس اور پاک جھنڈے کو پامال و سرنگوں کرتا ہے اور کفر و شیطنت کی طاقتوں کو رفعت دیتا ہے (العیاذ باللہ)"

آگے چل کر علامہ موصوف "دومۃ الجندل" کی ایک عورت کی داستان جس نے بابل کے کنویں پر جا کر ہاروت و ماروت سے حیا سوز طریق پر سحر سیکھا تھا، نقل کر کے اس کی تردید فرماتے ہیں اور ان ناقلین کی غلط کوشی پر ماتم کرتے ہیں جنہوں نے بے سوچے سمجھے اسرائیلیات کی اس خرافات کو کلام اللہ کی تفسیر اور کتب اسلامیہ میں نقل کیا۔

"یہ اور اس قسم کے قصّے جن کو مفسرین اس سلسلہ میں بیان کرتے ہیں علماء اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کرتے اور اس جیسی غیر معروف دومۃ الجندل کی عورت کے نامعقول بیان کی تردید و تکذیب اس سے بہتر ہے کہ ایسی حکایات کو قبول کر کے عقلِ انسانی کی پیشانی پر بدنما داغ لگایا جائے جن کے متعلق رب الخلائق کے رسولِ کریم کی جانب سے ایک لفظ بھی نقلِ صحیح ثابت نہیں۔"

اور کیا اچھا ہوتا کہ اسلامی تصانیف اس قسم کے خرافات سے پاک ہوتیں۔ جن کو ایک صاحبِ عقل و

ش انسان بدخوابیوں کے درجہ میں بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا" (روح المعانی ج ۱ ص ۳۴۰)

بہرحال قرآن کریم کا بیان اس قسم کی خرافات سے بالکل منزہ ہے۔ آیت کریمہ کی جو بھی تفسیر جائے اس کے لیے اس قصہ کی ہرگز ضرورت نہیں۔ مان لیجیے کہ جمہور کی رائے کے مطابق شتے ہی تعلیم سحر کے لیے مقرر کیے گئے اور ان پر سحر نازل کیا گیا مگر اس کی یہ صورت ہرگز نہیں ہو سکتی صرف یہ۔ اس قصہ کی اصل اسرائیلیات سے ہے اور صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ئی حدیث مرفوع اس کے متعلق وارد نہیں بلکہ یہ عصمت ملائکہ کے منافی ہے جو نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ اس بنا پر شہاب عراقی اس شخص پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں جو اس قصہ کو سچا سمجھے اور اس پر عتقاد رکھے۔

بض الشهاب العراقي على ان من اعتقد	شہاب عراقی تصریح کرتے ہیں کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ
ن هاروت و ماروت انهما ملكان يعذبان	ہاروت و ماروت دو فرشتے ہیں اور زہرہ کے ساتھ ملوث ہونے
لى خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله	کی وجہ سے ان پر (چاہ بابل میں) عذاب ہو رہا ہے وہ اللہ رب
العظيم فان الملائكة معصومون لا يعصون	العالمین کے ساتھ کفر کرتا ہے۔ اس لیے کہ فرشتے معصوم ہیں
الله ما امرهم ويفعلون ما يؤمرون لا يستكبرون	اللہ کے حکم سے نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے وہی
عن عبادته ولا يستحسرون يسبحون الليل	کرتے ہیں۔ اللہ کی عبادت سے انکار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں
والنهار لا يفترون، والزهرة كانت يوم	رات دن تسبیح و تہلیل کرتے ہیں اور نہیں تھکتے۔ اور زہرہ جس دن
خلق الله السموات والارض والقول بانها	سے اللہ نے آسمان و زمین پیدا کیا ہے اسی روز سے موجود ہے
تمثلت لهما فكان ما كان وردت الى مكانها	اور یہ کہنا کہ وہ ایک عورت کے بھیس میں ان دونوں کے پاس آئی
غير معقول ولا مقبول .	اور مزعومہ واقعہ پیش آنے کے بعد اپنی جگہ چلی گئی۔ مردود اور ناقابل قبول قول ہے۔

ہاروت وماروت اور زہرہ کے سلسلہ میں مفسرین ایک مرفوع روایت اور متعدد صحابہ کے آثار بطور سند نقل کیا کرتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان روایات کے متعلق مشہور محدث ومفسر حافظ ابن کثیر کی تحقیق پیش کردیں اور اسی پر اکتفا کریں۔

مرفوع روایت کی تخریج اور سند پر کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

واقرب ما یکون فی ھذا انہ من روایۃ عبداللہ بن عمر عن کعب الاحبار لا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اس روایت کے متعلق قریب تر تحقیق یہ ہے کہ یہ مرفوع روایت نہیں بلکہ عبداللہ بن عمر کا اثر ہے جو کعب احبار سے اُنھوں نے روایت کیا ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

پھر اس دعوے کو محدثانہ انداز میں ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

فدار الحدیث ورجع الی نقل کعب الاحبار عن کتب بنی اسرائیل	لہٰذا اس حدیث کا مدار اور مرجع کعب احبار کی روایت ہے جو وہ کتب بنی اسرائیل سے روایت کرتے ہیں۔

صحابہ اور تابعین کے آثار نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"تابعین کی ایک جماعت، مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس اور مقاتل بن حبان وغیرہ سے ہاروت وماروت کے قصہ سے متعلق روایات مروی ہیں اور متقدمین ومتاخرین مفسرین کی ایک جماعت کثیر نے ان کو نقل بھی کیا ہے۔ مگر ان کی تمام تفصیلات کا مرجع اسرائیلی روایات ہیں کیونکہ اس بارے میں کوئی مرفوع صحیح الاسناد روایت صادق ومصدوق نبی معصوم علیہ السلام سے جن کا ہر لفظ وحی الٰہی ہے، ثابت نہیں۔ قرآن حکیم بھی بغیر بسط وتفصیل کے مجملاً اس قصہ کو بیان کرتا ہے۔ لہٰذا ہمیں صرف اس حصہ پر ایمان ویقین رکھنا چاہیے جو قرآن میں مذکور ہے" (ابن کثیر ج ۱)

زہرہ کا حسین عورت کی شکل میں آسمان سے اترنا۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

فیہ غرابۃ جدًا (یہ بہت مستبعد ہے) اور اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک طویل اثر

ابن ابی حاتم سے نقل کرتے ہیں جس کی تصحیح حاکم نے کی ہے، اس میں تصریح ہے

و فی ذلک الزمان امرأۃ حسنھا فی النساء اور اس زمانہ میں ایک عورت ایسی حسین تھی جیسے تمام سیارات
الحسن الزھرۃ فی سائر الکواکب۔ میں زہرہ۔

اس روایت میں اس عورت کا آسمان پر جانا اور ستارہ کی شکل میں تبدیل ہونا بھی مذکور نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلیات کی اس روایت میں زہرہ ستارہ کا زمین پر اترنا یا کسی حسین عورت کا زہرہ کی شکل مسخ ہو کر آسمان پر چلا جانا صرف افسانہ سازوں کی رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

فھذا اقرب ما روی فی شان الزھرۃ زہرہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی زیادہ اقرب
واللہ اعلم۔ بصواب معلوم ہوتا ہے۔ اور خدا بہتر جانتا ہے۔

غرض اس داستان کو مشکوٰۃ نبوت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف یہود کی مخترعہ روایات میں سے ایک روایت ہے جن کا محبوب مشغلہ انبیا و ملائکہ پر بہتان تراشی اور افترا پردازی ہے

چاہ بابل مفسرین ہی ہاروت و ماروت کے قصہ میں چاہ بابل کا ذکر کرتے ہیں، ورنہ جدید و قدیم کتب تاریخ اس کے ذکر سے خالی ہیں صرف "مسعودی" مروج الذہب میں بابل کے حالات میں لکھتے ہیں۔

"اس بستی میں ایک گہرا کنواں ہے جو چاہ دانیال نبی علیہ السلام کے نام سے مشہور رہے یہود و نصاریٰ سال کے مختلف حصوں میں اپنی عیدوں کے مواقع پر یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں۔ جب انسان اس بستی میں آتا ہے تو اسے بہت سے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات اور منہدم عمارات کے عظیم الشان نشان نظر آتے ہیں جو اب ٹیلوں کی شکل میں باقی رہ گئے ہیں بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اس کنویں میں ہاروت و ماروت فرشتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں اللہ پاک نے اس بستی کے ساتھ فرمایا ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کنویں کے متعلق یہ خیال کہ اس میں ہاروت ماروت مقید ہیں اسی با
قصہ کی پیداوار ہے جو اسرائیلی اور ایرانی کہانیوں سے ماخوذ اور ہر ملک و زبان میں مشہور ہے
یہ بھی یاد رہے کہ جادوگر حضرت سلیمان کی طرح دانیال نبی علیہ السلام کی جانب بھی سحر کو منسوب
فرماتے ہیں۔

حران | بھی بابل کی طرح صابئیت کا قدیم مرکز ہے اور جس طرح عراق میں بابل سب سے پہلا اور
قدیم شہر ہے اسی طرح شام میں حران سب سے پہلا اور پرانا شہر ہے بلکہ ابن الفقیہ کی روایت کے
مطابق تو حران بابل سے بھی پہلے آباد ہوا ہے۔ (ابن الفقیہ ص ۱۹۶ بحوالہ دائرۃ المعارف)

عراق کی طرح شام و مصر میں بھی اس زمانہ میں سیارات اور ارواح کی پرستش ہوتی تھی
اور کسدانیین وہاں آباد تھے حافظ ابن کثیر تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

> حران اس زمانہ میں کسدانیین کے زیرنگین تھا۔ اسی طرح ارض جزیرہ اور تمام ملک شام بھی اور یہ سب لوگ قولاً و عملاً سیاراتِ سبعہ کی پرستش کرتے تھے۔ اسی لیے دمشق کے قدیم دروازوں میں سے ہر دروازہ پر ایک ستارہ کا بت تھا، ہر ایک کے نام سے عیدیں مناتے اور قربانیاں پیش کرتے تھے۔ اسی طرح تمام حرانی ستاروں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے۔

"حرانیین" صابئہ کا ایک خاص فرقہ ہے جو صابئہ سے عقائد میں کچھ تھوڑا سا اختلاف رکھتا
ہے۔ حرانیین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ بڑی حد تک بت پرستی سے بچے ہوئے ہیں۔
مورخین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کے سلسلہ میں حران کا بھی ذکر کرتے ہیں حالانکہ
یہ صحیح نہیں چنانچہ حافظ ابن کثیر ارض بابل کو ابراہیم علیہ السلام کا مولد بتلاتے اور فرماتے ہیں۔
ھذا ھو الصحیح المشھور عند اھل السیر والتواریخ والاخبار وصحح ذٰلک الحافظ ابن عساکر

وقال والصحیح انہ ولد ببابل۔

پھر وہاں سے منتقل ہوکر حران (شام) میں آئے۔ فرماتے ہیں:-

حضرت براہیم اپنے متعلقین کو علاقہ کسدان سے لے کر علاقہ کنعان میں آئے اور یہ ملک بیت المقدس تھا۔ انھوں نے کچھ دن حران میں قیام کیا۔ قرآن حکیم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (کما تقدم) اور تورات کے سفر تکوین سے بھی حضرت ابراہیم کا عراق سے مصر و شام کی طرف سفر کرنا ثابت ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ (باقی)

مذاکرۂ علمیّہ

واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) پر نقد و تبصرہ

ماہ اگست کے "برہان" میں "حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی تشریح" کے عنوان سے ایک مضمون قارئینِ "برہان" کے ملاحظہ سے گذرا ہے۔ یہ اور اسی طرح دیگر انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے واقعات سے متعلق "برہان" میں جو سلسلہ جاری ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ حضرات انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی حیات طیبہ سے متعلق جو "خرافات" اہل کتاب خصوصاً یہود کے یہاں پائی جاتی ہیں اور بدقسمتی سے ہماری بعض کتب تفاسیر میں بھی اُن کو درج کر دیا گیا ہے، اُن سے مسلمانوں کے قلوب میں انبیاء و رسل کی پاک اور مقدس سیرت کے بارہ میں جو شکوک و شبہات کے مہلک جراثیم پیدا ہو رہے ہیں، اور اسلام کے ایک زبردست اور بنیادی عقیدہ "عصمتِ انبیاء" پر اُن کے ذریعہ ناقابل برداشت زد پڑ رہی ہے، اُن کا استیصال کر دیا جائے، اور یہ بتایا جائے کہ قرآنِ عزیز نے حضرات انبیاء (علیہم السلام) کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اگر اُس کی تفسیر و تشریح کے لیے خارج سے کسی روایت یا واقعہ سے مدد نہ لی جائے تب بھی اُس کی کسی ایک آیت سے بھی ایسا مضمون ثابت نہیں ہوتا جو "عصمتِ انبیاء" یا اُن کی "جلالتِ شان" اور مرتبۂ نبوت و رسالت کے خلاف ہو بلکہ اس کے برعکس ان آیات سے اُن کے منصبِ عالی کی اور زیادہ تائید و تقویت ہوتی ہے، اور خدائے برتر کی جناب میں اُن کے انتہائی تقرب کی دلیل ملتی ہے، اس سلسلہ کی پہلی کڑی "حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی تشریح" ہے جس میں شرح و بسط سے بحث کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سورۂ

علاوہ ازیں ”برہان“ کے مضمون میں اس روایت کو بیان کردہ توجیہ کا مدار قرار نہیں دیا گیا بلکہ تصریح کردی گئی ہے کہ اس واقعہ کے سیاق وسباق کے پیش نظر صرف قرآن عزیز ہی اس تاویل کے لیے ناطق ہے البتہ اس روایت کو تقویت اور تائید کے لیے پیش کردیا گیا ہے لہذا اس روایت کو بالفرض شاذ تسلیم کرنے کے باوجود اس تاویل کو کمزور بتانا صحیح نہیں ہے۔

دوسرے جملے میں مسروق اور سعید بن جبیر سے منقول، حضرت ابن عباس کی روایت کو قوی کہنا محل نظر ہے، شاید مقالہ نگار کی نگاہ مشہور محدث ومفسر حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس فیصلہ پر نہیں گئی جس کا حوالہ اصل مضمون میں بھی دیا جاچکا ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اوریا کے قصہ کے متعلق ذخیرۂ روایات میں ایک روایت بھی صحیح نہیں اور جو کچھ روایت کیا گیا ہے وہ سب اسرائیلیات سے ماخوذ، اور سرتاپا خرافات ہے

یہ تو ظاہر ہے کہ ابن کثیر حضرت ابن عباسؓ کی مسروق والی روایت سے ناآشنا نہیں ہیں اگر پھر بھی وہ کسی روایت کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور پُرزور الفاظ میں یہ تلقین کرتے ہیں کہ کسی تفصیل میں جائے بغیر فقط قرآنِ عزیز کے بتائے ہوئے اجمال پر ہی اعتقاد رکھنا چاہیے اور بس اور اس سے زیادہ صاف اور صریح قاضی عیاضؒ جیسے محدث اور مادح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے وہ فرماتے ہیں:۔ وقال الداؤدی لیس فی قصۃ داؤد صلی اللہ علیہ وسلم واوریاء خبر ثبت۔ (نسیم الریاض جلد۴) یعنی داؤدی کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریاء کے واقعہ کے متعلق ایک روایت بھی ثابت نہیں ہے۔ اور محدث ”خفاجی“ صاحب نسیم الریاض اس کی شرح کرتے ہوئے اس کو اس طرح مضبوط اور قوی بناتے ہیں۔

وما قیل ان کلام الداؤدی طعن فی الروایات من غیر دلیل لیس بشیٔ	اور یہ جو بعض کا خیال ہے کہ داؤدی کا روایات کے بارہ میں یہ طعن رکہ اوریا اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کی تمام

فان ما روی فیہ مالا یلیق بمقام الانبیاء والاقدام علیہ من غیر روایۃ صحیحۃ لا یلیق۔

روایات غلط ہیں) بلا دلیل ہے سو یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ روایات میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ مقام انبیاء کے قطعاً لائق نہیں اور ایسی بات پر صحیح روایت کے بغیر قدم اٹھانا بالکل نامناسب ہے۔

اگرچہ قاضی عیاضؒ نے اس واقعہ کی بحث کے درمیان میں حضرت ابن عباس کی اس روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اگر اس واقعہ کی کوئی اصل تسلیم بھی کی جائے تو بہتر ہے کہ اس روایت کو لے لیا جائے مگر آگے چل کر مذکورہ بالا داؤدی کے قول کو پیش کر کے فیصلہ یہی دیا ہے کہ اوریاہ کے متعلق ایک روایت بھی (خواہ وہ قول رسول ہو یا قول صحابی) صحیح نہیں ہے۔

ان ہر دو نقول کے بعد اوریا کے متعلق کسی حصہ کو بھی تسلیم کرنا، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کو قوی بتانا کس طرح جائز اور درست ہو سکتا ہے؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ متقدمین ومتاخرین عظیم المرتبہ مفسرین میں سے کسی ایک نے بھی اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس کی اس روایت کو نقل نہیں فرمایا جو تفسیر ابن عباس میں حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہے۔ چنانچہ ابن کثیر، روح المعانی، بحر المحیط، خازن، تفسیر کبیر، فتح القدیر، وغیرہ کسی میں بھی اس روایت کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس صاحب روح المعانی، اور بعض دوسرے مفسرین نے ہماری بیان کردہ روایت ابن عباس کو نقل کیا ہے۔

اور سب سے زیادہ تعجب خیز یہ دعویٰ ہے کہ آیۃ "قد ظلمك بسوال نعجتك" اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابن عباس کی مسروق والی روایت قوی ہے" اس لیے کہ اس آیت کے کسی ایک جملہ سے یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ اس میں اوریا کی بیوی کے واقعہ کا کوئی بھی ذکر ہے۔ پھر طلاق حاصل کرنے والی روایت کی اس سے کس طرح تائید ہو سکتی ہے۔ پھر نہ معلوم کہ اس واقعہ کی بیہودہ شہرت سے مقالہ نگار اس قدر کیوں متاثر ہیں کہ اس کے کسی ایک حصہ کو تسلیم کر کے خود قرآنی شہادت اس کی

تقویت کے لیے پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔

اس کے بعد مقالہ نگار ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ثانیاً اگر کسی شخص کے پیش نظر حضرت ابن عباس کی یہ روایت نہ ہو تو وہ صرف یہی نہیں کہ قرآن مجید کی ان آیات کا یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا بلکہ ظاہر الفاظ سے وہ اس کے خلاف مطلب نکالنے لگا یہ بات کتاب الٰہی تو درکنار معمولی انسان مصنفوں کے لیے بھی معیوب ہے (الی) لیکن وہ قہاد مفہوم سے ہٹا کر بات کو کسی اور طرف پھیرے جائے تو ایسی روایت کو شارح کے بجائے متمم کہنا پڑیگا اور اس سے لازم آئیگا کہ اس متمم کے بغیر قرآن ناقص ہے"۔

ہمیں حیرت ہے کہ علم معانی و بلاغت اور علم اصول کے ان قاعدوں کا اس جگہ بموقعہ کیوں ذکر کیا گیا جبکہ "برہان" کا پورا مضمون پڑھنے کے بعد ہر شخص بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی روایت بھی سامنے نہ ہو تو قرآنِ عزیز کا سیاق و سباق خود یہ بتا رہا ہے کہ اس واقعہ کا مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) قرآنِ عزیز نے اوّل حضرت داؤد کے نبی اور مقرب الی اللہ ہونے کا ذکر کیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے طریق پر چلنے کی دعوت دی ہے۔

(۲) مگر ساتھ ہی اُن کی اس لغزش کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ وہ جس روز محراب بند کر کے عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوتے تو اُس دن مخلوقِ خدا کی ہدایت اور فصلِ قضایا کی خدمت (جو کہ منصبِ نبوت سے متعلق ہے) سے الگ ہو کر حقِ ولایت کو ادا کرتے تھے لیکن خدا کی مرضی معلوم کیے بغیر کسی طرح اُن کے لیے یہ مناسب نہ تھا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اُن کی مرضی کے خلاف اُن کی عبادت میں خلل اندازی کرائی، اور خلق اللہ کی خدمت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے دو انسانوں کے مقدمہ کی روئداد بھی سنوادی۔

(۳) حضرت داؤد نے مقدمہ کا اول فیصلہ سنایا اور نور نبوت سے فیضیاب عقل کے ذریعہ فوراً مطلب کو پہنچ گئے اور خدائے تعالیٰ کی اس آزمائش کو پہچان کر توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہو گئے

(۴) حق تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور ساتھ ہی صراحت کے ساتھ بتا دیا کہ تم دنیا میں خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجے گئے ہو اس لیے اس کا صحیح حق ادا کرو۔

(۵) اور مناسب مقام سمجھ کر خلافت سے متعلق بنیادی نصیحت بھی فرما دی کہ اتباع ہوئی کبھی نہ ہو اور انصاف کبھی ہاتھ سے نہ جائے۔

بتائیے کہ اس صاف اور سادہ مطلب میں حضرت ابن عباس کی روایت کے مفہوم کے خلاف کون سا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اور کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ روایت آیت کی شرح نہیں کرتی بلکہ اس کی متمم ہے۔ ہاں اگر اوریا کے قصہ کے اس حصہ کو مان لیا جائے جو فاضل مقالہ نگار نے تسلیم کیا ہے تو البتہ قرآن عزیز کا سیاق و سباق اس کے مفہوم کے قطعاً خلاف ہوگا اور یہ کہنا پڑیگا کہ اگر باہر سے اس واقعہ کا علم نہ حاصل ہو تو آیت کے معنی اس واقعہ کے قطعاً خلاف سمجھے جائیںگے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو اس واقعہ کا علم نہ ہو تو ہرگز ہرگز وہ قرآن عزیز کی ان آیات کو ان معنی میں لینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اور بعد کی آیت یا داؤد انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض کا تو کسی طرح بھی اس غلط واقعہ سے جوڑ نہیں لگ سکتا ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:-

> ثالثاً خود حضرت ابن عباس نے بھی اس روایت کو وجہ عتاب کی تفسیر میں بیان نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس امر کی تشریح میں بیان کیا ہے کہ خصمین کو دیوار پھاند کر محراب میں جانے کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔" الخ

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ حضرت ابن عباس نے یہ روایت وجہ عتاب کی تفسیر میں نہیں بیان فرمائی۔

لیکن اس سے نفس مضمون کا انکار کیسے لازم آتا ہے، اس لیے کہ اگر ایک روایت کسی خاص غرض سے بیان کی جائے لیکن ضمناً اس سے کسی دوسرے واقعہ کی تائید تقویت بھی نکلتی ہو تو محض اس لیے کہ راوی نے اس کو اس تائید کے لیے بیان نہیں کیا تائید کے ثبوت کا انکار کس طرح لازم آ جائیگا۔ رہا حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا معاملہ ہو ہم محدثین و مفسرین کے اقوال سے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت عتاب کی تفسیر میں اوریا کی بیوی سے متعلق ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ البتہ اس واقعہ سے الگ ایک روایت مسند احمد میں ابنِ عباس سے مروی ہے اور حاکم نے مستدرک میں اس کو صحیح بتایا ہے اور برہان میں اس کو بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ سو اگر یہ بات مضر ہے تو مقالہ نگار کے حق میں تو مضر ہے جن کے جواب کا مدار ہی حضرت ابن عباس کی ضعیف اور غیر مستند مسروق والی روایت پر ہے اور ہمارے لیے تو یہ بات کسی طرح مضر نہیں جبکہ ہم قرآن عزیز کے اس موقعہ کی تفسیر خود قرآن عزیز کے سیاق و سباق اور نفس مفہوم سے کر رہے ہیں۔ البتہ تائید و تقویت کے لیے ابن عباس کی اس روایت کے ان جملوں کو بھی پیش کر دیتے ہیں جو ضمنی طور پر ہمارے مدعا کے حق میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اور اس طرح کا استدلال تمام علماءِ عقل و نقل میں شائع ذائع ہے۔

اس کے بعد ارقام ہے:-

> "رابعاً اگر بات یہی تھی جو یہ مفسرین بیان کرتے ہیں تو خصمین کے پورے مقدمے کو نقل کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ بات قرآن کے اسلوب کے خلاف ہے کہ وہ کسی واقعہ کی ایسی تفصیلات نقل کرے جس سے اصل مقصود پر کوئی روشنی نہ پڑتی ہو۔

بات تو وہی ہے جو "برہان" میں بیان کی گئی، رہا خصمین کے مقدمہ کی پوری روئداد نقل کرنے کا معاملہ تو قرآنِ عزیز نے اس لیے اس کو مفصل بیان کیا تاکہ اصل تنبیہ کے ساتھ ساتھ حضرت داؤدؑ پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ خلافتِ الٰہیہ کے منصب میں تھوڑی سی تقصیر کی بنا پر ظلم و عدوان اس

حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ضعیف کی زندگی قوی کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے۔ پس اگر تم اسی طرح کوتاہی کرتے رہے تو سمجھ لو کہ اس کے نتائج کس قدر مہلک ہونگے پس تم کو چاہیے کہ منصب نبوت اور خلافت الٰہیہ کی انجام دہی کے لیے کسی وقت بھی لوگوں پر اپنے دروازے بند نہ کرو، سو اگر معاملہ کو صرف اجمالی طور پر ہی ذکر کر دیا جاتا تو جس امر پر حضرت داؤدؑ کو متنبہ کیا جا رہا تھا سامعین کے سامنے اُس کی اہمیت اتنی قوت کے ساتھ نہ آسکتی جس قوت کے ساتھ مقدمہ کی تفصیلی روئداد کے بعد آجاتی ہے۔ اب انصاف سے غور کیا جائے کہ کس طرح اس تفصیل سے مقصود پر روشنی پڑ رہی ہے ۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب!

اس کے بعد ارشاد ہے:-

"خاصا عبادت میں افراط اور کثرت ایسی چیز نہیں ہے جس کو "ہویٰ" سے تعبیر کیا جائے،
قرآن نے کہیں بھی اس فعل کو ہوائے نفس کی طرف منسوب نہیں کیا ہے اور نہ کوئی ایک
مثال ایسی ملتی ہے کہ کثرت عبادت پر کسی کو عتاب فرمایا گیا ہو الخ

"مقالہ نگار" کے پہلے جملے معلوم نہیں کہ کس کو خطاب کر رہے ہیں اس لیے کہ جس کی تاویل کی کمزوری کے اظہار کے لیے یہ پانچویں دلیل بیان کی گئی ہے اُس کے تو کسی ایک جملے سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ لا تتبع الھویٰ میں "ہویٰ" (خواہشِ نفس) کا مصداق "عبادتِ الٰہی" ہے۔ اگر برہان کے مضمون کو ذرا تامل و غور سے پڑھ لیا جاتا تو شاید کمزوریوں کے اضافہ میں اس پانچویں دلیل کی ضرورت نہ پیش آتی۔

اس لیے کہ اُس میں تو اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ لا تتبع الھویٰ کو واقعہ کے ابتدائی جملوں سے مربوط کرنے اور آیۃ یٰداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض کو پیش نظر نہ رکھنے سے ہی یہ فاسد خیال جما لیا گیا کہ العیاذ باللہ حضرت داؤد کی ہویٰ (خواہشِ نفس) یہی تھی کہ وہ اوریا کی بیوی کو اپنانا چاہتے تھے اور حق تعالیٰ نے اس وجہ سے اُن پر عتاب فرمایا، حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ اصل میں اس جملہ کا تعلق خلیفۃ فی الارض سے ہے اور بتانا یہ

مقصود ہے کہ جب تم خلیفۃ اللہ فی الارض ہو تو سمجھ لو کہ نیابتِ الٰہی کا سب سے بلند مقام یہ ہے کہ اُس میں خدا کی وحی کے سوا خواہش نفس کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو تاکہ خلیفہ خلیفۃ اللہ کہلا سکے، اور گمراہوں کی صف میں شامل نہ ہو جائے۔ گویا ہوئی کا ذکر کسی گزشتہ لغزش پر تنبیہ کے لیے نہیں ہے بلکہ خلافت الٰہیہ کی اساسی تعلیم کے اظہار کے لیے۔ اور یہ بتانے کے لیے ہے کہ دنیوی حکومت اور خلافت الٰہیہ کا سب سے بڑا تفاوت اس ایک نقطہ میں ہے کہ پہلی چیز کا مقصد "ہوائے نفس" اور نتیجہ "ضلالت" ہے۔ اور دوسری چیز کا مقصد "اتباعِ امرالٰہی" اور نتیجہ "فوز و فلاح" ہے۔ جیسا کہ وضاحت کے ساتھ "برہان" میں لکھا جا چکا ہے۔

رہا یہ امر کہ عبادتِ الٰہی پر قرآن عزیز میں عتاب ثابت نہیں۔ سو اعتراض کا یہ انداز ایسا ہے جیسا کہ سورۂ "عَبَسَ وَتَوَلّٰی" کی تفسیر میں کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ تبلیغ کی مشغولیت کے وقت کسی اتفاقی دخل در معقولات پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ناگواری ظاہر فرمانا ایسا امر نہیں تھا کہ موجبِ عتاب ہوتا، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امراءِ قریش سے قبول اسلام کی توقع پر اس شرط سے کہ فقراءِ اسلام مجلس میں موجود نہ ہوں، بات چیت کرنے اور اتفاقاً نابینا صحابی حضرت ابن ام مکتوم کے حاضر ہو کر نادانستگی سے سوال کر لینے اور آپ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار ظاہر ہونے پر حق تعالیٰ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں عتاب فرمایا۔ کیونکہ آپ کی یہ ناگواری تبلیغِ اسلام کے شوق میں تھی۔ اور قرآن میں کہیں ثابت نہیں کہ تبلیغِ اسلام پر عتاب کیا جائے۔ بہرحال برہان میں اس موقعہ پر جس طرح مسئلہ کی حقیقت کو روشن اور آشکارا کیا گیا ہے اگر اس کو ایک مرتبہ بنظر غائر دیکھ لیا جاتا تو یہ بآسانی معلوم ہو سکتا کہ مقصود عبادتِ الٰہی پر عتاب کرنا نہیں ہے، بلکہ کسی دن پورے اوقات میں خلافت الٰہی سے بے پرواہ ہو کر لوگوں پر دادرسی و فریادرسی کے دروازے بند کر دینے پر عتاب ہے۔ جیسا کہ سورۂ "عبس" میں تبلیغ اسلام پر عتاب نہیں ہے بلکہ اس مخصوص طریقہ کے اختیار پر عتاب ہے کہ امراءِ قریش کی توقعِ اسلام کی وجہ سے فقراءِ اسلام کی اس طرح دل شکنی کیوں کی گئی۔ مگر چونکہ یہ بندش عبادت کے سلسلہ میں پیش آئی اس لیے

ضمنی طور پر اس کا بھی تذکرہ آگیا ورنہ مقصود بالذات یہ نہیں ہے بلکہ وہ ہے۔

نیز حدیث "لارہبانیۃ فی الاسلام" اور نہی عن التقشف فی العبادۃ کی تمام احادیث صحیحہ کیا اس بات کو ثابت نہیں کرتیں کہ عبادتِ الٰہی اگرچہ اسلام کے اہم اور بنیادی امور میں سے ہے اگر جب واجب اور ضروری حقوق اللہ اور حقوق العباد میں بھی "نفل" عبادت مخل انداز ہونے لگے تو اسلام اُس پر سختی سے متنبہ کرتا، اور اُس کو روکنے کے لیے زبان وحی ترجمان سے وہ کہلواتا ہے جو رہبانیت (جوگیانہ زندگی) کی ممانعت میں مذکور ہے۔

اس کے بعد ارقام ہے:۔

"ان وجوہ" سے ہمارے نزدیک یہ تاویل بھی قابل قبول نہیں"۔

لیکن یہ "وجوہ" تو خود نا قابل قبول ہیں جیسا کہ ابھی شرح و بسط سے بیان کیا گیا۔ اس لیے اگر اس تاویل کی عدم مقبولیت کی واقعی کوئی وجہ ہو تو ہمیں تسلیم کرنے میں ادنیٰ تامل نہیں ورنہ ایک ضعیف، بلکہ باطل اور غیر ثابت روایت پر اپنی تاویل کی بنیاد قائم کرنا، اور ایک مدلل و مبرہن تاویل کو کمزور دلائل سے کمزور بنانا انصاف اور علمی اصول کے قطعاً خلاف ہے۔

(باقی)

خواطر و سوانح

افاداتِ علامہ ابنِ جوزی

از مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

دنیا کی راحتوں سے اہل علم و فضل کی محرومی

اہل علم و فضل اور اصحاب کمال کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اکثر وہ ہیں جو دنیوی عیش و نشاط سے محروم ہو چکے ہیں اور جن کے لیے دنیا کی لذتوں اور معیشت کی فراخیوں میں بہت کم حصہ رہ گیا ہے عام طور پر تمام فارغ البالیاں اُن کے لیے ہیں جو علم سے عاری ہنر سے بے بہرہ ہیں اور فضل و کمال سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتے۔

صورتِ حال کی اس تلخی سے اہل کمال آزردہ خاطر اور ملول ہوتے ہیں، سوچتے ہیں آخر یہ کیا ہے بے ہُنروں کے قدموں پر دولت کے انبار لگ رہے ہیں، ہم ہیں کہ زندگی کی راحتوں کو ہم سے بیر ہے، اور دولت کی یہ کیفیت ہے کہ ہمارے سایے سے بھاگتی ہے۔

میں نے ایک دوست سے جو اسی رنگ کی حماقت کا شکار تھا ایک دفعہ کہا افسوس تم پر آخر اس غم میں کیوں گھُلے جاتے ہو؟ اپنے معاملہ میں ذرا غور کرو اور عقل و تدبر سے کام لو تو تمہیں اپنی غلط اندیشی کا احساس ہو جائیگا اور اُن خیالات کی بے حقیقتی کا اندازہ کر سکو گے جو تم نے اپنے دل میں پکا رکھے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ دیکھو اگر دنیا کی طلب تمہیں بے چین کر رہی ہے اور تم اُس کے لیے ایسے ہی مضطرب ہو تو حسرت و حرمان کے آنسو بہانے کی جگہ ضرورت اس کی ہے کہ دنیا حاصل کرنے کی

کوشش کرو، اپنی آرزوؤں کی پامالی پر افسوس کرکے بیٹھ رہنا اور جدوجہد سے جی چرانا مردوں کا شیوہ نہیں یہ تو عجز و درماندگی کی انتہا ہے، اور ہاں کیا تمہارے علم نے تمہاری اتنی بھی رہنمائی نہیں کی کہ تم یہ سمجھ سکو، خورد و نوش میں (جو دنیا کی لذتوں کا سرچشمہ ہے) انسانوں کا حصّہ حیوانوں کی نسبت سے کتنا حقیر ہے۔ سوچو ایک جانور انتہائی بے فکری سے مزے لے لے کر جس قدر رکھاتا ہے کیا اُس کا دسواں حصّہ بھی تمہارے پیٹ میں جاتا ہے۔ پھر مقدار کی کمی کے ساتھ فکر و بے اطمینانی اور خوف کی مصیبت جُدا رہی۔ اچھا اب اگر انسانوں کے لیے بھی وہی کچھ ہو جو بہائم کے لیے ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی کہ انسانوں کا شمار بھی اسی جنس میں ہونے لگے۔

انسان جب حیوانی خصلتوں کا خوگر ہوگیا تو اس کے معنیٰ کسبِ فضائل سے محروم ہونے کے علاوہ اور کیا ہوئے؟ جسمانی لذتوں کو نصب العین بنانے والا ملکات و کمالات کے اُس مقام پر کبھی نہیں پہنچ سکتا جو قدرت نے انسان کے لیے مخصوص کیا ہے، اور کیا تمہارے دماغ میں اتنی روشنی بھی باقی نہیں رہی کہ یہ سمجھ سکو دنیا عبور کی جگہ ہے قیام کی نہیں، سب جانتے ہیں دنیا کی کسی نعمت کو قرار نہیں جس دولت کی جستجو میں تم اس درجہ حواس باختہ ہو رہے ہو اُس کی بیوفائی پر ایک بے پڑھا لکھا انسان بھی یقین رکھتا ہے تمہیں تو خدا نے علم و فہم کی دولت سے نوازا ہے سوچو اور پھر سوچو۔

شیطان کا ایک بہت بڑا فریب

شیطان کے بے شمار حیلوں اور مکروں میں ایک بہت بڑا اور عجیب قسم کا حیلہ یہ ہے کہ پہلے وہ دولت والوں کو طرح طرح کی آرزوؤں اور تمناؤں کے جال میں پھنساتا ہے اور تلذذ و تنعّم کے سبز باغ دکھا کر اُن کی عقلیں اس طرح گم کر دیتا ہے کہ آخرت اور اعمالِ آخرت سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ جب اُسے یہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ سادہ لوح پوری طرح اُس کی گرفت

میں آچکے ہیں تو مشفقانہ اور ناصحانہ انداز میں اُن کو ترغیب دیتا ہے "دولت کو دانتوں سے دبائے رکھو، دیکھو یہ حفاظت کی چیز ہے ضائع نہ ہونے پائے" پھر اس سلسلہ میں اُس کی نہایت ہی گہری چال اور اس کا نہایت ہی باریک فریب یہ ہوتا ہے کہ یہی جو ابھی زخارف دنیوی کو حرز جاں بنانے کی نصیحت کر رہا تھا ایک صاف دل اور سچے مسلمان کو جس کے قلب میں آخرت کی شادکامیوں کی حقیقی طلب موجود ہے، دولت کی خرابیوں اور ہولناکیوں سے ڈراتا ہے، سچے مسلمان پر اس جادو کا چل جانا تعجب کی بات نہیں ایک طالب آخرت کسی وقت بھی دنیا کی محبت میں غرق نہیں ہو سکتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ غریب اس مردود ازلی کی فریب کاریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور دولت کی حفاظت کی نفرت اُس پر اس درجہ غالب آجاتی ہے کہ وہ سچ مچ اسے ایک مجرمانہ فعل سمجھنے لگتا ہے، مال سے نفرت کا یہ جذبہ شدہ شدہ اتنا ترقی کر جاتا ہے کہ یہ نیک بخت اپنا سارا اندوختہ کھو بیٹھتا ہے۔

ادھر یہ لعین جب دیکھتا ہے کہ شکار اُس کے پنجوں میں پھنس گیا ہے تو وہ اپنے سمند فکر کو اور تیزی سے آگے بڑھاتا ہے۔ بے تکلفانہ کہتا ہے "ایمان کی حفاظت چاہتے ہو تو دنیا پر لات مارو، زاہدانہ زندگی اختیار کرو، وسائل معیشت کی تلاش اور کسب و اکتساب کی زنجیروں سے آزاد ہو جاؤ"

انداز بیان کس قدر معصومانہ ہے، قالب کتنا پاکیزہ ہے لیکن اس کی تہ میں دغابازی کے کیسے کیسے جال بچھے ہوئے ہیں؟ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اور خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ابلیس جس نے خداع و زُور کے تمام راستوں پر اپنے پہریدار بٹھا رکھے ہیں اس ارادتمند کے سامنے اس کے کسی برخود غلط شیخ طریقت کی زبان سے کہلاتا ہے "بس جو کچھ ہے خرچ کر ڈالو، دنیا کی الجھنوں میں کب تک پھنسی رہو گے، یاد رکھو جب تک تمہارے پاس صبح، شام کا کھانا بھی موجود ہے زاہدوں اور متوکلوں کی صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے اور عزیمت کا وہ مرتبہ تم کو نہیں مل سکتا جو اہل زُہد کے لیے مخصوص ہے"

اس مضمون کی تاکید اور مطلب براری کے لیے ایسی ایسی ضعیف، غیر صحیح بلکہ موضوع روایتیں سنائی جاتی ہیں جن کا نہ کوئی پایۂ اعتبار ہوتا ہے، نہ درجۂ ثبوت اور جن کی کوئی اصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں نہیں پائی جاتی۔

اب سُنیے! یہ اللہ کا بندہ اِن چکروں میں پڑ کر جب اپنا سب کچھ برباد کر دیتا ہے اور اُس کی معاش کے تمام ذرائع معطل ہو جاتے ہیں تو ایسی حسرتناک صورت رونما ہوتی ہے جس کے تصور سے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے، وہ جو پہلے دوسروں کی خدمت کرتا تھا جس کا ہاتھ عزیزوں اور دوستوں میں اونچا رہتا تھا آج وہ اپنے دوستوں سے داد و دہش کا منتظر رہتا ہے۔ اُس کی نگاہیں عزیزوں کے دستِ کرم پر لگی رہتی ہیں، وہ جو کسی امیر کے سامنے نہیں جھکتا تھا جس کا استغنا ہمیشہ اُسے سر بلند رکھتا تھا اب وہ دولت والوں کے دروازوں کا طواف کرتا پھرتا ہے بلکہ اُن کی چوکھٹ پر پیشانی رکھتے ہوئے بھی اُسے ندامت محسوس نہیں ہوتی، کیونکہ یہ کھلی بات ہے کہ زہد اور ترکِ دنیا کا یہ عہد زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

طبیعت کے تقاضوں پر قابو پانا ہر ایک کا کام نہیں۔ زہد و توکل کی یہ راہ ایسی نہیں تھی جس سے پچھلے پاؤں لوٹنا نہ پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو بُرا سمجھ کر ترک کیا تھا اُس سے زیادہ بُری چیز کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب از سرِ نو تحصیلِ دنیا کے لیے جو سودا کرنا پڑتا ہے وہ دین و آبرو کا سودا ہوتا ہے۔ یہ دنیا کو مُردار سمجھنے والا دنیا طلبی کے جذبہ سے ایسا سرشار ہوتا ہے کہ خودداری، عزتِ نفس بلکہ دین و مذہب تک کو رسوا کر دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حالانکہ یہ شخص اکابر اعاظمِ رجال (بڑے بڑے لوگ) کی زندگیوں اور سیرتوں پر نظر رکھتا اور ارشاداتِ نبوی پر غور کرتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ وسائلِ معاش کی تحصیل اللہ کے تمام پیغمبروں کی، پیغمبروں کے تمام سچے اُمتیوں کی سنت ہے۔ (باقی)

لطائفِ ادبیہ

معلوم نہیں کیوں؟

ہندوستان کے مشہور شاعرِ شیوا بیاں حضرتِ جگر مراد آبادی پچھلے دنوں علاج کی غرض سے دہلی آئے تھے۔ اثنائے قیام میں آپ دفتر برہان میں بھی تشریف لائے، اور ارکانِ ندوۃ المصنفین کو دیر تک اپنے وجد آفریں کلام سے بہرہ اندوز کرتے رہے۔ آخر میں آپ نے ناظرینِ "برہان" کے لیے خود اپنے قلم سے لکھ کر ایک تازہ غیر مطبوعہ غزل عنایت فرمائی جس کو ہم شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ جگر جتنے بڑے شاعر ہیں اُس سے زیادہ پیکرِ اخلاص و محبت انسان ہیں اور وہ صرف دماغ کے نہیں بلکہ درحقیقت وہ دل اور روح کے اعتبار سے بھی شاعر ہیں۔ غزل ذیل صرف ایک فسونِ شاعری نہیں بلکہ "آہِ" ہلاک جستجو" دل کی ایک صدائے درد و الم ہے۔ "برہان"

بے تاب ہے، بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و باصرار
وہ جرعہ بھی زہرآب ہے معلوم نہیں کیوں

خلوت میں بھی، جلوت میں بھی گھیرے ہوئے ہو دل کو
اک شعلۂ بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

تو ساز کہ خود نغمۂ عریاں تھا اُسی کو
اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

بے نام سی اک یاد ہے کیا جانیے کس کی
بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں

کل تک یہی دنیا سبدِ گل تھی مگر آج
بے رنگ ہے، بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا
اب تک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے، کہ ہر تازہ تغیر
میرے لیے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

درسِ حیات

از جناب نہال سیوہاروی

عشق کا درس محبت کا بیاں تازہ کریں
آؤ ہنگامۂ تسخیرِ جہاں تازہ کریں

فرقِ عالم کو جھکا دیں طرف میخانہ
شیوۂ بندگیِ پیرِ مغاں تازہ کریں

آؤ ہر دل کو بنائیں تپشِ آلودۂ شوق
آؤ ہر سینہ میں اک عزمِ جواں پیدا کریں

پھر سنائیں اُسی انداز سے افسانۂ عشق
آؤ آرائشِ اسلوبِ بیاں تازہ کریں

ذرّہ میں سطوتِ خورشید کو کر دیں انساں
قطرہ میں ہمتِ سیلابِ رواں پیدا کریں

کاہ میں از سرِ نو رنگِ خودی دوڑا کر
جذبۂ ہمسریِ کوہِ گراں تازہ کریں

پھر ہوئے ذوقِ خلشِ تیر و سناں فرسودہ
آؤ ذوقِ خلشِ تیر و سناں پیدا کریں

پھر ہے آماجگہِ فتنۂ و شورش یہ جہاں
آؤ بزمِ طربِ امن و اماں تازہ کریں

پھر محبت سے کریں کون و مکاں کو معمور
رونقِ گم شدۂ کون و مکاں تازہ کریں

آؤ پھر جنسِ معانی کا کریں نرخ بلند
یعنی سرگرمیِ تزئینِ دکاں تازہ کریں

داغِ دل مثلِ چراغِ تہِ داماں کب تک
آؤ تا بندگیِ نارِ عیاں تازہ کریں

تا بکے عزمِ فتوحاتِ جہاں سے یہ گریز
آؤ یکبار فتوحاتِ جہاں تازہ کریں

باز ہنگامہ زنِ گنبدِ دوار شویم
زندگی را سببِ گرمیِ بازار شویم

رباعیاتِ ہادی

جناب سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری

چوں صرصرِ گرم از فضائے تخلیق تنہا بجہاں درآمدم با تحقیق
باسرعت ہمچناں کہ بر میگردم در راہِ نفس نیز مرا نیست رفیق

از بہرِ گداز در جہاں آمدۂ می سوز کہ بہرِ امتحاں آمدۂ
مگذار کہ اشکِ تو بخشکد در چشم بر رقت و درد پاسباں آمدۂ

آں وقت کہ ما دریں جہاں آمدہ ایم باشورشِ گریہ تواماں آمدہ ایم
شرحے دہد ایں ز مقصد بودن ما یعنی پئے رنجِ دیگراں آمدہ ایم

یا روئے فلک مہر درخشندہ شو یا زیر زمیں جوہرِ تابندہ شو
تدبیر و عمل از تو تقاضا شو چیزے کہ شوی بہتر و ارزندہ شو

اے وائے براں کہ خویشتن را در باخت با حسنِ حیاتِ خود نہ آسنے پرداخت
در محفلِ ایں جہاں چو شمع تاباں بے نور فشاندنے خودش را بگداخت

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) ندوۃ المصنفین کا دائرۂ عمل تمام علمی حلقوں کو شامل ہے۔

(۲) أ۔ ندوۃ المصنفین ہندوستان کے اُن تصنیفی، تالیفی اور تعلیمی اداروں سے خاص طور پر اشتراکِ عمل کریگا جو وقت کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ملت کی مفید خدمتیں انجام دے رہے ہیں اور جن کی کوششوں کا مرکز دینِ حق کی بنیادی تعلیمات کی اشاعت ہے۔

ب۔ ایسے اداروں، جماعتوں اور افراد کی قابلِ قدر کتابوں کی اشاعت میں مدد کرنا بھی ندوۃ المصنفین کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔

محسنین :۔

(۳) جو حضرات کم سے کم پچیس روپیے سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفیں کے دائرۂ محسنین میں شامل ہونگے اُن کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی، بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارے کی طرف سے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی اور رسالہ "برہان" بطور ہدیہ پیش کیا جائیگا۔

معاونین :۔

(۴) جو حضرات بارہ روپیے سال پیشگی عنایت فرمائینگے اُن کا شمار ندوۃ المصنفین کے دائرۂ معاونین میں ہوگا، اُن کی خدمت میں بھی سال کی تمام تصنیفیں اور ادارے کا رسالہ "برہان" (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپیے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائیگا۔

احبّاء

(۵) چھ روپیے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے حلقۂ احبا میں داخل ہونگے۔

Registered No. L. 4305

ن حضرات کو ادارے کا رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا۔ اور ان کی طلب پر ادارے کی تمام مطبوعات
یمت پر پیش کی جائینگی۔

(۶) معاونین اور احبار کے لیے یہ سہولت بھی رکھی گئی ہے کہ اگر کسی وجہ سے یکشت بارہ روپے
چھ روپیے ادا کرنا ممکن نہ ہو تو معاونین یہ رقم تین تین روپیے کی چار قسطوں میں ہر سہ ماہی کے شروع
ہی میں عنایت فرمادیں اور احبا تین تین روپیے کی دو قسطوں میں ہر ششماہی کی ابتدا میں۔

چندہ سالانہ رسالہ برہان
پانچ روپیے

خط وکتابت کا پتہ:۔

مینجر رسالہ "برہان" قرول باغ۔ نئی دہلی

جید برقی پریس دہلی میں طبع کراکر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے
دفتر رسالہ "برہان" قرول باغ نئی دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

ایم اے، فاضل دیوبند

اغراض ومقاصد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) وقت کی جدید ضرورتوں کے پیش نظر قرآن وسنت کی مکمل تشریح وتفسیر مروجہ زبانوں علی الخصوص اردو وانگریزی زبان میں کرنا۔

(۲) مغربی حکومتوں کے تسلط واستیلا اور علوم مادیہ کی بے پناہ اشاعت وترویج کے باعث مذہب اور مذہب کی حقیقی تعلیمات سے جو بُعد ہوتا جارہا ہے بذریعہ تصنیف وتالیف اُس کے مقابلہ کی مؤثر تدبیریں اختیار کرنا۔

(۳) فقہ اسلامی جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی مکمل ترین قانونی تشریح ہے موجودہ حوادث و واقعات کی روشنی میں اس کی ترتیب وتدوین۔

(۴) قدیم وجدید تاریخ، سیر وتراجم، اسلامی تاریخ اور دیگر اسلامی علوم وفنون کی خدمت ایک بلند اور مخصوص معیار کے ماتحت انجام دینا۔

(۵) مستشرقین یورپ ریسرچ ورک کے پردے میں اسلامی روایات، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب وتمدن یہاں تک کہ خود پیغمبر اسلام صلعم کی ذات اقدس پر جو ناروا بلکہ سخت بے رحمانہ اور ظالمانہ حملے کرتے رہتے ہیں، اُنکی تردید ٹھوس علمی طریقے پر کرنا اور جواب کے اندازِ تاثیر کو بڑھانے کیلئے خصوص صورتوں میں انگریزی [illegible] اختیار کرنا۔

(۶) اسلامی عقائد ومسائل کو اس رنگ میں پیش کرنا کہ عامۃ الناس اُنکے مقصد ومنشا سے آگاہ ہوجائیں اور اُن کو معلوم ہوجائے کہ ان حقائق پر زنگ کی جو تہیں چڑھی ہوئی ہیں اُنہوں نے اسلامی حیات اور اسلامی روح کو کس طرح دبا دیا ہے۔

(۷) عام مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کو جدید قالب میں پیش کرنا خصوصیت سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ کر مسلمانوں کے بچوں کی ذہنی تربیت اسی طریقے پر کرنا کہ وہ بڑے ہو کر تمدن جدید اور تہذیب نو کے مہلک اثرات سے محفوظ رہیں

برہان

جلد اوّل شمارہ ۶

شوال ۱۳۵۷ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

آہ مصطفیٰ کمال پاشا!

نومبر ۱۹۳۸ء کا سب سے زیادہ المناک حادثہ جس نے تمام عالم اسلامی میں رنج وغم کی ماتمی صفیں بچھا دیں مصطفیٰ کمال کی وفات کا حادثہ ہے مصطفیٰ کمال کا وجود اس زمانہ میں مسلمانوں کے تاجِ عظمت وبزرگی کا ایک درخشندہ موتی، اور اسلامی سطوت وصولت کی ایک شمشیر لرزہ فگن تھا۔ وہ دبدبہ وشوکت اسلام کے قصر رفیع کے ایسے ستون تھے جس کے گرتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام عمارت میں زلزلہ آگیا، اور اس کے بام ودر پر کپکپی طاری ہوگئی ہے۔

وما کان قیسٌ هلکهٗ هلك واحدٍ ولکنّهٗ بنیانُ قومٍ تهدّما

وہ ۱۸۸۱ء میں سالونیکا کے ایک غریب گھرانہ میں پیدا ہوئے، ابھی عمر نو برس کی ہی تھی کہ سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، ماں انتہا درجہ کی عابدہ زاہدہ تھیں انہوں نے ہر چند چاہا کہ بیٹا دینی تعلیم حاصل کر کے مُلا بنجائے، لیکن جس کی قسمت میں ترکی کے مریض نیم جاں کی مسیحائی لکھی ہوئی تھی اور جس کو غازی

بن کر عالم میں رونما ہونا تھا، وہ کس طرح اس مفت خوری پر آمادہ ہوسکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے فوجی تعلیم حاصل کی اور ٹرکی کے مختلف معرکوں میں اپنی شجاعت و بسالت کے وہ حیرت انگیز جوہر دکھائے جس نے ٹرکی کی تاریخ کو یکسر منقلب کرکے رکھ دیا، مصطفیٰ کمال شروع سے ہی حریت پرست اور استقلال کوش تھے، وہ خلیفۂ وقت کو عیسائی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کھلونا بنا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا، اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ٹرکی کو اجنبی عناصر سے پاک و صاف کرکے اتنا مضبوط و قوی بنا دیا جائے کہ پھر کسی حریف کو اُس کی طرف نگاہ حرص و آز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ اس سلسلہ میں اُن کا تعلق ایک ایسی انقلاب پسند جماعت سے ہوگیا جو موجودہ خلافت کا تختہ اُلٹ کر ٹرکی کی حریت و استقلال کے لیے راہ صاف کرنا چاہتی تھی۔ اِس جرم میں مصطفیٰ کمال کو کئی بار قید خانہ کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس مرد یقین و اذعان کا عزم بلند ان تکلیفوں سے کہیں پست ہوسکتا تھا؟ وہ جب کبھی قید خانہ سے باہر آیا، اُسی ولولۂ عزم کے ساتھ، اور اسی جنونِ استقلال و آزادی کے ساتھ جو تندرست جوانی کے خون کی طرح اُس کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا، اور جس نے اُس کی زندگی کو پارۂ لرزاں و شعلۂ سوزاں کی طرح بے چین کر رکھا تھا۔

دنیا کی تاریخ میں ایسے بڑے لوگ کم ملینگے جو بیک وقت دل اور دماغ دونوں کی خوبیوں کے مالک ہوں۔ خیبر کا سا گردہ و جگر اور فولاد کی مانند دل رکھتے ہوں، اور دماغ نورِ بصیرت و تدبر کی شمع روشن ہو، خدا نے غازی مصطفیٰ کمال کو دونوں قسم کی خوبیوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، اور اس بنا پر اُن کے سوانح حیات موجودہ ٹرکی کی پوری عمرانی و تمدنی تاریخ ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء و ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان میں فوجی اسٹاف

کے ایک ممتاز رکن تھے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک صوفیہ میں ترکی سفارت کے ایک فوجی ممبر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد وقت آیا کہ اُن کی غیر معمولی جنگی قابلیتیں آشکارا ہوں۔ چنانچہ جنگ عظیم میں اُنھوں نے دردانیال کی مدافعت میں حیرت انگیز شجاعت کا اظہار کیا۔ پھر فلسطین میں ترکی افواج کی قیادت کی، اور گلی پولی کے معرکہ میں حق کی شمشیر آبدار بن کر نمودار ہوئے۔ ۱۹۱۸ء کے معاہدۂ سیورے کی رُو سے جب اتحادیوں نے ترکی کے مریض نیم جان کے حق میں موت کا فتویٰ صادر کردیا اور مئی ۱۹۱۹ء میں یونانی افواج نے سمرنا پر پڑاؤ ڈالا تو مصطفیٰ کمال کسی طرح اناطولیہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور یہاں اُنھوں نے ترک نوجوانوں کو جوش دلا کر حزب وطنی کی ایک جماعت میں منسلک کردیا۔ پھر اُنھی نوجوانوں کی ایک لاکھ کی جمعیت کے ساتھ ستمبر ۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے یونانیوں کو اتنی زبردست شکست دی کہ وہ ایشیائے کوچک کو بصد حسرت و یاس چھوڑ دینے پر مجبور ہوگئے۔ پھر یہی وہ بہادر سپاہی اور فاتح جرنیل تھا جس کے غیر معمولی تدبر نے ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کے معاہدۂ لوزان میں اُن لوگوں کو بھی ٹرکی کی دستاویز حیات پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے مجبور کردیا جو زاغ و زغن کی طرح اُس کے لاشہ پر جشن دعوت منانے کی تیاریاں کیے بیٹھے تھے مصطفیٰ کمال کا یہ کارنامہ جس نے لائڈ جارج جیسے گرگ باراں دیدہ، اور دوسرے مدبرین برطانیہ کو غرقِ تحیر کردیا، اتنا عظیم الشان تھا کہ ملک ملک میں اس پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا گیا اور اُنھیں غازی کے خطاب سے پکارا جانے لگا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء کا دن ٹرکی کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ جبکہ ٹرکی نے غازی مصطفیٰ کمال کی انقلاب آفریں ہمت و عزم، کوہ آسا استقلال و پامردی اور حیرت انگیز حزم و دور اندیشی کی بدولت ایک نیا جنم لیا۔ اور تمام پچھلی آلائشوں سے پاک و صاف ہو کر ٹرکی جمہوریت کا اعلان کردیا جس کے صدر

خود مصطفیٰ کمال منتخب ہوئے۔ یکم نومبر ۱۹۲۳ء کو سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور نہ صرف سلطان بلکہ پورے عثمانی خاندان کو ترکی سے نکلنا پڑا۔

صدر جمہوریہ ترکی کی حیثیت سے غازی مصطفیٰ کمال نے جس وادی پُرخار میں قدم رکھا تھا، اُس سے پورے طور پر صحیح سلامت نکل آنا اُن کے تدبر اور مآل اندیشی اور وقت شناسی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس زمانہ میں ترکی کے لوگوں پر بالعموم جہالت کا غلبہ تھا۔ قدامت پرستی حد سے زیادہ تھی۔ غازی مصطفیٰ کمال نے ترکی کو عہد جدید کی ایک زندہ و ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے اصلاحات کا جو زبردست پروگرام بنایا تھا۔ اُس پر وہ سخت سے سخت مخالفتوں کے باوجود شدت سے کاربند رہے۔ اس پندرہ سال کے عرصہ میں اُن کے قتل کی سازشیں بھی ہوئیں، اور بغاوتوں کے شعلے بھی بھڑکے لیکن مصطفیٰ کمال نے ان سب کو ختم کرکے رکھ دیا۔ آج ترکی صنعت و حرفت، معاشرت، تعلیم اور اقتصادی حالات کے اعتبار سے عہد حاضر کی بڑی سی بڑی متمدن قوم سے پیچھے نہیں ہے۔ شاہ امان اللہ خاں کو اپنے مشن میں ناکام ہوکر افغانستان سے ہجرت اختیار کرنی پڑی، لیکن غازی مصطفیٰ کمال اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی قوم کی نفسیات اور مزاج سے بخوبی واقف تھے، اور خود بھی اصلاحی اسپرٹ کا ایک ایسا جذبۂ معتدل رکھتے تھے جو اُن کی کامرانیوں کا ضامن تھا۔ غازی مرحوم نے ترکی کو زندہ قوم بنا کر نہ صرف اپنے ملک پر بلکہ تمام مسلمانوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ کیونکہ ترک جب تک مسلمان ہیں اُن کا رشتۂ اخوت مسلمانانِ عالم سے منقطع نہیں ہوسکتا۔

غازی مصطفیٰ کمال کے جزئی اعمال و افعال سے یا اُن کی بعض اصلاحاتِ وطنی سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ہم کو یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کردینی چاہیے کہ جو مجاہدِ حریت و آزادی حق کی راہ میں سر بکف ہو کر میدانِ جنگ میں اپنی جان کی بازی لگادے، وہ اُن ہزاروں خانقاہ نشینوں سے بدرجہا بہتر ہے جو ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے تسبیح و مصلّٰی کا شغل تو رکھتے ہیں لیکن حق کی حمایت میں اپنی ایک انگلی بھی شہید کرانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ شہدا بدر و حنین کے جامہائے گلرنگ و دامنہائے صد چاک کی قسم ایک سرفروش اسلام کا نعرۂ تکبیر جو کفر و شرک کے سربفلک ایوانوں کو خاک مذلت پر گرادے، اُن بے روح سجدہائے بندگی سے کہیں زیادہ افضل و اشرف ہے جو ایک کافر کے دل میں بھی خروش پیدا نہیں کرسکتے

وہ مصطفیٰ کمال جس نے اسلام کی دشمن طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اور جس نے اپنے مجاہدانہ عزم و حوصلہ سے ٹرکی کی نعش کو جابر و قاہر حکومتوں کے پنجۂ استبداد و استیلا سے چھین کر از سرِ نو اُس میں زندگی کی روح پھونک دی، کیا اُس پر طعن کرنے کا حق کسی ایسے شخص کو حاصل ہوسکتا ہے جس کا دل توپ و تفنگ کی آواز سن کر ہی دہل جاتا ہے اور رسمی عبادتوں اور ریاضتوں کے باوجود دینِ حق کی مردانہ وار حمایت کا ایک ادنیٰ سا جذبہ اور ولولہ بھی نہیں رکھتا۔

ابو محجن ثقفی شراب نوشی کے جرم میں گرفتار تھے، اُنھوں نے دور سے دیکھا کہ قادسیہ کے میدان میں مسلمان اور ایرانی برسرِ پیکار ہیں، جذبۂ مردانگی و شجاعت نے جوش مارا۔ لشکرِ اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاص رض کی بیوی سے درخواست کی کہ خُدا کے لیے ذرا میری بیڑیاں کھول دو، میں جنگ میں

شریک ہونگا اور پھر واپس آکر بیڑیاں پہن لونگا۔ انہوں نے منظور کرلیا۔ ابو محجن حضرت سعد کے گھوڑے پر بیٹھ سیدھے میدانِ جنگ میں جا پہنچے، اور دشمنوں کی صفوں میں گھس کر دادِ شجاعت دینے لگے جملہ میں ممتاز تھے۔ حضرت سعد نے اپنے بالاخانہ سے یہ منظر دیکھا تو بول اُٹھے "حملہ تو ابو محجن کا سا ہے مگر گھوڑا میرا ہے"۔ جنگ کے ختم پر ابو محجن واپس ہوئے تو حسب وعدہ کہا مجھ کو بیڑیاں پہنا دو۔ لیکن جس نے دین حق کی حمایت میں اِس قدر جان فروشی کا ثبوت دیا تھا۔ حضرت سعدؓ کب اس کو ایک جزئی فروگزاشت پر قید کرسکتے تھے۔ فرمایا "لا اضربنك ابدًا" اب میں تم کو کبھی شراب نوشی کے جرم میں نہیں مارونگا۔ ابو محجن نے کہا "تو اب میں کبھی شراب بھی نہیں پیونگا"

دنیا میں کتنے بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار انسان مرتے ہیں، لیکن کتنے آدمی ہیں جو اُن کے ماتم میں اشکبار ہوتے ہوں۔ مصطفیٰ کمال کی وفات ہوئی تو عالم میں کہرام مچ گیا۔ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں اُن کا ماتم کیا گیا، اور اُن کے لیے مغفرت و بخشش کی دعائیں کی گئیں۔ ایصال ثواب کے جلسے ہوئے، فاتحہ خوانی ہوئی، اور پھر جب جنازہ اُٹھا تو ترکی کا بچہ بچہ گریاں وزاری کناں تھا، عورتوں کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ فرط غم والم سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں "آہ مصطفیٰ کمال! تم کہاں گئے، تم کہاں گئے"۔ یہ عام آہ وبکا اور شیون وماتم اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص اپنی قوم اور اپنے ملک ووطن کے لیے جان کی قربانی میں بھی دریغ نہیں کرتا، وہ اُن ہزاروں عابدوں اور زاہدوں سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعہ اپنی نجات کا سامان تو کرلیتے ہیں، لیکن اپنے بھائیوں کے لیے ایک رات کی نیند بھی قربان نہیں کرسکتے۔ حق تعالیٰ غازی مصطفیٰ کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنی بیش از بیش رحمتوں

سے نوازے۔ آمین

مولانا شوکت علی مرحوم

اسی مہینہ کا دوسرا المناک سانحہ مولانا شوکت علی خادم کعبہ کی وفات ہے، شوکت علی مرحوم ہندوستان کے اُن چند مسلمانوں میں ایک تھے جن کی شہرت نہ صرف ہندوستان تک محدود ہے بلکہ دنیائے اسلام کے دور و دراز گوشوں تک ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مرحوم بجا طور پر اس شہرت و احترام کے مستحق تھے۔ پچھلے چند برسوں کو چھوڑ کر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کی زندگی قربانی، ایثار، ولولہ کار اور جوشِ عمل کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی، جنگِ طرابلس اور جنگ بلقان سے لے کر اب تک ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے متنوع دور گذرے ہیں مرحوم کی خدمات اُن تمام دوروں میں اس قدر نمایاں اور اس قدر روشن ہیں جنہیں کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا "علی برادران" ہندوستان کی دو شخصیتوں سے مرکب ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے زبان پر آتے ہی کردار و عمل اور شجاعت و بسالت کا ایک سبق آموز نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

صد حسرت و افسوس کہ ہندوستان اپنے ایک جانباز بہادر سپاہی اور پُرانے خادم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن حق تعالیٰ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے اور دامانِ رحمت میں جگہ دے۔

ایک مژدۂ جانفزا

حوادث کی ان اندھیریوں اور غم و اندوہ کے اس ہجوم میں یہ خبر انتہائی مسرت کے ساتھ سُنی جائیگی

ن نے مجاہد جلیل حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کو ہندوستان واپس تشریف لانے کی اجازت دیدی ہے

ت مولانا عنقریب حجاز سے اپنے وطن مالوف سندھ پہنچنے والے ہیں۔

مولانا کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ ایک بے مثل سیاسی مدبر ہونے کے علاوہ

ت بلند پایہ عالم دین ہیں اور اس دور قحط الرجال میں اُن کا وجود نہایت ہی گرانمایہ ہے۔

مسلمانانِ ہند پچیس سال سے اپنے اس محبوب رہنما کے انتظار میں چشم براہ تھے شکر کہ بُعدُ

کا یہ زمانہ ختم ہوا اور اہل ہند کو ایک دفعہ پھر اس پیکر علم و سیاست کی بصیرت سے مستفید ہونے

ع مل گیا۔

ہم ارادت وعقیدت کے انتہائی جذبات کے ساتھ اپنے واجب التعظیم بزرگ کا خیر مقدم کرتے

ابنائے دیوبند کو مبارک ہو کہ وہ جس نے انھیں سب سے پہلے حیاتِ اجتماعی کا درس دیا تھا،

ہ نے موتمر الانصار کی بنیاد قائم کر کے دار العلوم کی مرکزیت کو ہر جماعت اور ہر طبقہ سے تسلیم کرایا

ج اُن کی رہنمائی کے لیے پھر تشریف فرما ہے۔

اے خوش آں روز کہ آئی وبصد ناز آئی

"فہم قرآن" کی تین قسطیں قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں، ابھی اس سلسلہ میں ہمیں بہت کچھ کہنا ہے

ر مجبی جناب مولوی عبد المالک صاحب آروی جو ہندوستان کے ارباب قلم میں نمایاں شہرت

ہیں اور "نگار لکھنؤ" کے بہت بڑے قلمی معاون ہیں، انھوں نے ازراہِ اخلاص و بے تکلفی اپنے

گرامی نامہ میں ہمارے مضمون پر چند شکوک و شبہات کا اظہار فرمایا ہے۔ گرامی نامہ اور ہمارے جواب

دونوں کی حیثیت اگرچہ نجی ہے تاہم ہمارا خیال ہے کہ مولوی صاحب موصوف کی طرح متعدد اصحاب
ہونگے جن کے دل میں اسی طرح کے شکوک گذر رہے ہونگے۔ بنابریں ہم مولوی صاحب کے گرامی نامہ کا
ضروری حصہ اور اپنا جواب شائع کر رہے ہیں:-

حضرت مولانا صاحب زاد کرمہ۔ السلام علیک۔

آج برہان ملا، آپ نے فہم قرآن کے سلسلہ میں چودہ علوم کی معرفت لازم ٹھہرائی ہے۔ لغات
صرف ونحو، اور تفاسیر صحابہ (یعنی احادیث کی کتب تفسیر) کے علاوہ اور کون علوم ہیں؟
اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی فقیہہ یا عالم دین کی اس اُپج یا اجتہاد سے معارف قرآن اور
نکات قرآن پر ناقدانہ نظر ڈالنے کے لیے ان چودہ علوم کا جاننا لازم کیسے آسکتا ہے میں
اس کو نہیں سمجھا ذرا تفصیل سے سمجھائیے، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جب تک درس
نظامی کی فرسودہ کتابوں پر سر نہ کھپایا جائے فہم قرآن، تدبر فی القرآن کی منزل آہی نہیں
سکتی، اب آپ ہی فرمائیے کہ اللہ میاں باوجود اس قدر رحم وکرم کے ایسا جبر کیونکر پسند
فرمائینگے، چودہ علوم؟ معاذاللہ! تو کیا باضابطہ ایک شخص بی اے پاس کر کے اگر لغات،
صرف ونحو اور احادیث کی مدد سے قرآن مجید کے دقائق ونکات سمجھنا چاہے، تو گویا وہ
اس سے بالکل محروم رہیگا کیونکہ اب اس کے پاس وقت تو ہے نہیں کہ آٹھ سال تک
دیوبند یا ندوہ جاکر حصول خیر وبرکت کرے، حالانکہ جہاں تک متن کے ترجمہ کا تعلق ہے
اور اس سے استنباط مسائل کا، لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق
ایسی ایسی کتابیں ملتی ہیں کہ عہد حاضر میں کسی ندوی یا (معاف کیجیے) دیوبندی کا دماغ

تک ہرگز بھی نہیں ہو سکتا، اسی پر ناز کرتے ہیں تو آپ حضرات چیں بجبیں ہوتے ہیں، بایں علم و
فضل، روشن خیالی و وسعت مشربی آپ پر بھی مولویوں کی "برہمنیت" طاری ہو گئی، اور
آپ نے ویدوں کی طرح تعلیمات قرآنی اور اُس کے فہم و عرفان کو بھی اپنی جماعت تک
محدود کر لیا۔ "خدا توفیق کیش کفر بخشد دیں پناہاں را"

محب محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ آیا، آپ یقین کیجیے میں کسی کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا، چہ جائیکہ آپ ایسے مخلص دوست کی تنقید
سے جس کی نیت اور جس کے خلوص و محبت پر مجھ کو اعتماد تام ہے آپ اس سے بھی زیادہ سخت اور ترش لہجہ میں
کہیے میں بُرا نہیں مانونگا مگر ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا خلوص جو میرے ساتھ ہے اُس خلوص سے کم نہ ہونے پائے
جو آپ کو حضرت نیاز سے ہے۔ جس چیز پر تنقید کی گئی ہے اُس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو آپ اس معنیٰ
کو پیش نظر رکھیے جو میں "فہم قرآن" سے مراد لیتا ہوں، اور جس کو سامنے رکھ کر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد
جیسا کہ میں نے اس مضمون کے دوسرے نمبر میں تحریر کر دیا ہے فہم قرآن سے یہ ہے کہ کوئی شخص اُس کو پڑھ کر
مجتہدانہ طور پر استنباط احکام کر سکے اور کلام کے مدلول و منطوق کو کما حقہٗ سمجھ سکے، تو اب اس معنیٰ کے پیش نظر
سوال پیدا ہوتا ہے کہ استنباط احکام کا حق کس کو حاصل ہے، اور کون مجتہدانہ طور پر قرآن کے فہم کا ادعاء
کر سکتا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں فہم قرآن کے اس معنیٰ کو ملحوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں۔ ورنہ اگر آپ فہم قرآن سے
احکام امر و نہی کو معلوم کرنا اور جو مضامین اس میں بیان کیے گئے ہیں اُن کو سطحی طور پر جان لینا مراد لیتے ہیں
تو میں آپ کی مخالفت نہیں کرونگا۔ اور اس اعتبار سے بے شبہ فہم قرآن کے لیے شرائط وہ نہیں ہیں جو میں لکھ
رہا ہوں۔

جہاں تک اس مسئلہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ دیوان غالب کو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جس طرح پڑھتے ہیں، ایک پشاوری بھی اس سے اتنا ہی مزہ لیتا ہے لیکن کیا اس پر تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہے؟ کیا اس پر نقد کرنے کے لیے اردو زبان کے مالہٗ و ما علیہ، اس کے محاورات، طرق استعمال، قواعد، فصاحت و بلاغت کے آئین و ضوابط، ذوق شعری فلسفہ وغیرہ وغیرہ کیا ان چیزوں کے نہ صرف جاننے بلکہ ان میں ایک نظر وسیع پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر:-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس کا تھوڑا بہت مطلب ہر اردو خواں اور کالج کا ہر ایک گریجویٹ سمجھ سکتا ہے لیکن کیا اس کی شرح کا حق ہر ایک کو ایسا ہی ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم، عبدالمالک آروی، نیاز فتحپوری اور حسرت موہانی کو ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر آپ کلام مجید کے متعلق (اسی حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایک متکلم کا کلام ہے) کس طرح یہ فرما سکتے ہیں کہ اس کے مدلول و منطوق کو سمجھنے کے لیے عربی کی معمولی شُدبُد کافی ہے، اس ادعا سے آپ کے خیال و استنتاج کے برعکس ویدوں کی طرح قرآن مجید کا اسلامی برہمنوں کے ساتھ مخصوص ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے ادعا کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو مجتہدانہ طور پر سمجھنے کے لیے چند شرائط ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے کہ ہر آسان سے آسان علم و فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے چند شرائط ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو ان شرائط کو پورا کر سکیگا فہم قرآن کا مدعی ہوسکتا ہے۔ اس میں ذات پات مقام و نسب وغیرہ کسی کی کوئی قید نہیں جس طرح طب آسان ہے مگر اس کے لیے قانون شیخ وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر شخص ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایم بی

بی ایس، ایل ایل بی، یا ایم اے، پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہوں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں قرآن آسان ہے۔ ہر شخص کو اس میں تدبر اور تفکر کرنا چاہیے، مگر اس کے لیے چند شرطیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ادعا سے میری "برہمنیت" کس طرح لازم آجاتی ہے۔

اب رہا چودہ علوم کی شرط کا معاملہ! تو یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ چودہ علوم براہ راست فہم قرآن کے لیے ضروری نہیں، بلکہ علماء ادب وبلاغت کے نزدیک کوئی شخص عربی نظم و نثر کو بخوبی سمجھ نہیں سکتا جب تک کہ وہ ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو۔ اور فہم قرآن کے لیے اولین ضرورت عربی کلام کو کما حقہ سمجھنے کی صلاحیت ہے۔ اس بنا پر لازم یہ آگیا کہ فہم قرآن عجمیوں کے لیے ان علوم کے بغیر دشوار ہے۔ یہ کس نے کہا کہ ندوہ یا دیوبند میں ہی ان علوم کی تحصیل کیجیے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان علوم کی بھی ضرورت نہیں اگر آپ کسی اور طریقہ سے کلام عربی کو کما حقہ سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں تو سبحان اللہ! پھر احمق ہے جو آپ سے کہے کہ ان علوم کو حاصل کیجیے۔ میں اگر ان علوم ادب کے بغیر امراء القیس، اعشیٰ، طرفہ کے عربی کلاموں کو ان کی فصاحت و بلاغت کے ادراک و شعور کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا، تو ظاہر ہے ان کے بغیر قرآن مجید کو جو عربی زبان کی انتہائی فصیح و بلیغ کتاب ہے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پس ہر وہ شخص جو آج فہم قرآن کا مدعی ہے اس سے دریافت کیجیے کیا وہ شعر عرب کو جانتا ہے کیا وہ عربی شعراء کے کلام کو بے تکلف سمجھ سکتا اور ان کے نکات و لطائف کو معلوم کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اُسے کیا حق ہے کہ وہ محض ترجمہ کی مدد سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح شروع کر دے۔ اقبال کی رموز بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن بتلائیے کیا ایک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو جاننے والا اقبال کے کلام سے اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک ایرانی یا فارسی کا کوئی خوش مذاق شخص؟

آپ نے مجھ کو مولویانہ "بے ہیئت" کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ میں ہر بوالہوس کی حُسن پرستی گوارا نہیں کر سکتا، ہاں "شیوۂ اہل نظر" رکھنے والے شوق سے آئیں اور قرآن کے حسن جہاں آرا کے جلووں سے بہرہ اندوز ہوں میں حسن کو صرف ایک تفریحی نظر بازی کی چیز نہیں سمجھتا، بلکہ میں اُس کی بارگاہ میں سودائے عشق سے بھرے ہوئے سروں کو خم دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ بجا لکھا ہے کہ غریب ندویوں اور دیوبندیوں کو تو اُن کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگتی جو لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق موجود ہیں، لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس سے نقص کیا لازم آیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ناکہ ایک غیر زباندان نے جو تفسیر کی تھی وہ معلوم نہیں ہو سکی لیکن اگر ایک شخص عربی نہیں جانتا تو آپ جانتے ہیں وہ قرآن فہمی کے اعتبار سے کس قدر گھاٹے میں ہے، وہ اُس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا، اس کے اقوال و افعال سے بے خبر ہے جس پر قرآن اترا، اُس ماحول سے نا آشنا ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور ان چیزوں کے متعلق اگر اس کے پاس چند معلومات ہیں بھی تو اُن لوگوں کی دی ہوئی جن کو اجنبی یا "مرد بیرون خانہ" کہا جا سکتا ہے۔ اب فرمائیے نقصانِ عظیم میں کون ہے؟ پہلا شخص یا دوسرا؟ بھائی! اس دور میں سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر بھی ابن عباسؓ اور ابنِ عمرؓ کے بجائے انگریزوں کی زبان سے سننا چاہتے ہیں، کیسے کیا آپ کی غیرت گوارا کریگی کہ آپ اُردو کے ایک شعر کا مطلب داغ و امیر کے بجائے کسی انگریز سے دریافت کریں، درآنحالیکہ وہ اُردو کے ذوق شعری سے نا آشنائے محض ہو۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کی شرط کے مطابق ایک شخص جو بی اے ہے اور تدبر فی القرآن کرنا چاہتا ہے۔ اگر اُس سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم پہلے چودہ علوم حاصل کرو تب اس قابل ہو سکتے ہو، تو اس سے

زد جبر لازم آئیگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس قدر فضل و کرم کے باوجود کس طرح یہ جبر گوارا کریگا، میں کہتا ہوں کہ
اگر ہر شخص طبیب نہیں ہوسکتا تو کیا وہ اپنے امراض کے علاج کے لیے کسی طبیب حاذق پر اعتماد نہ کرے آپ
کی تحریر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہر شخص جسے اپنے کسی مرض کے علاج کی ضرورت ہو اسی طب حاصل کرنی چاہیے
ہر شخص جو عدالت میں کوئی مقدمہ لڑنا چاہتا ہے اس کو بیرسٹری کا ڈپلومہ لینا چاہیے، جس شخص کو مکان بنانے
کی ضرورت ہو اس کو انجینیری کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن مجید میں تدبر کرنا
چاہتا ہے وہ تمام مشاغل دنیویہ کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کو مجتہدانہ طور پر سمجھ سکتا ہے، پس ہر شخص کو اجتہادی
طور پر "تدبر فی القرآن" کی دعوت دینا یہ جبر ہے یا یہ کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے اور ہم جس طرح دنیوی
معاملات میں ڈاکٹروں بیرسٹروں، پروفیسروں اور انجنیروں کی جماعت پر اعتماد کرتے ہیں اسی طرح
دینی و مذہبی معاملات میں بھی ایک جماعت ہو جس پر ہم اعتماد کلی کریں اور ہر ایک شخص سے یوں نہ کہیں
کہ اس کو خود اس جماعت (علماء دین) سے بے پروا ہو کر اپنی رائے اور عقل کے مطابق تفسیر کرنی چاہیے۔
آپ شوق سے تدبر فی القرآن کیجیے خدا آپ کے عزائم میں برکت اور حوصلوں میں وسعت عطا فرمائے
لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو محض اس بناء پر کہ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، اور
اگرچہ اس کو بڑے بڑے ائمہ کرام نے لکھا ہے، رد نہ کر دیجیے میں آپ کا مکتوب گرامی اور یہ جواب دونوں
اس ماہ کے برہان میں شائع کر رہا ہوں۔

"برہان" کیوں نہیں پہنچتا؟

اس کے باوجود کہ برہان پابندی وقت کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو انتہائی احتیاط

سے روانہ کیا جاتا ہے، دفتر میں کثرت سے ایسی اطلاعیں آرہی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ برہان کے بہت سے پرچے راستہ میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس صورتِ حال پر سخت تعجب و حیرت ہے، جن حضرات کو دفتر ندوۃ المصنفین اور دفتر برہان میں تشریف لانے کا اتفاق ہوا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دونوں دفتر ترتیب و تنظیم کے جدید اصولوں پر قائم ہیں اور ان میں کوئی بے ضابطگی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔

جہاں تک پرچوں کی روانگی کا تعلق ہے ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس سے زیادہ قابلِ اطمینان روانگی کی کوئی شکل نہیں ہو سکتی۔ ایک ایک پتہ مختلف نگاہوں میں کم گزرتا ہے، پتوں کی معمولی فروگزاشت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا، کم سے کم تین دفعہ تمام پتوں کو جانچا جاتا ہے۔ اندریں حالات ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس خرابی کی تمام تر ذمہ داری ڈاکخانوں کی بدنظمی پر ہے، سرشام کی اس لوٹ سے اگرچہ دہلی کا کوئی رسالہ اور اخبار محفوظ نہیں ہے، مگر معلوم ہوتا ہے برہان کو خاص طور پر اس ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہم مہینوں سے صبر کیے بیٹھے ہیں، مگر اب صبر کی انتہا ہو گئی ہے، قارئین کو چاہیے کہ اپنے اپنے مقامی ڈاکخانوں سے اس بے ضابطگی کا جواب طلب کریں، پوسٹ مینوں کو ہدایت کر دیں کہ اگر وہ اُن کی ڈاک حفاظت سے نہیں پہنچائیںگے تو اُن کے خلاف باقاعدہ کارروائی کی جائیگی۔ اس کے بعد بھی اگر کسی صاحب کے پاس زیادہ سے زیادہ ۲۰۔ تاریخ تک پرچہ نہ پہنچے تو وہ دفتر کو اُسی وقت اطلاع دے دیا کریں۔ اُن کی خدمت میں دوسرا پرچہ روانہ کر دیا جائیگا۔ دفتر کی خیالی بے ضابطگی پر دل ہی دل میں کڑھتے رہنا اور ہمیں بے خبر رکھنا قارئین کے لیے بھی تکلیف دہ ہے اور ہمارے لیے بھی۔

اسلام کا اقتصادی نظام

ابوالقاسم مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

لغت کی زبان میں قصد و اقتصاد "میانہ روی" اور "اچھے چلن" کا نام ہے، مگر علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی "دریافت" کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت کے پیدا کرنے کے مناسب طریقے، اُس کے خرچ کے صحیح استعمال، اور اُس کی ہلاکت و بربادی کے "حقیقی اسباب" بتا سکیں۔ اس لیے "علم الاقتصاد" اُس علم کا نام ہے جو ایسے وسائل سے بحث کرتا، اور اُس کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہو۔

"علم اقتصاد" اس معنی کے اعتبار سے دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک "اجتماعی" اور دوسرا "انفرادی" یا "منزلی"۔ ہماری بحث کا نقطۂ نظر "اقتصادِ اجتماعی" ہے۔ اس لیے کہ یہی زندگی کی اصل بنیاد ہے اور "انفرادی و منزلی" کے لیے دلیلِ راہ۔

قدیم و جدید علمی دنیا کے مفکرین، اور علماءِ بصیرین نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے حل کرنے کی برابر سعی کی ہے اور آج تک اُس سعی کا سلسلہ جاری ہے۔ یونان کے مشہور فلسفی "افلاطون" نے بھی اپنی کتاب "جمہوریت" میں اس مسئلہ پر اپنا نقطۂ نگاہ بیان کیا ہے۔ اور علماءِ جدید میں کیسل (Cassel) مِل (Mill) اسمتھ (Smith) ریکارڈو (Roscher) اور جون (Jhon) نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی بنانے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ اُن کی تصانیف اور اُن کے نظریوں سے واضح ہے اور آخر میں کارل مارکس (Karl marx) نے نظریۂ "اشتراکیت" (Socialism) اور اُس کے "عملی پروگرام" کے ذریعے یورپ میں جو انقلاب پیدا کیا اُس نے علمی حلقے "علمی نظام" اور "طرزِ حکومت" پر جو اثر ڈالا ہے اور

وہ موافقت و مخالفت کے رنگ میں نہ صرف یورپ کو متاثر کر رہا ہے بلکہ ایشیا اور مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں زبردست ہیجان برپا کیے ہوئے ہے۔ اور روس جو آج کل اشتراکیت کا عملی میدان بنا ہوا ہے دوسروں کو بھی اس نظام میں منسلک کرنے کے لیے پیہم جد و جہد کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک صرف نظریوں "تھیوریز" کا تعلق ہے ہمارے مضمون زیر بحث سے اُن کا کچھ زیادہ علاقہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم اس وقت ایک ایسے نظام سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو دنیاءِ انسانی کی ضروریات اور اُن کی عملی معیشت کے لیے بہترین پروگرام "نظام عمل" رکھتا ہو، یا یوں کہیے کہ وہ عام انسانوں کی اجتماعی اور انفرادی معیشت کا کفیل ہو۔ اور "تنازع للبقاء" کے میدان میں ہر ایک انسان کو زندہ رہنے، اور حسب استعداد ترقی کرنے کا پورا پورا حق دیتا ہو۔ البتہ اس مسئلہ کو بحث کا موضوع بناتے وقت "مذاہبِ عالم" کی تاریخ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ عدل و انصاف کے ساتھ یہ موازنہ کیا جا سکے کہ "عقل و نقل" کی تطبیق کی جد و جہد میں دنیا کے پیش کردہ نظاموں میں سے کون سا نظام اپنے اندر ایسی لچک رکھتا ہے جو اپنے بنیادی اور اصولی قوانین کو ہاتھ سے دیے بغیر مادی ترقیات کے دور میں بھی دینی اور اُخروی فلاح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی بہبودی کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اُن مبادیات کو بیان کر دیا جائے جو تمام عقلاء کے نزدیک اس مسئلہ میں "اصولِ موضوعہ" کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن ہی کی روشنی میں اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر اسلام کے اقتصادی نظام کو واضح کیا جائے، اور سب سے آخر میں عقلاءِ زمانہ اور مذاہبِ عالم کے اقتصادی نظام پر بطور موازنہ کے کچھ لکھا جائے۔

اصولِ موضوعہ جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ "اقتصادی نظام" کی اس لیے ضرورت پیش آتی ہے کہ ہر ایک انسان میں یہ فطری جذبہ ہے کہ اُس کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ مگر جب یہ انفرادی جذبہ "کشمکشِ حیات" میں ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے تو فطرت یا قانونِ قدرت (جو خدائے قادر کی جانب سے تمام عالمِ ہست و بود پر حاوی ہے) انسان کو

اجتماعی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، مگر یہ اجتماعی حیات بغیر کسی نظام کے وجود پذیر نہیں ہو سکتی تو اب اُس کے لیے ایک ایسے نظام کی ضرورت پیش آتی ہے جو اُس کے "فطری حق" کا کفیل اور ضامن ہو، اور ہر ایک انسان کو یہ حق دیتا ہو کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے حسب قوت و استعداد فائدہ حاصل کر سکے، اور اس استفادہ میں کوئی قانون یا کوئی قوت اُس کی مزاحم نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ وہ نظام معیشت اور اسبابِ معیشت کے لیے ایسے قوانین بیان کرے جس سے دولت اور دولت کے وسائل سے ہر ایک انسان فائدہ اُٹھا سکے، اور اس کا سد باب کرتا ہو کہ خدائے برتر کی یہ نعمتیں کسی خاص "فرد" یا خاص گروہ میں سمٹ کر نہ رہ جائیں۔ اس بنا پر اقتصادی نظام کے لیے حسب ذیل بنیادی اصول ہر عاقل کے نزدیک قابلِ تسلیم، اور بطور اصولِ موضوعہ کے ناقابلِ انکار ہیں۔

(۱) وہ ہر متعلقہ فرد کی معاشی زندگی کا کفیل ہو اور جماعت کا کوئی فرد بھی عملی جد وجہد کے بعد اُس سے محروم نہ رہے۔

(۲) ایسے اسباب کا قلع قمع کرتا ہو جس سے دولت یا اسبابِ دولت افرادِ انسانی میں حاکم و محکوم کا علاقہ قائم کرنے میں ذریعہ بنتے ہوں۔

(۳) دولت اور اسبابِ دولت کو کسی خاص فرد یا خاص جماعت کے اندر محدود ہونے سے روکتا ہو

(۴) محنت اور سرمایہ کے درمیان صحیح توازن قائم کرتا ہو۔

"اصولِ موضوعہ" کے پہلے نظریہ کی تشریح کی تو کوئی حاجت نہیں اس لیے کہ وہ خود اس قدر واضح ہے کہ آپ اپنی تشریح ہے، کون نہیں جانتا کہ خالقِ کائنات کے یدِ قدرت نے جب بے جان اجسام مثلاً جمادات (اینٹ پتھر) کو اپنی کائنات میں قیام و سکون کی جگہ دی ہے تو جاندار اجسام کو پیدا کر کے اُن کی معیشت کے لیے کوئی سامان مہیا نہیں کیا یہ کیسے قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے؟ اور اگر کیا ہے اور یقیناً کیا ہے۔ تو پھر اُس میں کسی کی تخصیص کے کیا معنی، کیوں ہر ایک "جان" کو یہ موقعہ میسر نہ ہو کہ وہ اس دنیا فانی میں اپنی معیشت

کے بدولت فائدہ اٹھا سکے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (پارہ ۱۲) (سورۂ ہود) — زمین پر رینگنے اور چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ — اور تمہارا رزق اور وہ شے جس کا وعدہ دیے گئے ہو آسمان میں (یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ) ہے۔

یہاں "رزق علی اللہ اور رزق فی السماء کے یہی معنی ہیں کہ اس کائنات ارضی میں ہر جاندار کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اور قدرتِ الٰہی کے دستِ کرم نے ہر فرد کو عطاءِ وجود کے ساتھ ساتھ اُس کی مدتِ بقا کے لیے خود ہی وسیع سامان مہیا کر دیے ہیں اور اُس نے کسی کو محروم المعیشت یعنی اسبابِ زندگی سے محروم پیدا نہیں کیا۔

دوسرے نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ "نظام" میں ایسی گنجائش نہیں ہونی چاہیے جو دولت میں تقسیم اور پھیلاؤ کی جگہ "ذخیرہ" اور "جمع" کی ایسی صورت پیدا کرے جس سے ذاتی "اسٹیٹ" کا قیام عمل میں آ کر افرادِ انسانی کو صرف "دولت" کی بنا پر حاکم اور محکوم دو حصوں میں بانٹ دے، اور اس طرح جماعتی نظام کی ہمہ گیری کا وہ فائدہ جو جماعت کے ہر فرد کو پہنچنا چاہیے تھا ایک خاص فرد یا خاص جماعت کے مصالح اور مقاصد کی خدمت کے لیے وقف ہو جائے، کیونکہ یہی وہ مہلک "جرثومہ" ہے جو نہ صرف افراد کو بلکہ اقوامِ عالم کو باہم ایک دوسرے پر ظلم و عدوان کرنے اور دستِ تظلم بڑھانے پر آمادہ کرتا، اور نہ صرف یہ بلکہ محکوم بنا کر محکوم قوم کی بڑی تعداد کو معاشی وسائل سے محروم کر دیتا ہے، اور اُن کے فطری حقِ زندگی کو سلب کر لیتا ہے، اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ "معاشی دستبرد" محکوم قوم کو اس کے مذہبی، سیاسی، علمی، اقتصادی غرض تمام حقوقِ انسانیت کو ختم کر کے اور اُس کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر اور حیوان بلکہ بیجان اجسام کی طرح بنا کر فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا — بیشک فرعون نے زمین (مصر) میں اودہم مچا رکھا ہے اور اُس کے

شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ	باشندوں میں پھوٹ ڈال کر پارٹیاں بنادی ہیں، ان میں سے
اَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ اِنَّهُ كَانَ	ایک گروہ کو کمزور کرتا رہتا ہے، اُن کے لڑکوں کو ذبح کرتا اور اُن
مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى	کی لڑکیوں کو باقی رہنے دیتا ہے وہ یقیناً مفسدوں میں سے ہے
الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ	اور ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم کمزوروں پر احسان کریں اور اُن کو
اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ ۝ (القصص رکوع ۱)	رہنما بنائیں، اور اُن کو وارث بنائیں۔

فرعون کی یہ حرکت "کہ مصر کی حکومت پر ذاتی "اسٹیٹ" قائم کر کے محض دولت و ثروت کے بل بوتے پر بنی اسرائیل اور قبطیوں میں پھوٹ ڈلواتا تھا اور ایک کو حاکم اور دوسرے کو محکوم بنا کر محکوم قوم کو ذلیل و رسوا کرتا تھا اور خدا کی زمین پر اُن کے تمام حقوق کو چھین کر اُن کو کمزور بناتا تھا، اللہ تعالیٰ کو اسی لیے ناگوار ہے کہ اس طرح حاکمیت اور محکومیت کا یہ مفسدانہ طریقہ محکوم قوم کی معیشت کے تمام ذرائع حاکم اور حکمراں قوم کی مصالح اور اُن کے مفاد کے لیے وقف کر دیتا ہے اور اس طرح وہ زندگی کے حق سے محروم ہو کر انسان ہونے کے باوجود بے جان اجسام کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بلکہ آہستہ آہستہ تمام حقوقِ زندگی سے بھی محروم ہو کر جلد ہی فنا کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔

تیسرے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ وہ نظام ایسے قوانین کا حامل نہ ہو جن کے ذریعہ سے دولت اور اسباب دولت سمٹ کر کسی خاص جماعت یا گروہ میں محدود ہو جائیں اور قوم کے افراد کا ایک بہت بڑا حصہ "قوت لایموت" کا بھی حقدار نہ رہے، بلکہ اس کے برعکس "جمع" و "ذخیرہ" کی بجائے تقسیم کے ایسے طریقے بتاتا ہو جس سے دولت کا مفاد قوم کے تمام افراد تک وسیع ہو سکے، اور سرمایہ داری کے اصول کے خلاف دولت بٹ کر سب میں پھیل جائے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ	(فقراء، مساکین، قرابت داروں، یتیموں وغیرہ پر اللہ نے جو یہ خرچ کرنے کا طریقہ بتایا ہے،
الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (حشر)	اس لیے ہے) تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف دولتمندوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔

ورنہ جس جماعت کو "سرمایہ داری" کا گھن لگ جاتا ہے پھر اُس کے عام افراد کی زندگی سخت خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور اس کا سب سے زیادہ مکروہ اور گندہ پہلو یہ ہے کہ خود قوم کے بعض اعضا ہی دوسرے اعضا کو تباہ کرنے، اور کِرم کی طرح چاٹ لینے میں جری اور بے باک ہو جاتے، اور ایسا کرنے کو اپنا اخلاقی حق سمجھنے لگتے ہیں، اور اس وجہ سے نہ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ اس "ظلم" کو قائم رکھنے کے لیے مکروفریب بے رحمی و بے حیائی جیسی بداخلاقیوں کو تیز فہمی ہوشیاری اور معاملہ داری کا نام رکھنے سے ادنیٰ سی بھی جھجک محسوس نہیں کرتے، اور آخر کار جسم کے اعضا ہی میں تصادم و تزاحم پیدا ہو جاتا ہے اور "محنت" و "سرمایہ" کے نام سے آپس میں وہ جنگ عظیم بپا ہوتی ہے کہ ساری قوم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات قوم کی قوم ہلاکت تک پہنچ جاتی ہے۔

چوتھے نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام زندگی کا صرف دو ہی چیزوں پر انحصار رہے۔ ایک "محنت" اور دوسرے "سرمایہ" لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کے پاس اگر سرمایہ کا قطعاً کوئی وجود نہ ہو مگر وہ محنت کر سکتا ہے تو اسباب کی موافقت قلیل عرصہ میں اُس کو سرمایہ پیدا کرا سکتی ہے، مگر اس کے برعکس کوئی شخص سرمایہ رکھتا ہے لیکن محنت کے لیے ایک لمحہ کو بھی تیار نہیں تو تھوڑی ہی مدت میں وہ اس سرمایہ کو ختم کر کے مفلس و قلاش ہو جاتا ہے، اسی فرق کو محسوس کرتے ہوئے سرمایہ دار ایک دوسری صورت اختیار کرتا ہے، وہ یہ کہ سرمایہ کو ترقی دینے کے لیے ایسے اصول تیار کرتا، اور اقتصادی نظام میں ان کو عمدہ شکلوں اور صورتوں کے ساتھ شامل کر کے فائدہ اُٹھاتا ہے، جو بغیر محنت کے تحصیلِ زر کے ذرائع پیدا کرتے ہوں اور اس طرح محنت کی قدر و قیمت کو گھٹا کر باقی سارے نظام کو بھی ایسی سطح پر لے آتا ہے کہ تمام کاروبار میں محنت ایک بے حیثیت چیز رہ جاتی ہے، اور سرمایہ کا درجہ بہت بلند نظر آنے لگتا ہے۔

ایسی صورت میں وہ "نظام" ایسا ہونا چاہیے کہ جو مذکورہ بالا خرابیوں کو کسی طرح رونما ہونے سے اور پوری پوری طرح اُن کا سدباب کر دے۔ اور ایسے قوانین کا واضع ہو جس سے "محنت" اور "سرمایہ" کے درمیان

ایسا توازن پیدا ہو جائے کہ سرمایہ اور محنت کے درمیان کشمکش کے جو اسباب پیدا ہو جاتے، اور تخریب نظام عالم کا باعث بنتے ہیں وہ یک قلم فنا ہو جائیں۔

یہ چوتھا نظریہ دراصل گذشتہ تین نظریوں کے تسلیم کر لینے کا قدرتی نتیجہ ہے یعنی اگر بیان کردہ تینوں نظریے صحیح اور معقول ہیں (جیسا کہ اجمالی طور پر ذکر ہو چکا اور عنقریب تفصیل سے معلوم ہو جائیگا) تو چوتھا نظریہ خود بہ خود یقینی ہے۔

ہم نے ان اصول کو "اصولِ موضوعہ" اس لیے کہا ہے کہ "علم اقتصاد" کا سب سے بڑا مقصد اور اُس کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ معاشی نظام میں ایسا کوئی خلل پیدا نہ ہو سکے کہ جس سے جماعت کے افراد یا انسانوں کے باہم معیشت "وجہ تصادم بن جائے، اور کوئی ایک فرد بھی اُس کی بدولت حصولِ معیشت سے محروم رہ جائے۔ تو اس اصل کے پیش نظر آنے والی تفصیل سے آپ خود اندازہ کر سکینگے کہ "اگر اقتصادی نظام" میں ان اصول سے باہر کوئی رُخ بھی اختیار کیا جائیگا وہ اعتدال سے جدا" افراط یا تفریط ہے۔ اور اعتدال کی راہ، ایک اور صرف ایک ہی ہے اور وہ ان ہی بیان کردہ "اصول" پر متفرع ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بعض "نظریے" اپنے منطقی دلائل کے اعتبار سے بہت زیادہ جاذبِ نظر، اور دلکش معلوم ہوتے ہیں، اور "اقتصادی نظام" یا معیشت کے پروگرام میں اس اعتبار سے اُن کی بہت اہمیت نظر آتی ہے، لیکن عملی میدان میں جب وہ "تجربہ کی "خراد" پر اُتارے جاتے ہیں، تو بعض تو بالکل ہی ناکارہ اور غیر مفید ثابت ہوتے ہیں، اور بعض اگرچہ کچھ کارآمد ضرور ہوتے ہیں لیکن نظری اہمیت کے مقابلہ میں اُن کی عملی اہمیت بہت ہی ہیچ نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس بعض نظریے اپنی صحتِ دلائل کے باوجود نئی اصطلاحات، جدید تعبیرات، ماحول کے اثرات کے لحاظ سے پہلے نظریوں کے مقابلہ میں برتر تو کیا مساوی بھی نہیں محسوس ہوتے...... لیکن عملی تجربہ میں اُن کی افادیت بہت بلند اور امن عالم کے لیے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوتی ہے۔

لہذا "عملی نظام" میں وہی نظریے قابلِ قدر جگہ پانے کے مستحق ہیں جو اگرچہ تعبیری لفظۂ نظر سے بہت اہم، انقلاب آفریں، اور مسحور کن نظر آتے ہوں مگر عملی دائرہ میں اس قدر وسیع، اور ہمہ گیر ہوں کہ اگر ان کو دلیلِ راہ بنالیا جائے تو معیشت اور اقتصادی امور میں "امنِ عالم" کے لیے وہ تنہا کفیل ہوسکیں۔

ہمارا مطلب اس سے یہ نہیں ہے کہ قدیم اور جدید زمانہ کے جُداجُدا تاثرات، ماحول کے اختلافات، ذہنی انقلابات و رجحانات کے اعتبار سے وہ اپنی تفصیلات و فروع میں بھی یکساں، اور غیر متبدل ہوں کیونکہ انسانی درجاتِ ترقی وتنزل کے پیش نظر یہ ناممکن ہے۔

البتہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نظری اور عملی اصول و قواعد کے اعتبار سے یقیناً ایسی مضبوط بنیاد و اساس رکھتا ہو کہ زمانہ کے ہزاروں انقلابات، لاکھوں نئے نئے تاثرات و ذہنی رجحانات کے باوجود اُس میں وسعت، لچک تو پیدا ہوسکے اور ہوتی رہے لیکن اساس و بنیاد کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکے، اور اُس کا نظری پیغام، اور اس کا عملی پروگرام اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ اقوام کے لیے بھی اسی طرح مشعلِ ہدایت کا کام دے جس طرح اقوام سابقہ کے لیے کام دیتا رہا ہے۔

ان تمہیدی مقدمات کے بعد اب مسئلہ کی تشریح و توضیح زیادہ آسان ہوجاتی اور حصولِ مقصد کے لیے ایک صحیح راہ نکل آتی ہے، اور ایسے اہم موضوع کے لیے سمجھنے اور سمجھانے کا جو مرحلہ ہے وہ دقت طلبی، اور پیچیدگی سے نکل کر آسان اور روشن شاہراہ پر پڑجاتا ہے اور کسی قسم کی کوئی گنجلک باقی نہیں رہتی۔

"سمط اللآلی" پر تنقید کا جواب

از مولانا عبدالعزیز المیمنی صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

پروفیسر میمن عبدالعزیز صاحب نے جو عہد حاضر میں عربی زبان وادب کے مسلم الثبوت استاذ ہیں اور جن کی عربی تصنیفات وتالیفات ہندوستان سے بدرجہا زیادہ مصر وشام کی علمی مجلسوں میں احترام ووقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، دو سال ہوئے اپنی مایۂ ناز اور ضخیم کتاب "سمط اللآلی" شائع کی تو اس پر جہاں عربی جرائد ورسائل میں بہترین ریویو ہوئے، مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی صاحب نے ایک حیرت انگیز تنقید بھی لکھی جو پچھلے دنوں "معارف" اعظم گڈھ کے متعدد اشاعتوں میں شائع ہو چکی ہے۔ مضمون زیر نظر اسی تنقید کا جواب ہے۔ جو جابجا عربی زبان وادب کے قابل قدر نکات ولطائف پر مشتمل ہے، اور جو علمائے عربیت کے لیے بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ثابت ہوگا۔ حضرت مجیب کے کلام میں کہیں کہیں تلخی وشوخی پیدا ہو گئی ہے، لیکن جن حضرات نے سورتی صاحب کا مضمون اوّل سے آخر تک پڑھا ہے وہ اس جواب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت کا لازماً اعتراف کرینگے کہ میمن صاحب "جزاءُ سیّئةٍ سیّئةٌ مثلها" اور "دِنّاهُمْ كما دانوا" کی حد سے متجاوز نہیں ہوئے ہیں۔ (برهان)

دو باتیں!

وما كمد الحسّاد شيئاً أردته ولكنه من يزحم البحر يغرق

دلِ مضطر سے پوچھ لے رونقِ بزم! میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں

"سورت کے ایک معروف عالم تاجر کتبِ مخطوطہ ہیں، آپ کا نام نامی مولوی ابوعبداللہ محمد بن یوسف السورتی ہے۔ آپ نے ازخود اپنی تعلیم دہلی اور رام پور میں حاصل کی، ساتھ ہی ساتھ تجارتی مشغلہ بھی جاری رہا، اس لیے آپ اساتذہ کے چنداں مرہونِ منت نہیں اور اس لیے آپ کے علم میں حک و اصلاح اور کاٹ چھانٹ کی کافی گنجائش ہے۔ جب آپ کو ادھر کساد بازاری کا اندیشہ ہوا، کہ آخر ہند کے ذخائر مخطوطات غیر فانی تو تھے ہی نہیں تو آپ نے اپنی عنانِ عنایت کو دیسی عربی مدارس کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا: جامعہ ملیہ، بنارس، اور دہلی کے رحمانیہ و جامع اعظم، مگر چونکہ اپنی تن آسانی اور ناسازگاری مزاج سے مجبور تھے، اس لیے عموماً بنا، روزگار رہتے نہ بنی، متولیوں اور علماء سے بڑے بڑے معرکے جیتے، رسالہ بازی رہی، اور دست و گریباں بھی ہوئے: کہ الحرب بیننا و بینہم سجال۔ اور پھر بالآخر عزلت گزینی پر مجبور ہوئے۔

اس اثنا میں اس طاسکہ کو چلانے کے لیے ہر نمایاں عالم کے منہ آتے رہے، اور بمقتضائے مثل پیش حکیم طالع عجیب عجیب گل کھلائے، شبلی و سید، مناظر احسن گیلانی، "علماءِ دائرۃ المعارف"، مولوی محمد جوناگڑھی وغیرہم اور اکثر کے خلاف مضامین بھی لکھے، بلکہ اگر اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو آپ کی (صحیح کرنکوکی) دو کتابوں کے بعد پھر آپ کے یہی مضامین و معارک ہیں "یشیب لھولھا الولید" جن کو آپ کا شاہکار کہا جاسکتا ہے بقول آپ کے:-

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

آپ نے باوجود دعوئے محدثیت ادب کی دو کتابیں معقول اُجرت پر حیدرآباد کے لیے ایڈٹ فرمائی ہیں، و بس! ان دونوں میں آپ کی ڈاکٹر کرنکو سے رسا کشی ہے، جس کی انہوں نے ہر ہندی دوست اور شاگرد سے شکایت بھی کی ہے، بلکہ دمشق کی مجمع علمی عربی کے شہرۂ عالم رسالہ ص ۱۰۷، ۱۹۲۹ء میں اس کا

(۱) چونکہ آپ ہنوز بقید حیات ہیں اس لیے حولنا زیادہ موزوں ہے۔ یوں بھی آپ کے کشتگانِ جفا کے آپ کے گرد پشتے لگے ہوئے ہیں کہ "للقمل حول ابی العلاء مصارع"۔

رونما بھی رویا ہے، عاجز نے دسمبر ۱۹۳۱ء میں کتب خانۂ آصفیہ جا کر مسٹر کرنکو کا نسخۂ مسروقہ بچشم خود دیکھا، اور گذشتہ ماہ حیدرآباد میں مدیر معارف کو بھی معائنہ کرنے کی دعوت دی۔ کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ! ملاحظہ ہو بذیل دواوین نمبر ۴۳۸ فہرست ج ۳ ص ۲۸۴۔ خود نواب عماد الملک مرحوم نے جن کے صرفہ پر یہ چھپا تھا اپنے احباب سے اس امر کی شکایت کی ہے۔

سورتی اور میمن

عاجز جب ۱۰ جون ۱۹۳۶ء کو اپنی مصر و استنبول و شام و فلسطین و عراق کی رحلۃ علمیۃ سے کامیاب واپس ہوا، اور "سمط اللآلی" شائع کر دی، تو کہیں سے ان باتوں کی بھنک نہ معلوم کس نیک بخت (شاید مدیر معارف) نے آپ کے مسامع اجلال تک پہنچا دی، پھر کیا تھا اندر ہی اندر کوئی چیز چٹکیاں سی لیتی رہی، جس کو آپ آخر ضبط نہ کر سکے، اور ربا ابن ہذہ بسطۃ فی الجسم کچھ ایسے دل تنگ سے ہوئے کہ ایک چھ صفحے کا خط دھر گھسیٹا، حالانکہ ہمارے مابین سترہ اٹھارہ سال سے کوئی سلسلۂ مراسلت نہیں تھا، اور اس سے پیشتر بھی سفر کے حکم میں تھا جس میں اس "حج" (بلفظ آنجناب مراد سفر علمی) کے مبرور ہونے پر دشنام کا ارمغان اغلاط کا پیشکش، اور ایک نسخۂ السمط کے بطور ٹیکس نہ ملنے کی شکایت تھی، مگر میں نے بمقتضائے

ما کل قول لہ جواب جواب ما یکرہ السکوت

خاموشی اختیار کی۔

آپ کی تنقید سمط

گذشتہ دسمبر میں مدیر معارف کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ نے خلاف توقع کہ "مارا ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود"، کوئی آٹھ دس ماہ سے ایک طویل تنقیدی مقالہ بغرض اشاعت بھیج رکھا ہے، جس میں میمن کرنکو، اور سید بدر الدین صاحب کے اغلاط فاحشہ قلمبند کیے ہیں اور ہر ایک کو بحصۂ رسدی بطور تاؤ گالیوں کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے۔ مگر کسی سبب سے کرنکو کو تو صاف بچا لیا گیا، اور جزء بدر الدین کو بھی اور میمن کے متعلق چونکہ سخت جانی کا شبہہ تھا، اس لیے اس کو رہنے دیا گیا، حالانکہ اس عاجز غریب نے تو بطور متطوع (والنظیر) باقی ہر دو کی طرف سے بھی جواب دہی کرنے کے لیے اپنے تئیں پیش کیا تھا، جس طرح

(۱) کہ کرنکو تک تو آپ کی اس صدا بصحرا کی کسی طرح رسائی نہ تھی یوں بھی وہ اُردو سمجھنے سے معذور تھے۔

اب آپ سب صاحبان کی خدمت کرنے کو حاضر ہے۔ مگر اُس کی ایک نہ سُنی گئی۔ بقول مدیر معارف چونکہ مضمون کا تہائی حصّہ وہ کلمات تھے جو اب مہذب سوسائٹیوں میں مُروّج نہیں رہے اس لیے تقریباً آٹھ ماہ تک دونوں کے مابین اس سلسلہ میں مراسلت چلتی رہی، اور بالآخر وہ بدیں شرط آمادہ ہو گئے کہ محض وہ ثقیل کلمات حذف کر دیے جائیں، جو مخل بالمعنیٰ نہ ہوں مگر بقول مدیر موصوف یہ بات مشکل تھی اس لیے کہ مضمون کا انحصار قریباً انہی چیزوں پر تھا۔ چنانچہ ناظرین نے اپریل تا جون کے جو نمبر پڑھے ہیں وہ دراصل اصلاح شدہ شکل میں ہیں۔ عاجز نے بطور اعلام مدیر مذکور کو مختلف ذرائع سے ذہن نشین کرایا کہ اس کی اشاعت سے مطلوبہ فائدہ شاید حاصل نہ ہو سکے، نیز سورتی صاحب کے خطوط میں کے چند غیر حقیقی اغلاط بھی دکھائے، مگر لاحاصل: آپ نے اُن کے پیہم اصرار اور اپنے نفس کے اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر آخر کار اُن کو شائع کر ہی ڈالا۔

علمائے ہند کا شغل تنقید

تنقید نہایت اہم اور مفید فن ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں رحم اللہ من اھدی الیّ عیوبی۔ کوئی انسان فرشتہ نہیں، خامی بشر کے ساتھ ساتھ ہے، کہ اول الناس اول ناس۔ مگر اس کی شرط اولیں یہ ہے کہ بے محابا (صحیح بے محاباۃ) ہو، محض خدمتِ حقیقت پیشِ نظر رہے، ذاتیات سے دور ہو، اور منتقد کچھ اپنی جان کا بھی محاسبہ کرنے کا خوگر ہو۔ رہا یہ امر کہ یہ باتیں کہاں تک مضمونِ زیرِ بحث میں پائی جاتی ہیں، سو اس کا اندازہ کرنا ہمارے ناظرینِ کرام کا کام ہے۔

میمن اور تنقید

مگر چونکہ سرزمین ہند میں ہنوز مخلص خادمانِ علم کی بہت کمی ہے اس لیے پبلک کا مذاق بھی اُسی تناسب سے منحرف ہے، علماء میں تحاسد و تباغض کی گرم بازاری، اور تنقید کو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا ایک آلہ بنا لیا گیا ہے وبس! اس لیے تیس سال سے میں نے کسی زندہ انسان پر تنقید نہیں کی، نہ کسی سے اُلجھا، اور الحمد للہ کہ بایں ہمہ مجھے کام کا میدان بہت فراخ نظر آیا۔ مگر بہر حال یہ بات تو کسی طرح میرے بس

(۱) کہ شاید حریف اتنا بودا نہ نکلے۔

ہیں نہ تھی کہ اوروں کو اپنی تنقید سے باز رکھ سکوں، کہ لست علیہم بمسیطر، گو عربی میں تالیفیں لکھ لکھ کر اپنے
تئیں مارالامان میں سمجھ کر قدرے مطمئن سا ہو گیا تھا، مگر اب اپنے ملک کے علماء نامدار کے اشارے پر چل کر
لامحالہ اُن کے ارشاد کی تعمیل کرنا ہو گی۔ چنانچہ اس سلسلہ کی یہ پہلی کڑی حاضر ہے، وَثُلُوۃ ثانٍ وَثالِث۔
مگر بیرونی دنیا کے علماء کو جو ہر شش ماہی پر میں کی ایک آدھ کتاب دیکھنے کے کچھ عادی ہو گئے تھے جب یہ معلوم
ہوگا کہ میں کو دیہیں اُلجھا لیا گیا ہے :-

تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست!

اور اُس کو اشخاص کے بُتِ پندار کے توڑنے کی خدمت مفوّض کردی گئی ہے، تو اُن کے استعجاب کی کوئی
انتہا نہ رہیگی، مگر کیا ہو! لا رادّ لقضاء اللہ۔

نقوباز چونکہ جناب منتقد نے مجھ سے یہی چاہا تھا کہ اُن کے علمی جوابات کے ساتھ ساتھ اُن کے بے لگام
رہواروں کی طرف بھی دیکھتا چلوں، اس لیے اس مضمون کو لامحالہ اُسی حد تک ذاتیات سے لگاؤ ہوگا
جتنا کہ بدرجۂ جواب لابدی تھا، پھر بھی میں نے پوری کوشش کی ہے کہ اُن کے استحقاق کی حدود سے
بہت آگے نہ نکل جاؤں ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولئك ما علیھم من سبیل۔ پھر بھی اس میں کوئی
کلام نہیں کہ آج میں برخلافِ عادتِ جاریہ اُس وادی پُرخار میں قدم رکھ رہا ہوں جہاں مجھے جبراً گھسیٹا
گیا ہے۔ حوالت باخدا کردیم ورفتیم!

ناظرین سے قبل اس کے کہ وہ زبانِ انکار کھولیں یہ عاجزانہ التماس ہے کہ وہ منتقد کے رندانہ
فقروں علی الخصوص عربی امثال و ابیات پر ضرور نظر رکھینگے جو ابتداءً ایک خاموش خادم علم کے لیے استعمال
ہوئے ہیں، اُمید ہے کہ اُس وقت وہ اس عاجز غریب کو ضرور معذور تصور فرمائینگے کہ البادی اظلم :-

فلو انی بلیت بھاشمی ⁽¹⁾ خؤولتہ بنو عبد المدان
لھان علی ما القی ولکن تعالوا فانظروا بمن ابتلانی

(۱) مجھ اگر کسی ہاشمی سے پالا پڑا ہوتا جس کا ننھال یہ شریف قبیلہ ہوتا تو میں یہ سب تکلیف جھیل لیتا۔ گر ادھر تو دیکھو مجھ کس بلا میں پھانسا ہے۔

غلط اور اغلاط اور کہیں کس کے ہیں؟

اغلاط بلکہ اقوال خطا ہیں تو ستر ہی ہیں مگر معارف میں پوری دنیا پر ہاتھ صاف کر کے کچن تک پہنچ گئے ہیں مگر یہ ہیں کس کے؟ سو یہ سوال بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ابو تمام کے متعلق مشہور ہے کہ پہلے اس نے "باب الحماسۃ"(۱) باندھ دیا، اور پھر چل پڑا، راستہ میں جس جس مضمون کے بھی اچھے ابیات ہاتھ آتے گئے درج کرتا گیا، پھر جب تھک گیا خود ہی اس باب کو ختم کر دیا، اور دوسرا باب شروع کیا، یہی حال آپ کا بھی ہوا ہے، دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ محض پہلے ۵۰ صفحات کے اغلاط ہیں، حالانکہ مقدمہ اور پہلے ۵۰ صفحات کے بعد صفحہ ۵۱ و ۵۲ و ۵۸ و ۷۷ و ۳۱۰ و ۳۸۹ و ۹۱۰ و ۹۲۲ و ۹۲۵ و ۹۲۹ و ۹۹۰ پر بھی نظر عنایت ہوئی ہے اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ میری ماأتفق لفظہ ابو العلاء وما الیہ، مقدمۃ المداخل کو بھی محرومی کی شکایت نہیں رہی، اور پھر میرے ساتھ ساتھ گیہوں میں گھن کی طرح مولوی بدرالدین کی "شرح الحماسۃ"، لوئیس شیخو کی "الالفاظ"، گویدی کی "الافعال"، "اللآلی"، "الامالی"، اور "حاشیۃ الامالی" بھی پس گئیں۔

علمائے سلف جنکی تغلیط کی گئی

ہے وہ بدنصیب علمائے سلف وخلف، جو محض اس جرم کی پاداش میں کہ آئندہ چل کر کیوں میرا حریف ان کا نام لیتا ہے سزایاب ہوئے ہیں، اور ان پر خاک اڑائی گئی ہے، تو ان کی طویل فہرست میں سے چند ایک یہ ہیں، بشمول سورتی وقالی وبکری وہمین:-

ضرار بن القعقاع، قعقاع، حاجب، الحجر، ابراہیم بن الحارث، ابن عمر، ابن عباس، معاویہ جو سب صحابہ ہیں۔ پھر ابن اسحٰق، ابن ہشام، ہند بنت اسماء، انباری، جمحی، ابن الانباری، ابوالعلاء، فیروزآبادی، صاغانی، مرزبانی، ابن منظور، سید مرتضیٰ، اصبہانی، ابوزید، بخاری، توحیدی، ابن قتیبہ، ابن درید، ابو عبیدہ، ابن رشیق، بغدادی، طبرانی، بغوی، ابن حجر، عینی، زمخشری، آمدی، ابوہلال، ابن عساکر، ابن خلکان، تبریزی، ابن عبدالبر، صاحب الکشف، ابن سیدہ، ابن السکیت، شنقیطی، عبدالغنی الحافظ، جاحظ وغیرہم، پھر لوئیس شیخو، گویدی، لیال، بدرالدین وغیرہم۔ اتنوں پر کم وبیش تو محض اس چند صفحات کے مضمون میں ہاتھ صاف کرنے کی نوبت آگئی، اگر کسی بسیط تالیف کی نوبت آتی (ولا قدر اللہ) تو غالباً نسل آدم کی پوری

(۱) سخت جانی وشجاعت۔

فہرست آجاتی، اور درحقیقت اس طرح بلا ارادہ آپ کے ہاتھوں یہ علم رجال کی سب سے بڑی خدمت سرانجام پاتی، جو اولین و آخرین میں کسی سے نہ بن آئی۔ سچ ہے۔ کم ترک الاول للآخر۔

ماشاء اللہ اگلا پچھلا کوئی عالم آپ کی نگاہ نکتہ نواز میں نہیں جچتا، جب اور جس کو جی چاہے نہایت تمسخر آمیز انداز میں دھتکار دیتے ہیں، بشرطیکہ حریف نے اُس سے کچھ استناد کیا ہو۔ ورنہ اپنی ضرورت کے لیے تو آپ ہر متأخر کو "حجۃ اللہ فی الارض" بتاتے ہیں۔

آپ کے نشان زدہ اغلاط کا جائزہ

اب میں آپ کے نشان زدہ اغلاط کا جائزہ لیتا ہوں۔ قریباً نصف مضمون یا معارف کے تین نمبروں میں سے ڈیڑھ نمبر تو محض تمہید کی نذر ہو گیا ہے، ازاں بعد تنقید شروع ہوتی ہے، جس کے حسب ذیل نمبروں کا سمط کی تنقید سے کوئی علاقہ نہیں ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ (ح) و ۱۴ و ۱۶ و ۱۷ و ۱۸ و ۲۶ و ۲۷ و ۲۸ و ۲۹ و ۳۰ و ۳۳ و ۴۱ و ۴۲ و ۴۹ و ۵۴ و ۵۵۔ ان ۱۸ نمبروں کے بعد کل ۳۷ نمبر بچتے ہیں، جن میں سے حسب ذیل نمبروں میں بجائے میمن کے دراصل علماءِ سلف کی تنقید کی گئی ہے:۔ ۱۳ و ۱۵ و ۱۹ و ۲۰ و ۲۱ و ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ و ۲۵ و ۳۲ و ۳۴ و ۳۵ و ۳۸ و ۳۹ و ۴۰ و ۴۵ و ۴۸ مگر چونکہ میمن والذین اتبعوھم باحسان میں سے تھا، اس لیے اُس نے یہ سارے وارِ طیبِ خاطر اپنے اوپر لے لیے، کہ یہ اُن کے علمی احسانوں کی کم از کم جزا تھی، گو وہ ان اقوال کا قائل نہ تھا اس لیے وہ ذمہ دار بھی نہیں۔ منتقد کی یہ پُرانی عادت ہے جس کے جانے کا اب کوئی امکان نہیں، کہ اوروں کی جو عبارتیں آپ کی کتاب میں کسی طرح بھی آجائیں خواہ بر سبیل استطراد ہی کیوں نہ ہوں جب تک آپ اُن کے قائل کو صریح گالی نہ دیدیں، وہ آپ ہی کے سر منڈھی جائینگی؛ اس لیے آپ مستوجب پاداش ہونگے۔ اب ان ستر کے بعد محض بیس نمبر بچتے ہیں، جن کا صحیح یا غلط تعلق "سمط" سے ہو سکتا ہے، جو قریباً پورے کے پورے باحتیاط تام و اہتمام مالاکلام بمقتضائے مثل کالائے بد بریش خاوند بیمہ شدہ پارسل کی صورت میں منتقد صاحب کو جو اُن کے حقیقی اہل تھے بھیج دیے، کہ وہ اُن کو پالیں پوسیں اور اُن کی نسل کی افزائش کریں، اور پھر حفاظت و ضمانتِ سلامت کے طور پر ۹۰ عدد سے

زائد اور اغلاط (سپاہی والنٹیر) جو آپ کی تمہید سے بھرتی کیے گئے تھے، اُن کے ساتھ کر دیے، تاکہ یہ اُن کو خیریت سے منزل مقصود تک پہنچا دیں۔

آپ کی تغلیط کے چند خصائص

علماءِ شرق و غرب کی عادت ہے کہ اگر کسی کتاب کا کوئی لفظ اپنی جگہ ٹھیک چسپاں نہ معلوم ہو تو کلمہ (کذا) یا (Sic) لکھ دیا کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اُس کی تصحیح یا تصحیف کی گراں بار ذمہ داری سے اپنے تئیں عہدہ برآ کر سکیں۔ مگر چونکہ آپ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کو سیر علم اور مصطلحات کی خبر نہیں، اس لیے وہ اپنی طرح دوسرے کو بھی مجتہد دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ تیرا عجز ہے، یوں کیوں نہ کہا ؟؟؟

آپ کے قاموس میں غلط بمعنے "کچھ نہ کرنا ہے" حالانکہ عالم مصطلح میں تو غلط بہرحال ایک کام ہے۔ یہ کتنی مشکل بات ہے کہ ایڈیٹر یا مؤلف ہر خوانندہ کے (ہر چند کہ وہ خوردہ گیری کیوں نہ ہو) جملہ خطرات قلبیہ[1] ہوا جس نفسیہ تک پہنچے، یعنے کہ وہ اپنے سینہ میں اُس کا دل پیدا کر کے اُس کی ہر واقعی یا فرضی ضرورت کا تدارک بھی کرے۔ یہ اور اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہیں جن کے ذریعہ اغلاط کی خالی فہرست کی خانہ پُری کی گئی ہے۔

آپ کے پاس سلسلۂ انساب قرن پنجم کی دو کتابیں "جمہرۃ النسب" ابن حزم اور "اکمال" ابن ماکولا ہیں، جن کو ہاتھ میں لے کر جملہ متقدمین قرن دوم و سوم کے اقوال کو اس دلیل کی بنا پر رد کر دیا کرتے ہیں، کہ انہوں نے ان (متاخر) کتابوں میں کیوں نہ دیکھ لیا۔ یہ نہایت دلچسپ منطق ہے، مگر چونکہ آپ کی تاریخ دانی ماشاء اللہ خارق عادت ہے، اس لیے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں، لا یسئل عما یفعل وھم

---

(۱) مگر اس بات کو باور کر لینا کہ آپ کے جملہ حملے واقعی ہوتے ہیں خطرات سے خالی نہیں کہ آپ کو تصوف و انتحال کا قدیم عارضہ ہو جس طرح ذیل نمبر ۴۹ آئیگا کہ سمعانی و ذہبی کے سر آپ نے ناگفتہ باتیں منڈھی ہیں۔

یسئلون، ملاحظہ ہو جواب ص ۲۷۱ و ۲۷۹۔

آپ کی تحریر کا یہ خاصہ ہے کہ خاطر عاطر کو جو بات گوارا نہ ہو، ہر چند کہ وہ جملہ مولفات میں موجود ہو مگر آپ کو بہر حال یہ حق پہنچتا ہے، کہ جب چاہیں اُس کے وجود سے انکار کر دیں، اور جب چاہیں مان بھی لیں۔ الغرض آپ چت پڑیں یا پٹ جیت آپ ہی کی ہوگی۔ آپ کا یہ بھی ایک پرانا داؤں ہے کہ پیش ملا ۸۶ گرا بکی یہ حریف بہت سخت جان نکلا ہے، ممکن ہے اُس نے ہمیشہ کے لیے جملہ علماء ہند و سند کی طرف سے بطور فرض کفایہ یہ خدمت سرانجام دے دی ہو، اور اُن کو اللہ کرے، چھڑا لیا ہو، اس لیے اُن سے دعاء خیر میں یاد رکھنے کی التماس ہے۔ کان اللہ لکم علی من ناوأکم۔

الا لیقل من شاء ماشاء انما — یلام الفتی فیما استطاع من الأمر

عاجز غریب

عبدالعزیز صدر شعبہ عربی جامعہ اسلامیہ علیگڈھ

جمعہ ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء

جواب نمبر اپریل (۱)

(معارف ص ۲۶۵) تنقید کی تمہید اسلامی علوم و فنون کی تدوین کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے جس کے اتھاہ دریا کی پہنائی کو اپنے قلم اعجاز رقم سے دس سطر کے کوزہ میں بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"بغداد و نیشاپور و اندلس آخر قرن سوم و آغاز چہارم میں علم کے مرکز تھے"

(۱) بہت خوب! اگر مصر، قیروان، دمشق اور اصفہان وغیرہ بھی تو کچھ پیچھے نہ تھے:۔

وما شر الثلاثۃ ام عمرو — بصاحبک الذی لا تصبحینا

پھر بغداد کے ساتھ تو قرطبہ موزوں تھا جس طرح اندلس کے ساتھ عراق۔ اگر موزونیت کی چڑیا کو اس تنقید میں پر پھڑپھڑانے کی اجازت مل سکے۔

پھر ملاحظہ ہو:۔ "اواخر قرن سوم و اوائل چہارم میں فنون کی تکمیل و تزئین (؟؟!!) ہوئی۔ پھر پنجم و ششم میں بھی بقول آپ کے تحشیہ و تزئین ہی ہوئی۔"

(۲) اس میں لفظ "تزئین" کی تکمیل و تحشیہ کے ساتھ موزونی اپنی بلاغت کی داد چاہتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب قرون چہارگانہ میں تزئین ہی ہوتی رہی تو بجائے اس تطویل لاطائل کے یہی کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ اسلام کے جملہ عہدوں میں تزئین ہی ہوتی رہی تاکہ تاریخ نویسی کا بار کاتب اور ناظر دونوں پر سے ہلکا ہو جائے۔ ہاں آج کل تزئین بمعنی حجامت کرنا عام طور پر مستعمل ہوتا ہے، اگر ایک جگہ یہ معنی مراد ہوں تو ہمیں کلام نہیں۔

اعوذ بک رب من حصر و عی   ومن نفس اعالجها علاجا

ص ۲۶۶ "طریق املا کا گو تفسیر، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ میں پتہ چلتا ہے مگر ادبی دنیا میں اس کی بیحد کثرت ہے۔"

(۳) مستثنیٰ منہ اور مستثنیٰ دونوں ادب ہی ہیں، یہ انداز کوئی اُردو کے ساتھ مخصوص نہیں، اس کا جلوہ تو عربی میں بھی پرتوافگن ہے:۔

والقول ذو خطل اذا   مالم یکن لب یعینہ

آگے چل کر افسانوں کی کثرت اور ادب کی بھرمار مگر علمی تالیفات کی قلت کا ماتم کیا ہے، اور لکھا ہے کہ مصر میں بھی بمقابلہ افسانوں کے علمی تالیفات عشر عشیر (سو میں کی ایک) کیا کبریت احمر ہیں۔

(۴) یہ بیان سراپا لغو اور غلو ہے۔ امالی قالی جس ادب پر مشتمل ہے وہ تو بقول آپ کے ص ۲۳ مشکلات قرآن و حدیث و اشعار و اخبار و نوادر ہے، وہ کوئی ڈراما یا جس طرح آپ نے یہاں لکھا ہے فضولیات و خرافات کا مجموعہ نہیں، کیا آپ میں اتنی جسارت ہے؟ کہ کلام پاک اور احادیث نبویہ کو ایسا ناپاک لقب دیں؟

کم عواتك كل یدعی صحة العقل   ومن ذا الذی یدری بما فیہ من جہل

بیچارے اصحاب مطابع جن کی ارادی یا غیر ارادی کوششوں سے کتابوں کا یہ گراں قدر انبار آج ہمارے

سامنے ہے۔ اتنی توہین کے قابل تو نہ تھے کیا وہ یہ نہ کہیں گے: کہ حضرت! آپ نے تو دیوان نعمان و کمرکو جو مستشرق کرینکو کا کارنامہ تھا اپنا کر محض ہضم ہی نہیں کر لیا بلکہ عماد الملک مرحوم سے اُس پر ایک رقم خطیر بھی وصول کی اور جمہرہ کی بھی کچھ ایسی ہی دُرگت کی جس کا مرحوم نے ... یار جنگ وغیرہ احباب سے رونا بھی رویا تھا، ادھر خود کرینکو "مجلۃ المجمع العلمی" میں یہ لکھنے پر مجبور ہوئے۔ "وانتحل نشرہ ابوعبد اللہ السورتی و کتب فی عنوانہ أنہ ناشرہٗ" تو پھر آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ ہنسنے ہنسنے کسب حلال کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیں۔

یوں بھی یہ سفید جھوٹ ہے کہ "مصر کی علمی مطبوعات سو میں کی ایک یا کالعدم ہیں" یہ تو محض سیاہی کی روانی اور بیان کی طغیانی ہے وبس! مگر اچھا جناب! خود آپ نے! ایں ہمہ دعوے محدثیت ادب ولغت کو چھوڑ کر حدیث پر کونسا کارنامہ کیا ہے؟ پیش کیجیے! قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

ص ۲۷ "مصر سے البیان کے تین نسخے نکلے"

(۵) لفظ نسخہ عربی اور اُردو ہر دو زبانوں میں بمعنی ایڈیشن نہیں ہے۔ یہ غلطی آئندہ بھی بار آئیگی، گویا آپ کو ہنوز یہ نہیں معلوم کہ بسلسلۂ اختراعِ فن طباعت کیا کیا نئے الفاظ وضع ہوئے ہیں؟

"البیان کی اب تک پوری خدمت نہ ہوسکی"

(۶) مگر یہ نری اسکیم بازی اور دوسروں کو کام کے لیے اور اپنے تئیں آرام کے لیے مخلوق سمجھنا آخر کہاں تک!

لا الحلم جاد بہ ولا بمثالہ

کہیں کوئی یہ نہ کہے کہ خواب میں ہم نے یہ سب کچھ سن لیا اور وہیں تعمیل بھی کر دی کہ:۔

قد سمعنا ما قلت فی الاحلام وأنلناك بدرۃ فی المنام

وانتبهنا كما انتبهت بلا شیئ وكان النوال قدر الكلام

كنت فيما كتبتہ نائم العين فهل كنت نائم الأقلام

بیدار ہونے کے بعد آپ اور ہم دونوں خالی ہاتھ تھے۔ کیا جناب کا قلم تعمیری کاموں کے لیے خشک ہو گیا ہے

اور دوسروں کے بنے بنائے کاموں کو تباہ کرنے کے لیے ہمیشہ رواں ہے، اگر بالفرض کوئی صاحب ذوق اس مہم کو سر بھی کرلے تو آپ اُس کے کام کو مانیں گے کب! ابنائے وطن کی طرف سے اُس کی قدر افزائی لعن طعن اور سب وشتم ہی سے ہوگی نہ! اسی لیے تو آپ نے اپنا وطیرہ ہر چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا اور خادمانِ علم کے مُنہ پر خاک اُڑانا قرار دیا ہے۔ اور تاہنوز جبکہ زندگی کی آخری منزل میں قدم رکھدیا ہے بجز دہ کاموں کے اور کچھ نہیں کیا، اور وہ بھی سُرخ وسفید کی خاطر، پھر اُن میں بھی سٹر کرنیکو سے رستاکشی جاری ہے آئندہ اور کیا کرینگے :-

والشیخ لا یترک اخلاقہ حتی یواری فی ثری رمسہ

"البیان کے برابر مسائل بیان کی جامع اور کوئی کتاب نہیں"

(۷) یہ بات صاف بتاتی ہے کہ آپ کو اس کتاب سے دور کا واسطہ بھی نہیں، کہ مسائل بیان تو اس کتاب کے ایک سو برس بعد عالم وجود میں آئے ہیں۔ البتہ اگر آپ کی کسی جاہلی قاموس میں "مسائل" بمعنی "اقوال فصیحہ" ہوں تو فلا مشاحۃ فی الاصطلاح اذن۔

"عبدالملک بن الزیات وزیر"

(۸-۱۰) اس زمین پر اس نام کا کوئی وزیر نہیں گذرا۔ یہ تو آپ کی تاریخ و رجال کی مہارت کی ایک ادنیٰ سی کرن ہے جس کے بل بوتے پر ہر معقول سے اُلجھنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ کسی نقل کتب ہی سے پوچھ لیا ہوتا کہ نام محمد بن عبدالملک الزیات ہے جس کو اس طرح مختصر کیا جا سکتا ہے۔ محمد الزیات، ابن عبدالملک الزیات، الزیات۔ مگر آپ نے تو یہاں تین فاحش اغلاط کیے ہیں (ا) وزیر کا نام عبدالملک بتایا جو اُس کے باپ کا نام ہے۔ (ب) الزیات کو عبدالملک کا باپ لکھنا، حالانکہ اُس کے باپ کا نام تو اَبان ہے۔ دیکھو اغانی ۲۰ : ۴۶۔ (ج) زیات (گندھی تیلی) تو خود وزیر کی صفت ہے۔ دیکھو دیوان ابراہیم الصولی تصحیح العاجز المیمنی نمبر ۲، ۱۰۵، ۱۲۳، ۱۳۵، ۱۸۶۔

"کامل مبرد کی کئی شرحیں مصر و یورپ میں طبع ہوئی ہیں"

(۱۱) محض ایک جدید شرح صرف مصر میں چھپی ہے۔ پھر قالی کی نامکمل مختصر اور اغلاط سے معمور سوانح عمری لکھی ہے، میں نے ہر چند کہ ماخذ کا ذکر السمط ص پر کر دیا ہے مگر وہ آپ کی نگاہ خوردبین سے اوجھل رہے جو آپ نے اس قدر اغلاط کر ڈالے۔

ص عبدالرحمٰن الناصر کو والی اندلس بتلاتے ہیں۔

(۱۲) "والی گورنر کو کہتے ہیں سو یہ بھی ساتھ ہی ساتھ ارقام (اللہ اللہ صحیح رقم) فرما دیتے کہ یہ گورنری بخشی کس نے تھی؟ اس وقت آپ کے تاریخی معلومات کا سمندر تلاطم خیز ہے شاید کوئی موتی اس "غریب" مسکین کے بھی ہاتھ لگ جائے، اور عمر بھر دعائے خیر میں یاد رکھے، واقعہ یہ ہے کہ وہ اندلس کی اسلامی تاریخ میں زبردست ترین بادشاہ اور پہلا امیر المومنین (خلیفہ) تھا جس کے بلانے پر قالی اندلس گئے تھے۔ یہ ہے آپ کی لغت دانی (لغویت):۔

ومن جاھل بی وھو یجھل جھلہ

پھر آج کل کے طلبہ کے یورپ کو بغرض ڈگری جانے کا رونا روتے ہوئے لکھتے ہیں "تاریخ اسلام بلکہ اسلام کے لیے مغرب کی سند مطلوب ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ آئندہ نفس ایمان و اسلام کی سند کے لیے ان کو وہاں جانا پڑے"

(۱۳) گویا پہلے اسلام سے نفس اسلام مراد نہیں تھا بلکہ اس کے ناکارہ اعضاء:۔

واسرع مفعول فعلت تغیّرا　　تکلّف شیئٔ فی طباعك ضدّہ

قالی کو بادشاہ اندلس حکم کے ولی عہد مستنصر کا اتالیق بتایا گیا۔

(۱۴-۱۶) صلّ علیٰ! یہ ہمہ[1] دانی اور اس پر یہ دُر افشانی۔ اجی حضرت! یہ بیت[2] یہاں تلاوت فرماتے:۔

فیاموت زران الحیاۃ ذمیمۃ　　ویانفس جِدّی ان دھرك ھازل

(۱) یہ لفظ معارف ۱۳، ۲۶۲ کا ہے۔ (۲) جامعہ ۴، ۲۱۵۔

نہ کہ مدیر معارف کی حدیث سے غفلت اور بخاری(۱) سے عدم واقفیت پر ابھی ابھی تو لکھا ہے کہ قالی کو الناصر نے بلایا تھا جس طرح خود قالی نے بھی امالی میں لکھا ہے ہنوز وہی صفحہ ۲۶۸ چل رہا ہے۔ پھر یہ کدھر بہک چلے۔ یہ تین اغلاط ہیں جو آپ کی تاریخ دانی کی ہمیشہ ہمیشہ سند رہینگے:۔

(ا) اُس وقت بادشاہ عبدالرحمن الناصر تھا نہ کہ اُس کا ولی عہد حکم (ب) حکم کا کوئی ولی عہد مستنصر نام کا نہیں بلکہ الحکم المستنصر ایک شے ہے جس طرح ابو عبداللہ السورتی ایک ہے۔ (ج) پھر قالی حکم کے عہد ہی میں مر گئے تھے انہوں نے اُس کے ولی عہد کا زمانہ سرے سے پایا ہی نہیں۔ یہ ہے تاریخ و رجال کی مہارت جس کی کمی کا شبلی و سید میں رونا رویا تھا[2]۔ کیا وہ نہ کہینگے، کیا خوب:

رمتني بدائها وانسلت   كذلك ذو عيب انت عياب

"القالی کا مغرب میں استقبال کیا گیا"

(۱۷) استقبال تو محض اندلس ہی میں ہوا ہے جو آں سوئے جبل الطارق کو کہتے ہیں۔ مغرب تو تونس کے بعد ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور اُس کو استقبال اور دعوت سے کوئی علاقہ نہیں۔ "عی ساکت خیر من عی ناطق"۔

اندلس و بغداد کا مقابلہ کرتے ہیں:۔

(۱۸) اے صاحب! یا تو اندلس و عراق کہیئے یا پھر قرطبہ و بغداد۔

قالی کا سرمایہ لغت اور غریب کے سوا کچھ نہیں تھا۔

(۱۹) اللہ اللہ! كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا۔ یہ سفید جھوٹ اور یہ طعن و طنز اور یہ تناقض کلام! دروغ گو را حافظہ نباشد۔ اسی صفحہ ۲۶۸ پر تو لکھا تھا (مایہ ناز ادیب و لغوی) اور اگلے

---

(۱) آپ کی حدیث علی الخصوص بخاری دانی کی قلعی بجواب ص ۲۷۰ و بجواب نمبر ۲۲ کھولی جائیگی۔

(۲) جامعہ ج ۴ ص ۳۱۵ و ۳۱۲ حالانکہ یہ معکوس مہارت اُن کے ہاں بھی کچھ کم نہیں۔

صفحے میں ہے کہ قالی اہل اندلس کو لغت وادب پہنچاتے تھے، اس سے بھی لگتے ہیں[1] امالی کی بابت لکھتے ہیں کہ اُس میں قرآن وحدیث واشعار واخبار ونوادر ہیں، گویا قالی نے بھی شبلی مرحوم کی طرح اپنے مخصوص فن (لغت) کو چھوڑ کر امالی میں وہ تمام علوم بھر دیے ہیں جو اُن کو نہیں آتے۔ تمام مترجمین قالی نے اُس کے تیرہ[13] اساتذۂ حدیث کے نام گنوائے ہیں جن میں سے امام ابوبکر ابن ابی داؤد اور بغوی بھی ہیں محض حدیث کی خاطر دو سال ورودِ بغداد سے پہلے امام ابویعلی کے یہاں موصل میں ٹھہرے رہے۔ اُن کی نحویت کی بابت ضبی[2] کے لفظ یہ ہیں وکان اعلمهم بعلل النحو علی مذهب البصريين واكثرهم تدقيقاً فی ذلك۔ اور زبیدی کہتے ہیں[3]۔ وقرأ كتاب سيبويه علی ابن درستويه اجمع واستفسر جميعه وناظره فيه ودقق النظر وكتب عنه تفسيره وعلل العلة واقام عليها الحجة واظهر فضل مذهب البصريين علی مذاهب الكوفيين ونصر مذهب سيبويه علی من خالفه من البصريين ايضاً واقام الحجة له۔ یہ بیان کسی گجراتی کا نہیں بلکہ زبیدی کا جو قالی سے مخصوص تھے ہر چند وہ آسمانِ حدیث ونحو کے سیارے ہی کیوں نہ ہوں مگر آپ سے دو زینے کمتر ہی تھے، گو اُن کے اساتذہ تیرہ[13] سے زیادہ تھے اور آپ کے اللہ اللہ خیر صلا! پھر بھی وہ آپ کے شمار میں کیسے آئیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر لغت میں اُن کا پلا متعدد سے کیوں زیادہ ہے، اُنہوں نے تو جس طرح آگے آئیگا دو مسلّم کتابیں بلا تنبیہ اپنی[4] امالی میں چُرا کر بلا کم وکاست درج کر دی ہیں، مگر ممکن ہے کوئی بیباک گستاخ بے محابا (خاکم بدہن[5] بے محاباة) سنا دے، پیش طاحکیم وپیش حکیم ملا وپیش ہردو ہیچ وپیش ہیچ ہردو۔ مگر چونکہ یہ مثل مَیدانی میں نہیں اس لیے عرب عرباء کے ہاں قابل شنوائی وپذیرائی نہیں۔ عاجز کہتا ہے ناظرین باتمکین عرب عرباء کی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک اور مقالہ کا انتظار فرمائیں کہ آخر الدواء الكی۔

لأبرينك برياً لا انجبار له — انی رأيتك لا تنفك تبرينی

(۱) بروایت سورتی در جامعہ (۲) ص ۲۱۸ (۳) طبقات نسخۂ اصل استنبول ص ۱۳۰ و ۱۳۲ و ۱۳۶ - (۴) جامعہ ۴ × ۲۱۸

"امالی کا نسخہ قرطبہ کی جامع مسجد میں جمعرات کے لیکچروں کا مجموعہ ہے"

(۲۰) کہیں اس کو محض اُردو کی بے ربطی اور ژولیدہ بیانی نہ سمجھا جائے، یہ تو دماغ کی خوبی ہے، عربی میں بھی اسی طرح جلوہ فگن ہے:۔

تریدین لقیان المعالی رخیصة   ولابد دون الشهد من ابر النحل

ص ۲۶۹ "تقریباً ایک صدی یا کچھ کم و بیش علماء میں امالی کا چرچا رہا، پھر یہ کتب خانوں کی زینت بن گئی، تا آنکہ مطبع نے اُس سے پبلک کو روشناس کیا۔"

(۲۱) یہ مؤرخ بننے کی لاحاصل کوشش ہے، ورنہ امالی بھی جملہ ادبی کارناموں کی طرح قدردانوں کے ہاتھوں میں ہمیشہ رہی ہے۔ خود لآلی امالی کے ڈیڑھ سو برس بعد لکھی گئی ہے۔ اگر امالی کے قدردان ختم ہو گئے تھے، تو پھر بکری نے آخر یہ دردسری کیوں کی۔ تقریباً اسی زمانہ کے ابن حزم و حمیدی بھی ہیں جنھوں نے اس کو بہت سراہا ہے۔ موجودہ نسخۂ امالی اندلسیہ مکتوبہ ۳۸۶ھ (دار الکتب المصریہ) پر قرن پنجم و ششم کے ادبائے اندلس ابوالولید الوقشی اور ابو مروان بن سراج وغیرہ کے قیمتی حواشی ہیں۔ دیکھو السمط ۳۴۶ و ۴۳۲ پھر ششم سے لے کر تا ایں دم (قرن چہار دہم) کے تو بیسیوں نسخے جابجا ملتے ہیں اور نظر سے بھی گذر چکے ہیں کیا یہ نسخے امالی کی قدردانی کی دلیل نہیں ہیں۔ آپ کو تو خود اعتراف ہے کہ ہشتم کے مغلطائی نے تو لآلی پر "القدح العالی" لکھی ہے۔ یہ ہے آپ کے معلومات کا بحرِ زخار:۔

یصیب وما یدری ویخطی وما دری   وکیف یکون النوك الا كذلكا

(باقی آئندہ)

---

(۱) نسخۂ استنبول ص ۱۳۱۔

مذاکرۂ علمیہ

واقعہ حضرت داؤد (علیہ السلام) پر نقد و تبصرہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

اس تفصیل و تحقیق کے بعد اب اجازت ہونی چاہیے کہ "مقالہ نگار" کی بیان کردہ تاویل کو بھی "نقد و تبصرہ" کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک قوی یا کمزور ہے۔ سو "برہان" میں اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بعض مفسرین نے واقعہ کی خرافات کو رد کرتے ہوئے اس "خرافی روایت" کے ایک حصہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ حالانکہ ہمارے نزدیک یہ طریقہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ اس سے صرف اتنا ہی فرق پڑتا ہے کہ نبی کی زندگی کو ایک "بڑے گناہ" کی نسبت سے الگ کر کے اُس سے کم درجہ کے "اخلاقی گناہ" کی طرف نسبت کر دی گئی۔ اس لیے یہ طریقہ بھی غلط اور عصمتِ انبیاء کے عقیدہ میں خلل انداز ہے اور اس طریقہ کے بطلان میں اس لیے اور بھی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ کبارِ محدثین و مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا سے متعلق کوئی روایت صحیح نہیں اور "بغوی" یا اور کسی مفسر نے بعض روایات مرفوع یا موقوف کو جو اس سلسلہ میں روایت کیا ہے اُس کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ اور داؤدی نے صراحت کر دی ہے کہ یہ روایات ناقابلِ اعتبار اور ساقط الاعتماد ہیں۔ لہٰذا "مقالہ نگار" کی یہ تاویل

> قرآن مجید کے بیان سے واقعہ کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے اوریاہ (یا جو کچھ بھی اُس کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔

اُن کی شخصی عظمت کو پیش نظر رکھ کر وہ ایک طرح سے اپنے آپ کو طلاق دینے پر مجبور پا رہا تھا
مگر قبل اس کے کہ وہ طلاق دیتا، قوم کے دو نیک آدمی حضرت داؤد کے پاس اچانک
پہنچ گئے، اور اُنھوں نے اس معاملہ کو فرضی مقدمہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کیا۔
مقدمہ سن کر حضرت داؤد نے وہی فیصلہ دیا جو ایسے معاملہ کا برحق ہو سکتا تھا لیکن فوراً اُن
کو یہ خیال آیا کہ یہ تو میرا رب میری آزمائش کر رہا ہے۔ چنانچہ فوراً اُنھوں نے توبہ کی اور فات
سجدہ کی عاجزی کے ساتھ خدا سے اپنے قصور کی بخشش چاہی (رسالہ ترجمان القرآن جلد ۱۳ عدد ۴)

نہ صرف کمزور بلکہ غلط اور بے اصل ہو جاتی ہے کیونکہ جب محدثین اس واقعہ کی کسی کڑی کو تسلیم ہی
نہیں کرتے تو اُس پر کسی مسئلہ کی بنیاد کیسے قائم کیجا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں "برہان" میں بتایا گیا تھا کہ اس روایت
پر تاویل کی بنیاد قائم رکھنے سے جو مفاسد پیدا ہوتے، اور صاحبِ تاویل کو اُن کے دفع کے لیے دور از کار
تکلفات کرنے پڑتے ہیں، وہ بھی اس کے غلط اور بے اصل ہونے کو ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ "مقالہ نگار"
کو بھی یہی ضیق پیدا ہوئی ہے اور اُس سے نکلنے کے لیے اُن کو بھی بے اصل باتوں کی پناہ لینی پڑی ہے
چنانچہ فرماتے ہیں :-

"حضرت داؤد علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا اگرچہ وہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک عام دستور
تھا، او راس دستور سے متاثر ہو کر نبی اللہ سے یہ لغزش سرزد ہوئی تھی الخ" (رسالہ ترجمان القرآن)
اور اس دستور کے صحیح ہونے کے ثبوت میں حاشیہ تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-
"اسرائیلیوں کے ہاں یہ معیوب بات نہ تھی کہ کوئی شخص کسی کی بیوی کو پسند کر کے اس سے
طلاق کی درخواست کرے۔ الخ (رسالہ ترجمان القرآن جلد ۱۳ عدد ۱)

ہمیں سخت حیرت ہے کہ ایک محقق کس طرح ان سطور کو زیر قلم لا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اول تو اس
کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ دستور عمدہ اخلاق کی بات تھی نہ کہ مذموم بات اور اگر

ثابت بھی ہو جائے تو مقالہ نگار کی تصریحات اور تورات کی منقولات سے تو اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ یہ فعل اگر ان کے یہاں محمود تھا تو بڑے آدمی کا فعل ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ قابلِ تعریف ہوتا، اور پھر اُس پر بیہودہ کو بیہودہ حاشیہ آرائی کی ضرورت ہی کیا ہوتی؟ یہ تو جب ہی ہوا کرتا ہے کہ ایک فعل اگرچہ عام طور پر رائج ہو مگر صاحبِ اخلاق انسانوں سے اُس کا صدور معیوب سمجھا جاتا ہو اور اگر کسی بڑے آدمی سے لغزش کے طور پر اُس کا صدور ہو گیا تو دشمن اور مخالف اُس پر حاشیہ آرائی کر کے اُس کو زیادہ سے زیادہ مکروہ بنا دیا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں بنی اسرائیل میں یہ فعل محمود ہو یا مذموم اخلاق کی نگاہ میں ہر حالت میں مذموم ہے اور اس کے بُرے نتائج کہاں تک پہنچتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات کس قدر تعجب خیز ہے کہ انصار و مہاجرین کی مواخات اور بھائی چارہ کے واقعات کو اس کے جواز کے لیے دلیلِ راہ بنایا جاتا ہے، حالانکہ اس واقعہ کا اس معاملہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ کیا کسی ایک مہاجر کا کوئی قول، ارادہ، نیت یا عمل پیش کیا جا سکتا ہے کہ مواخات کے سلسلہ میں اُس نے اپنے انصاری بھائی سے اُس کی بیوی کے لیے طلاق کی خواستگاری کی ہو۔ حاشا وکلا! البتہ اس کے برعکس یہ ثابت ہے کہ جب ایک انصاری نے جوشِ مواخات میں خود ہی اپنے مہاجر بھائی کی خاطر اپنی دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو طلاق دینی چاہی تو مہاجر بھائی نے اظہارِ شکریہ کے بعد اُس انصاری کو یہ جواب دے دیا کہ "تمہارا مال اور تمہاری بیوی تم کو مبارک۔ مجھ کو تو بازار کی راہ بتا دو تاکہ میں اپنے ہاتھوں سے کسبِ معاش کر کے معیشت پیدا کر سکوں"۔

اس کے علاوہ اس تاویل در تاویل کے بعد بھی جب بات گنجلک ہوتی نظر آئی تو "مقالہ نگار" کو تکلف در تکلف کر کے یہ اضافہ کرنا پڑا:۔

"ممکن ہے کہ حضرت داؤد نے اُس عورت کی قابلیت اور اُس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال سُن کر

اسے پسند کیا ہو لیکن بُرے نفوس کی شرارت ہمیشہ ایسے واقعات میں بُرے امکانات ہی
کی طرف مائل ہوتی ہے الخ

قارئین کرام خود غور فرمائیں کہ ان فضول تکلفات کی بھرمار محض اس لیے ہو رہی ہے کہ "مقالہ نگار" نے اپنی تاویل کی بنیاد ایک غلط واقعہ پر قائم کر لی ہے اور پھر بھی ان تاویلات کے بعد بات اُس حد تک نہیں پہنچتی جو ایک جلیل القدر نبی کی شان کے مناسب ہو۔ اس کے بعد آخر میں مقالہ نگار نے اپنی تاویل کو مضبوط ثابت کرنے کے لیے ایک شبہ پیش فرمایا ہے، وہ یہ:-

"یہ تاویل اس لحاظ سے بھی مرجح ہے کہ اگر اوریاہ کی بیوی کے معاملہ کی سرے سے کوئی اصلیت ہی نہ ہوتی تو قرآن مجید اس موقعہ پر صاف الفاظ میں اس کی تردید کرتا جس طرح اُس نے حضرت سلیمان کے حق میں کفر و شرک اور ساحری کے الزام کی تردید کی الخ"

مگر ہم اس ترجیح کے سمجھنے سے قاصر ہیں اس لیے کہ اگر کوئی شخص "مقالہ نگار" کے اس شبہ کو اُن ہی کی طرف پلٹ کر یہ کہدے

"آپ کی تاویل اس لیے بھی راجح نہیں ہے کہ اگر اس معاملہ کی کوئی اصلیت ہوتی تو قرآن مجید صاف الفاظ میں اس کی تردید کرتا، جس طرح اُس نے حضرت سلیمان کے حق میں کفر و شرک اور ساحری کے الزام کی (صاف) تردید کی (اور اشارہ کنایہ میں گول مول نہ کہتا)"

تو "صاحب مقالہ" اس کا جو جواب مرحمت فرمائیں وہی جواب ہماری جانب سے بھی سمجھ لیا جائے بات دراصل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں یہود نے جس قدر بھی ہفوات و خرافات مشہور کیں اُن کی بنیاد صرف اس تہمت پر رکھی کہ یہ دونوں انبیاء علیہم السلام کی صف میں نہیں بلکہ (معاذ اللہ) عیار اور مکار دنیوی بادشاہوں کی صف میں شامل ہیں۔

اس لیے قرآنِ عزیز نے اُن کی تردید میں وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا جو ایسے موقعہ پر اختیار

کرنا چاہیے تھا وہ یہ کہ تمام آیات میں اُن کی جلالتِ قدر، عظمتِ مرتبہ، اور منصبِ نبوت و رسالت کو بہتر سے بہتر طریقہ پر ثابت کیا، اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اگر اُن سے کوئی لغزش بھی ہوئی تو وہ اُس نوع کی نہ تھی جس کی تہمتیں یہود تراشتے ہیں بلکہ اس نوع کی تھی جو اگرچہ مقربین کے لیے بمصداق حسنات الابرار سیئات المقربین "سیئہ" میں شمار ہوں مگر عوام و خواص کے لیے "حسنات" ہی گنی جاتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی واضح کر دیا کہ حضرت داؤد جلیل القدر انبیاء کی طرح فوراً ہی اس لغزش پر متنبہ ہوگئے اور ہماری طرف رجوع کیا اور ہم نے بھی اُن کو بخشش سے نوازا۔

سب سے آخر میں "مقالہ نگار" حضرت داؤد کی جانب نسبت کردہ لغزش کے متعلق ایک علم حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس تاویل کو قبول کرنے میں لوگوں نے صرف اس بنا پر تامل کی ہے کہ انبیاء کی طرف اس قسم کی لغزشوں کا انتساب عصمتِ انبیاء کے خلاف معلوم ہوتا ہے لیکن ان حضرات نے شائد اس امر پر غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور ادا کرنے کے لیے مصلحۃً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔ ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اُٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں۔ تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں۔"

"مقالہ نگار" کا عصمتِ انبیاء کے متعلق یہ خیال حضرت داؤد کے واقعہ سے آگے بڑھ کر ایک اصولی اختلاف پیدا کر دیتا ہے جو بہت اہم اور قابل توجہ ہے۔ مسئلۂ "عصمت انبیاء" قرآن عزیز کا اساسی عقیدہ

ہے اور انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق کی صداقت کا اس پر بہت زیادہ مدار ہے، یہی وجہ ہے کہ علم کلام و عقائد میں یہ معرکۃ الآرا مسئلہ سمجھا جاتا ہے، مگر سردست ہم اس پر مفصل نہیں لکھنا چاہتے انشاء اللہ مستقل کسی دوسرے موقعہ پر گزارش کرینگے۔

لیکن حسب مناسبِ مقام اس قدر گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ "عصمت" اور "لغزش" اگرچہ مفہوم کے اعتبار سے دو جُدا جُدا امور ہیں لیکن باتفاق علماءِ اسلام یہ دونوں بیک وقت ایک جگہ جمع ہو سکتے، اور ہو جاتے ہیں لہذا یہ کہنا کہ جب کسی پیغمبر سے لغزش ہوتی ہے تو خدا کی حفاظت و عصمت" اٹھالی جاتی ہے۔ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ان "عصمت" اور "گناہ" یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہو سکتے اور نہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ کہنا کہ "عصمت" انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے۔ سو اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ منطقی اصطلاح کے اعتبار سے صفتِ عصمت بذاتہا من حیث ہی ہی "ذات" کے لازمۂ غیر منفکہ میں سے نہیں ہے تو اس کا دعویٰ آج تک کسی نے نہیں کیا اور اگر اس کی مُراد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ذات میں حق تعالیٰ نے جو صفتِ "عصمت" ودیعت فرمائی ہے وہ گاہے جُدا بھی ہو جاتی ہے تو بالکل باطل اور قطعاً غلط ہے۔ اس کی نظیر خود صفتِ "نبوت" ہے سو اگر پہلے معنی کے اعتبار سے نبوت کو لازمۂ ذات کہا جائے تو کوئی بھی اس کا قائل نظر نہ آئیگا، اور اگر یہ کہا جائے کہ نبی کی ذات سے بعض اوقات میں نبوت کا خلع ہو سکتا ہے تو یہ قطعاً باطل ہے۔ درحقیقت کہنا یوں چاہیے کہ صفتِ نبوت اور صفتِ عصمت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ذاتِ انبیاء سے نبوت کی جُدائی ممکن ہے تو عصمت کی بھی ممکن اور اگر یہ ناممکن ہے تو وہ بھی ناممکن ہے۔

الغرض انبیاء سے لغزشیں ہوتی ہیں مگر وہ عصمت کے خلاف نہیں ہیں نیز انبیاء سے کسی حال میں بھی "عصمت" کے خلاف کوئی عمل صادر نہیں ہوتا اس لیے "مقالہ نگار" کا لطیف نکتہ لغزشوں کے بارہ میں اگرچہ صحیح ہے لیکن "عصمت" کے اٹھالیے جانے کے سلسلہ میں قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔

اس قیل وقال کے بعد جو درحقیقت "علمی مذاکرہ" کی ایک شاخ ہے اور "مقالہ نگار" کی تنقید پر اداءِ شکریہ" کے بعد قارئین کرام سے پھر ایک مرتبہ گزارش ہے کہ یہاں معاملہ "بات کی پچ" اور "ہٹ دھرمی" کا نہیں ہے۔ قرآن عزیز کے اس واقعہ کے متعلق دونوں تاویلیں اور ہر دو تاویلات پر تنقیدیں آپ کے سامنے ہیں۔ خصوصاً اُن حضرات کے سامنے جن کی نظر سے مفصل دونوں مضمون گذرے ہیں وہ خود انصاف کے ساتھ جس تاویل کو اقرب الی الصواب اور شانِ "منصبِ نبوت" کے مناسب سمجھیں اختیار فرمائیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

خواطر و سوانح

افاداتِ علّامہ ابن جوزی

(از مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی)

شیطان کا ایک بہت بڑا فریب

(سلسلہ کے لیے ذیمہ کا برہان دیکھیے)

موحدِ اعظم ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جن کی شانِ توحید کا وثیقہ نیاز یہ تھا اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ(۱) اور جنھوں نے خدا کی زمین پر صبر و توکل کے عظیم الشان ستون قائم کیے تھے کیا انھوں نے وسائل معیشت کو ترک کر دیا تھا؟ نہیں! اُن کے پاس دولت کا حصۂ وافر موجود تھا۔ اُن کی مالی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُن کے پاس مویشیوں کی اتنی کثرت تھی کہ اُن کے ضروری بندوبست کے لیے انھیں اپنے شہر میں جگہ کی تنگی محسوس ہوتی تھی، ایسے ہی اُن کے عزیز لوط علیہ السلام اور بہت سے دوسرے پیغمبر اور حضرت داؤد و سلیمانؑ کی سطوتِ شاہی سے تو کون واقف نہیں۔ پھر وہ جماعت مقدس جس نے اپنا سب کچھ اللہ اور اُس کے رسول کے لیے قربان کر دیا تھا کسبِ اکتساب اُس کی زندگی کا نشانِ امتیاز تھا صحابۂ کرامؓ تجارت کے لیے سفر کرتے، محنت اُٹھا کر دولت حاصل کرتے، معاش کے جتنے جائز اور حلال طریقے ہو سکتے ہیں بے تکلف اُن کو اختیار کرتے اور اپنے دست و بازو سے پیدا کی ہوئی دولت کی حفاظت کرتے یہاں تک کہ جب اُس کے لٹا دینے کا وقت آتا تو ایک لمحے کے تامّل کے بغیر لٹا دیتے، غرضکہ جس چیز کو بہت سے نیک بخت بے وقوف اب توکل سمجھتے ہیں حضرات صحابہؓ

(۱) میں نے تو ہر طرف سے منہ موڑ کر اور توجہ ہٹا کر صرف اُسی ہستی کی طرف اپنا رُخ کر لیا ہے جو آسمان و زمین کی بنانے والی ہے۔

کے یہاں اُس کا نام تعطل تھا۔[1]

صدیق اکبرؓ کا مستقل شغل تجارت تھا۔ آپ نبی کریم صلعم کی موجودگی میں تجارت کے لیے مختلف سفر

---

(۱) توکل کی حقیقت سمجھنے کے لیے حدیث ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیے، ارشاد ہے: "لو توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصاً وتروح بطاناً" اگر تم حق تعالیٰ پر تم کو اعتماد ہو اور تم اس پر اتنا ہی بھروسہ کرو جتنا ایک مخلوق اور ایک مرزوق کو اپنے خالق اور رازق پر کرنا چاہیے، تو تمہیں وہ اس طرح روزی پہنچائے جس طرح اُس پرندے کو پہنچاتا ہے جو روزی کی تلاش میں سویرے سویرے اپنے آشیانے سے خالی پوٹے اُڑتا ہے اور شام کو جب واپس آتا ہے تو اس حالت میں آتا ہے کہ اُس کے پوٹے بھرے ہوئے ہوتے ہیں، سبحان اللہ کیسی پاک تعلیم ہے جو لوگ توکل کے لفظ کو موقع بے موقع استعمال کرنے کے عادی ہیں اور اُس کی حقیقت پر غور نہیں کرتے، اس ارشاد مبارک میں اُن کی اصلاح وہدایت کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔

غور کرو فضائے آسمانی میں اُڑنے والے پرندے کے قبضہ وتصرف میں نہ توغلوں اور غذاؤں کے خزانے ہیں نہ پانی سے بھرے ہوئے حوض اور تالاب، تاہم وہ اپنا آشیانہ چھوڑتا ہے اور اس کیفیت کے ساتھ چھوڑتا ہے کہ غلے کے ایک ایک دانے اور پانی کے ایک ایک قطرے کی اُسے جستجو ہوتی ہے۔ وہ فضاؤں میں اُڑتا پھرتا ہے یہاں تک کہ اُس کا رزق اس کے پاس پہنچ جاتا ہے اور وہ بھرے پیٹ اپنے بسیرے کی طرف لوٹتا ہے۔

تو دیکھیے پرندوں کے لیے قدرت نے یہ انتظام نہیں کیا کہ وہ اپنے آشیانوں میں پڑے روزی کا انتظار کرتے رہیں اور اُن کی روزی وہیں پہنچادی جائے، بلکہ وہ رزق کی طلب میں نکلتے ہیں اور جب نکلتے ہیں تو فضاؤں میں غیب سے اُن کی روزی کا سامان کردیا جاتا ہے۔ پھر جب جانوروں کے ساتھ یہ معاملہ ہے حالانکہ ان میں نہ تو کسب، اکتساب کی قوتیں ہیں نہ ادراک وتعقل کی عجوبہ کاریاں، پھر کیسے ممکن ہے کہ انسان جس کے اختیار وارادہ اور ادراک وتعقل کی ہنگامہ خیزیوں سے زمینوں کی پستیاں اور آسمانوں کی بلندیاں دہل رہی ہیں، سعی وکوشش کی جگہ کسل وتعطل کی راہ اختیار کرے اور قدرت گھر بیٹھے اس کی روزی اُس کے قدموں میں ڈال دے۔ ایسا انسان یقیناً مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہے اور اُسے اس ضعف وعجز اور خمول وکسل کی سزا ملنی چاہیے۔

مومن کی شان یہ ہونی چاہیے کہ اسباب وذرائع کی صحیح تشخیص کے بعد عمل کی جس منزل میں قدم رکھے اس یقین کے ساتھ رکھے کہ اسباب وذرائع کا اختیار کرنا میرا کام ہے اور ان میں اثر پیدا کرنا اُس قادر وتوانا کا، وہ چاہے تو منٹ کے منٹ میں تمام اسباب کی قوت کھینچ لے چاہے تو ایک معمولی اور ضعیف سبب کو تاثیر کی غیر معمولی قوتیں بخش دے۔ ہماری بڑی گمراہی یہ ہے کہ یا ہم گھر میں پڑے رہنے، عمل وسعی کی صلاحیتوں کو معطل کردینے کو توکل کہنے لگتے ہیں یا ہمیں اپنے دماغ، اپنی ذکاوت، اپنی عقل اور اپنے اختیار کردہ طریق کار پر اس درجہ اعتماد ہوجاتا ہے کہ ہم خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا مقصد حاصل نہیں ہوتا یا اُس میں غیر معمولی طوالت ہوجاتی ہے۔

مزید تشریح کا یہ محل نہیں۔

کرتے تھے۔ عبداللہ بن زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنے کاروبار اور اپنی جد وجہد کے نتیجہ کے طور پر دولت کی جو مقدار اپنے ترکہ میں چھوڑی تھی وہ تاریخ اسلام کی ایک معلوم ومشہور حقیقت ہے، ذی النورین کا تمول تمام صحابہؓ میں مشہور تھا۔ علی مرتضیٰؓ کے مالیہ کی نہیں صرف صدقہ کی مقدار چالیس ہزار تھی، مورخین کے یہاں مشہور صحابی ابن مسعودؓ کے ترکہ کا اندازہ نوے ہزار ہے۔

خود ذاتِ قدسی صفات صلعم نے کعب بن مالکؓ سے ارشاد فرمایا:۔

أمسك عليك بعض مالك — اپنے مال کے ایک حصہ کو محفوظ رکھو

سعد بن ابی وقاصؓ کو مشورہ دیا۔

لان تترك ورثتك اغنياء خير من — اپنے وارثوں کو اس حال میں چھوڑنا کہ وہ مستغنی ہوں اور ان کے پاس گزر اوقات
ان تتركهم عالة يتكففون الناس — کی کوئی صورت ہو، اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ان کو اس طرح چھوڑا جائے کہ محتاج ومفلس ہوں اور ان کی زندگی دوسروں کے رحم وکرم پر رہ جائے۔

کتب احادیث وسیر میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں ہم نے یہاں صرف تمثیل پر اکتفا کیا ہے۔ سفیان ثوریؒ بہت بڑے کاروباری آدمی تھے، لیث بن سعدؒ ہر سال کم سے کم بیس ہزار کا کاروبار کرتے تھے۔ ابن مہدیؒ کی تجارت میں ہزاروں اشرفیاں لگی ہوئی تھیں، امام اعظم ابی حنیفہؒ کا کاروبار لاکھوں روپیہ کا تھا، ان کے اسی کاروبار کے طفیل کتنے ہی علما، خدمتِ حق کے لائق ہوئے یہاں تک کہ اُمت نے منصب امامت ان کے سپرد کیا۔ غرضکہ وسائلِ معیشت کی جستجو اور اُن وسائل کے مطابق عمل کرنا سلف صالح کی عام عادت تھی اور وہ اسے عین توکل خیال کرتے تھے۔

تفصیل کا یہ موقع نہیں، ورنہ اس سلسلہ میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اتنی تفصیل بھی اس لیے کی گئی ہے کہ اہلِ علم اس سے سبق حاصل کریں اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ اُن کے بزرگوں کا اسوۂ حسنہ کیا ہے، کیا یہ ہے جو بعض غلط کار وغلط اندیش مدعیانِ تصوف نے اختیار کر رکھا ہے کہ بغیر حقیقت پر

غور کیجیے الدنیا اھون علی اللہ من شاۃ میتۃ علی اھلہا[1] کی رٹ لگاتے پھرتے ہیں اور وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور[2] کے بے محل وعظ کہہ کہہ کر خدا کی مخلوق کے قوائے عمل کو مضمحل کر رہے ہیں یا یہ ہے جس کا ذکر سطورِ فوق میں ہوا، ہاں اہل دین اور اہل دنیا کے درمیان جو حدِ فاصل ہے وہ یہ ہے: اہل دنیا دنیا کو مقصود سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے اس میں غرق ہوتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اہل دین کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ذرائع معاش اور تحصیل دولت کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے لیکن جب اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت کے لٹا دینے کا وقت آتا ہے تو بے تامل لٹا دیتے ہیں[3]۔

ہاں تو ذکر یہ تھا کہ سمجھ کی بات یہ ہے دولت پیدا کرنے کی اور حاصل شدہ دولت کی حفاظت کی کوشش کیجائے۔ علی الخصوص علماء کو تو اس کا بہت ہی خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے ایسے بہت سے اہلِ علم کو دیکھا ہے کہ پہلے تو تحصیلِ علم کی مصروفیتوں نے انھیں کسب واکتساب سے بے تعلق رکھا اور ان کو اس منزل میں قدم رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن جب ان کے مصارف بڑھے اور ضروریات کے لیے انہیں روپیے کی ضرورت پیش آئی تو ان کے سامنے اس حسرتناک منظر کے سوا کچھ نہیں تھا کہ سوسائٹی میں

---

(۱) مردار بکری کی جو قیمت اور جو وقعت ہو سکتی ہے خدا کے یہاں دنیا اس سے بھی ہلکی اور بے وزن ہے۔

(۲) دنیا کا کارخانہ فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۳) اس باب میں صدیق اکبرؓ کا واقعہ بطور اساس کے سامنے رکھنا چاہیے۔ غزوۂ تبوک کی مہم میں جب انہوں نے راہِ حق میں اپنا تمام مال ومتاع پیش کر دیا تو ان سے دریافت کیا گیا:-

ما ابقیتَ لِاھلِکَ (اپنے متعلقین کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو!) اس پیکرِ اتقیا ورضا نے جواب دیا: ابقیتُ لھم اللہ ورسولہ۔ (اللہ اور اللہ کے رسول کو)

اللہ اکبر کیا یہ وہی صدیق اکبرہیں جو اپنے کاروبار کی ترقی اور دولت کی تحصیل کے لیے طول طویل سفر کرتے تھے

آنکس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند فرزند وعیال وخانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

تحصیلِ دولت اور اس کو مصرفِ صحیح میں خرچ کرنے کا مسئلہ تفصیلات کا طالب ہے، یہاں ہم نے صرف چند اشارات پر اکتفا کیا ہے۔

اُن کی اور اُن کے علم کی کوئی وقعت نہیں، عام لوگوں کی نظر میں وہ ذلیل ہیں، اُن کی اعانت کے لیے یا تو کوئی آمادہ نہیں ہوتا، ہوتا ہے تو یہ سمجھ کر کہ وہ ایک محتاج اور گرے ہوئے طبقہ کی اعانت کر رہا ہے، حالانکہ اہل علم ہی ہر طرح کی عزت افزائیوں کے مستحق ہیں۔ پہلے زمانہ میں تو یہ صورت تھی کہ اہل علم وفضل کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتی تھیں اور انہیں دوسروں کا رہینِ احسان ہونا نہیں پڑتا تھا۔[1] اب جبکہ وہ صورت باقی نہیں رہی۔ ادھر ذرائع معاش کا پہلے سے فقدان، تو اب کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ کسی متدین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ دین و دیانت کے کسی حصّہ کو قربان کیے بغیر وہ کچھ حاصل کر سکے، اور اے کاش اس طرح ہی اُس کی ضرورت پوری ہو جاتی، مگر نہیں ہوتی بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دین میں بھی رخنہ پڑتا ہے، دیانت بھی رخصت ہوتی ہے اور ملتا کچھ بھی نہیں۔

پس ہر اُس شخص کے لیے جس کے دماغ میں عقل وفہم کی کچھ بھی روشنی باقی ہے یہ ضروری ہے کہ اپنی دولت کی حفاظت کرے اور بہتر سے بہتر ذرائع کسب اختیار کرنے کی کوشش، ایسا نہیں کریگا تو محض روزی کے لیے یا ظالم کی مدارات کرنی پڑیگی یا جہل کی چوکھٹ پر علم کو جھکنا پڑیگا۔[2]

یاد رکھو آج کل کا رسمی فقر محض عجز کی دوسری تعبیر ہے، کبھی اس تعبیر سے دھوکا نہ کھانا، کسب واکتساب کا پہلا قدرتی اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان دینے والا اور صدقہ کرنے والا بنتا ہے لینے والا اور خیرات کھانے والا نہیں بنتا، ظاہر ہے اس مرتبہ کی قدر ومنزلت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ لوگ جسے فقر سمجھتے ہیں اور اُس پر

---

(۱) علامہ ابن جوزی چھٹی صدی ہجری میں یہ نصیحتیں کر رہے ہیں حالانکہ وہ زمانہ بڑی حد تک اسلامی عروج وسطوت کا زمانہ ہے، علامہ موصوف ہمارے دور میں ہوتے تو کیا رائے قائم کرتے؟

(۲) نوابوں اور امیروں کے محلوں میں فضیلت کی دستاروں اور علم کے جبّوں کی جو توہین ہو رہی ہے اس موقع پر اُس کا نقشہ آنکھوں میں جما لینا چاہیے۔ اہل علم دولت والوں کے گھروں کے طواف کے لیے کیوں مجبور ہیں، صرف اس لیے کہ علم کے ساتھ اُنھوں نے ذرائع معاش کی تحصیل کی طرف توجہ نہیں کی نہ صرف یہ کہ توجہ نہیں کی بلکہ اپنا پہلا اندوختہ بھی جوش میں آکر ضائع کر بیٹھے۔ اچھا اب اگر اپنے خیال میں اس راہ کو توکل کی راہ سمجھ رہے تھے تو اُسی پر قائم رہتے، مگر یہ بھی نہیں ہوتا۔

تعلیماتِ شریعت کو منطبق کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں حقیقت میں وہ ایک روگ ہے جس کا شکار وہ کم ہمت اور پست ارادہ لوگ ہوتے ہیں جن کے قوائے کسب و عمل پر پالا پڑچکا ہے اور جو بے کار پڑے کتے رہتے ہیں۔ سیأتینی رزقی (میری روزی اب آئی اور جو مقدر ہے وہ تو ہو کر ہی رہیگا)

جس شخص کو اِن حقائق پر غور کرنے کی توفیق ہوگی وہ مقامِ غنیٰ کی بلندی کا اندازہ کر سکیگا۔ یعنی اُسے معلوم ہوگا کہ اپنے کسب اور اپنی محنت وکاوش سے حاصل کی ہوئی روزی کی حیثیت کتنی اونچی ہے اور فقر کی وہ منزل جہاں انسان دوسروں کا محتاج ہو جائے کس قدر پست اور پُرخطر منزل ہے۔

قومی زبان

از پروفیسر مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی

اس رسالہ میں دلائل کی روشنی میں یہ بحث کی گئی ہے کہ قومیتِ مشترکہ کے قیام کے لیے ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ہندوستان کے ہر خطہ میں بولی یا سمجھی جاتی ہو اور جس کی تعمیر میں ہندوستان کی مختلف قوموں نے حصہ لیا ہو۔ نیز ثابت کیا گیا ہے کہ مقبولیت و وسعت، اشاعت وطباعت کی سہولت تلفظ کی شیرینی اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کی مشترک زبان صرف اُردو ہوسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ان اعتراضوں کو نہایت سلجھے ہوئے پیرایہ میں رد کیا گیا ہے جو اُردو زبان پر کیے جاتے ہیں۔ غرضکہ مؤلف نے اس چھوٹے سے رسالہ میں نہایت ہی دلنشین انداز بیان کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ اُردو زبان اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی بہترین زبانوں میں ہے۔ ۵ر کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔ پتہ:- منیجر مکتبہ برہان قرولباغ نئی دہلی۔

میر عبد الجلیل بلگرامی

از جناب مولوی عبدالمالک صاحب آروی

مضمون ذیل ایک صاحب کے سوال کے جواب میں ہے جو انہوں نے میر عبدالجلیل صاحب بلگرامی کے حالات سے متعلق کیا تھا۔ ذیل میں سوال و جواب دونوں درج کئے جاتے ہیں۔ "مدیر"

مکرمی مولوی صاحب محترم دام لطفہ ۔ السلام علیکم ۔

میں سید عبد الجلیل بلگرامی اور سید غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات زندگی اور اُن کے آثار شعریہ سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ کیا آپ براہ کرم مجھے مطلع فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ میں اس مقصد میں کس طریقہ سے کامیاب ہو سکتا ہوں۔

کیا ان حضرات کا عربی کلام مطبوعہ شکل میں یا کم از کم مدون صورت میں باقی ہے؟ اگر ہے تو کہاں ہے اور کس طرح سے میں اُسے حاصل کر سکتا ہوں اور اُن کے حالاتِ زندگی کیا سیر و تذکرہ کی کتابوں میں مل سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کن کن کتابوں میں؟ ان کے نام وغیرہ بھی ضرور تحریر کیجیے۔

چونکہ آپ خود عربی ادبیات میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں جس کا ثبوت آپ کے اُن بلند پایہ اور محققانہ مضامین سے ملتا ہے جو ۱۹۲۰ء سے اب تک وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ آپ کو ان حضرات کے حالاتِ زندگی اور کمالات علمی سے واقفیت نہ ہو۔ علاوہ بریں آپ کا وطن بھی اُسی سرزمین میں واقع ہے جو ان بزرگوں کے زاد بوم سے شاید بالکل قریب ہے یا کم از کم وحدت جغرافی سے تو خارج نہیں لہذا انسبتاً آپ کی معلومات اس موضوع پر بہت وسیع ہونگی۔ اسی بنا پر میں نے آپ کو تکلیف دی کہ اُمید

آپ براہ کرم ضرور اپنے گرانقدر معلومات سے مجھے مستفید فرمائینگے۔

ان حضرات کے علاوہ اور عربی زبان کے ہندی نژاد شعرا کا حال آپ کو معلوم ہو تو اُس سے بھی ضرور مطلع کیجیے، میں بہت ممنون ہونگا۔ فقط والسلام۔ سید ذکی الدین

میر عبدالجلیل بلگرامی (مولود ۱۰۷۱ھ متوفی ۱۱۳۸ھ) اور غلام علی آزاد (مولود ۱۱۱۶ھ) کے حالات زندگی اور مجموعۂ کلام کے متعلق آپ نے تفتیش کی ہے، مجھے وطنی اعتبار سے اساتذۂ بالا سے اتنی ہی دوری ہے جتنی آپ کے مدراس کو بمبئی سے بُعد ہے۔ میر عبدالجلیل کی زندگی کا بیشتر حصہ بلگرام (یوپی) پھر گجرات، اور اس کے بعد سیوستان (سندھ) اور دہلی میں گذرا۔ عالمگیر کے عہد میں وہ وقائع نگاری اور بخشی گری کے عہدہ پر فائز تھے اس کے بعد عہد بعہد وہ حکومت مغلیہ میں معزز عہدہ پر فائز رہے، فرخ سیر کے عہد میں آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ میر عبدالجلیل صاحب نے حدیث سید مبارک حسین بلگرامی سے پڑھی، وہ شیخ نورالحق دہلوی ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد تھے، اس کے بعد تفسیر و حدیث، سیر و اسماء الرجال، تاریخ عرب و عجم غلام نقشبند لکھنوی سے پڑھی السنۂ اربعہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور نہ صرف ان چاروں زبانوں کے ماہر تھے بلکہ ان میں بے تکلف فصیح گفتگو کرتے تھے، اور نظمیں لکھا کرتے تھے، لغات و حساب میں بھی مہارت تھی، بہت بڑے ادیب و شاعر تھے۔ چنانچہ آپ کے نواسہ آزاد بلگرامی نے آپ کے عربی کلام کا اقتباس "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" میں دیا ہے۔ ہندی اشعار کا انتخاب آزاد نے اپنے فارسی تذکرے "سرو آزاد" میں درج کیا ہے، آپ کے حالات آزاد نے اپنی عربی تصنیفات "سبحۃ المرجان" اور "تسلیۃ الفواد" میں درج کیے ہیں۔ میر جلیل کی تصنیفات کا استقصار کرنا اس وقت مشکل ہے، ان کے ایک علمی الکتاف "دلیل ہندسی علی ابطال جزء لایتجزیٰ" کا تذکرہ آزاد نے "سبحۃ المرجان" میں کیا ہے، آپ کی ایک فارسی مثنوی عرصہ ہوا "کتب خانہ حیدری آرہ" میں نظر سے گذری تھی، تصنیفات کا پتہ آپ کو کوا تھ لائبریری (ذریعہ جان محمد بلگرامی) مل سکیگا۔ "کوا تھ" آرہ کی نصل

ایک گاؤں ہے، یہیں سادات واسطی کی مختصر سی آبادی ہے، یہاں بہت ہی اہم لائبریری ہے، اس میں نایاب اور نادر مخطوطات عربی و فارسی کا مجموعہ ملیگا، یہیں آپ کو میر جلیل اور آزاد کی تقریباً کل کتابیں مل سکتی ہیں۔ آزاد کے حالات تو عہد محمد شاہی کے تمام تذکروں میں ملینگے وہ والہ داغستانی (مصنف تذکرہ ریاض الشعراء) خان آرزو (مصنف مجمع النفائس) اور حزیں لاہجی (متوفی ۱۱۸۰ھ) کے معاصر ہیں۔ حزیں نے اپنے ہاتھ سے اشعار لکھ کر آزاد کی خدمت میں روانہ کئے۔ اس کا تذکرہ آزاد نے "ید بیضا" میں کیا ہے۔ آزاد سے شفیق دکنی (مصنف چمنستان شعراء) کو بڑی عقیدت تھی، چنانچہ شفیق نے "چمنستان" میں جہاں جہاں پیر و مرشد کہا ہے اس سے مراد آزاد ہی کی ذات ہے، آزاد نے مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا سید طفیل محمد بلگرامی سے لغت و سیر اور سند حدیث حاصل کی اپنے نانا میر جلیل سے حدیث، اور عربی اور فارسی شاعری کی تعلیم حاصل کی، ادب، عروض و قوافی کی تحصیل اپنے ماموں سید محمد بلگرامی سے کی سید لطف اللہ چشتی سے بیعت کی ۱۱۵۰ھ میں سفر بیت اللہ کیا، مدینہ میں شیخ محمد حیات سندی مدنی سے صحیح بخاری پڑھی، اور صحاح ستہ وغیرہ کی اجازت لی، پھر شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری (متوفی ۱۱۵۷ھ) سے احادیث کے متعلق بہت سے فوائد حاصل کیے آزاد کے عربی دواوین کا ایک کرم خوردہ قلمی نسخہ آرہ کے ایک کتب خانہ (مولوی عبدالحکیم صاحب ایڈیٹر "آفتاب عالم") میں موجود ہے، "سبحۃ المرجان" میں خود آزاد نے اپنی تصنیفات کی ایک فہرست دی ہے لیکن یہ فہرست نامکمل ہے۔ چونکہ سبحۃ المرجان کی تاریخ تالیف ۱۱۷۷ھ ہے آزاد کی تصنیفات جو سبحۃ المرجان میں مذکور ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

ضوء الدراری شرح صحیح البخاری۔ یہ شروع سے لے کر کتاب الزکوٰۃ کے آخر تک صحیح بخاری کی شرح ہے،

تسلیۃ الفؤاد۔ اس میں آزاد کے قصائد اور بعض فوائد علمیہ درج ہیں اسی کے ساتھ علماء

کے حالات ہیں اسی میں اپنے نانا میر جلیل کی سوانح حیات درج کی ہے۔

عربی میں دُو دیوان ۔ ان کو انھوں نے مدینہ منورہ بھیجا تاکہ "روضہ خضرا" میں تبرکاً آویزاں کئے جائیں دونوں دیوانوں میں تین ہزار اشعار ہیں۔

سبحۃ المرجان ۔ اس کے متعلق سطور بالا میں مختصراً لکھا جا چکا یہ کتاب آزاد کے کمالات علمیہ کا آئینہ ہے، اس سے تاریخ، ادب، لغت، حدیث وغیرہ تمام فنون پر ان کی دستگاہ کا حال معلوم ہوگا

غزلان الهند ۔ اس کتاب کی تاریخ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی نے اپنی کتاب "قسطاس البلاغۃ" میں کہی ہے، ۱۱۲۶ھ میں حسرت حج کو گئے تھے، سبحۃ المرجان میں اس کتاب کا تذکرہ نہیں پایا جاتا،

متذکرہ بالا کتب تو عربی میں ہیں فارسی میں ان کی مفصلہ ذیل تصنیفات ہیں۔

ید بیضا، سروآزاد، خزانۂ عامرہ ۔ یہ تینوں فارسی تذکرے ہیں۔ ان میں انھوں نے ایران توران اور ہندوستان کے فارسی شعرار کا تذکرہ لکھا ہے۔

"روضۃ الاولیار" اس میں بعض اولیار اللہ کے حالات ہیں۔

"مآثر الکرام تاریخ بلگرام" اس میں اپنے وطن بلگرام کے اولیار، علما، اور شعرار کے حالات درج کئے ہیں۔

"دیوان فارسی" ان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔

"سبحۃ المرجان" کے اندر انھوں نے مسعود سلمان لاہوری کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ میرے دُو دیوان عربی میں ہیں، ایک فارسی میں ہے، اور ہر چند ہندی میں میرا دیوان نہیں لیکن میں ہندی شاعری کے دقائق و نکات سے بہرہ وافی رکھتا ہوں۔

خیر یہ تو آپ کے اُس سوال کا جواب ہے جو جلیل اور آزاد کے متعلق آپ نے کیا تھا، ہندستان کے عربی شعرا کے حالات اور ان کا کلام متفرق ہے۔ ابھی تک کوئی تذکرہ ایسا مرتب نہیں ہوا جس میں ایک جگہ

ہندوستان کے عربی شعراء کا حال معلوم ہو، سبحۃ المرجان، سروآزاد اور مآثر الکرام وغیرہ کا مطالعہ کیجیے آپ کو اس سلسلہ میں بڑی مدد ملیگی۔ ہندوستان میں "عربی زبان کی ترقی" بہت اہم اور تحقیق طلب عنوان ہے۔ پنجاب، یو۔پی، سندھ اور بہار میں زبان عربی کے بڑے بڑے جید علماء پیدا ہوئے۔ مسعود بن سعد بن سلمان لاہوری عربی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ عربی، فارسی اور ہندی میں ان کے تین دیوان ہیں یہ چھٹی صدی ہجری میں گذرے ہیں۔

فیضی کی سواطع الالہام جو بقول تقی اوحدی (مؤلف تذکرہ عرفات العاشقین) نصف قرآن کی تفسیر ہے۔ زبان عربی کا ایک ایسا معجزہ ہے جس پر ہندوستان جتنا بھی فخر کرے بجا ہے، یہ کتاب بقول محمد علی خاں (صاحب بحر مواج) اکبر کے جلوس کے اُنتالیس سال یعنی ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی۔ اس میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ الفاظ بے نقط استعمال ہوئے ہیں، اسی طرح فیضی کی دوسری کتاب "موارد الکلم" جو فلسفۂ اخلاق (Ethics) پر ہے، عربی زبان کی ایک خاص چیز ہے، اس میں بھی بے نقط کے الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ خانِ آرزو کا بیان ہے کہ اس کا خاتمہ تمام نقطہ دار الفاظ پر ہوا ہے ان کتب سے پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان پر فیضی کو کس قدر عبور تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی عید

از جناب خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی بی۔اے

یہ وہ تقریر ہے جو ۲۴ نومبر ۱۹۳۸ء کو ۸ بجے شب میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر ہوئی اب اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے برہان میں شائع ہو رہی ہے۔

عیدیں دو ہیں، ایک عید الفطر دوسری عید الضحیٰ۔ پھر پھر آتی رہتی ہیں۔ اس لیے عید کہلائیں مادہ عود ہے۔ عید الفطر میں فطر کے معنی کھلنے کے ہیں۔ آپ جو افطار کا لفظ بولتے ہیں یہ وہی ہے۔ آج مہینے بھر کے روزے کھلتے ہیں۔ یوں عید الفطر ہوئی۔ عورتیں اس کو میٹھی عید بھی کہتی ہیں۔ وجہ یہ کہ آج کے دن سویاں پکتی ہیں اور کھائی جاتی ہیں۔ مگر یہ ہندوستان کی رسم ہے، اور کہیں نہیں دوسرے ملکوں میں تو ان کا نام بھی نہیں جانتے۔ دوسری عید "عید الضحیٰ"۔ وجہ تسمیہ یہ کہ ضحیٰ دن چڑھے کو کہتے ہیں۔ اس عید کی نماز دن چڑھے ہوتی ہے، عید الضحیٰ کہلائی۔ دوسرا نام عید قرباں ہے، اس لیے کہ اس دن قربانی ہوتی ہے۔ یہ عید فریضۂ حج کی ادائیگی کا شکریہ ہے، اسمٰعیلی یادگار ہے، تفصیل بے موقع ہے۔ عورتیں اس کو بکرید کہتی ہیں، عید البقر کی خرابی ہے، یہ ایک اور[1] اسی کا نام ہے۔ یہاں تک تو عیدین کے ناموں کا تذکرہ ہوا۔ اب اگر میں آج کی عید کا بیان کروں تو تحصیل حاصل ہوگی شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ آپ نے سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہاں اگر بہادر شاہ کے وقت کی عید کا کچھ بیان ہو تو شاید یہ میٹھی عید کچھ سلونی ہو جائے۔ مٹھاس سے تو دل بھر گیا ہوگا، اب سلونے کو جی چاہتا ہوگا۔ تو لیجیے یہی سنیے:-

[1] "اور" بمعنی دیگر۔ چونکہ اس کے تلفظ میں کسی قدر کھنچاؤ ہے اس لیے "و" پر "ہ" دیدیا ہے، تاکہ "اور" عطفی سے ممتاز ہو جائے۔ "کاتب"

بہادر شاہ لال قلعے میں بسنے والا آخری بادشاہ ہے، اس کے بعد قلعہ ویران، دلّی اُجاڑ، محل سنسان، پڑا اُلّو بول رہا ہے۔ دیکھیں بھائی اس بادشاہ کے پاس کیا دھرا تھا۔ بتاؤ تو کسی ملک پر حکمرانی تھی۔ کہنے کو سارے ہندوستان کی سلطنت، مگر حقیقت میں قلعہ کی چار دیواری کے اندر حکومت باہر چار دانگ ہند میں سرکار کمپنی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ قلعہ پر قلعہ دار انگریز دروازہ کے اوپر رہتا ہے، نیچے اس کے سپاہی پہرے پر تعینات ہیں۔ پرچم شاہی لہرا رہا ہے۔ قلعہ ہی پر ہے اور کہیں نہیں۔ باقی سارے ملک میں بیرق انگلیسی۔ اب مالی حالت سنیئے ایک لاکھ روپے کی پنشن پر گزر اوقات ہے۔ سارے شاہی خاندان کی پرورش اور شاہی ساز و سامان کا بار اور یہ قلیل رقم۔ یہ وہی قلعہ ہے جہاں کروڑوں روپیے گنتے تھے، اور دن عید اور رات شب برات ہوتی تھی یا اب یہ حال ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے خدا لارڈ لیک کا بھلا کرے کہ مرہٹوں کی بلا سے نجات دلائی اور ایک لاکھ روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر کردی۔ اس سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے شاہ جی نے تو ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ یہ وہی حضرت ہیں جن کے نام سے آج شاہ جی کا چھتہ اور شاہ جی کا تالاب مشہور ہے۔ خدا کا شکر ہے تالاب تو مٹ گیا، مگر چھتہ باقی ہے۔ ماشاء اللہ فقیرزادے ہیں اور خود بھی فقیری میں دم مارتے ہیں مگر کوتک یہ ہیں کہ بادشاہ اور شاہزادوں کو فاقہ مار رکھا ہے، اور خود لقمۂ تر کھاتے ہیں۔ صبح شام فصیل پر چڑھ کر بادشاہ زادے کوستے نظر آتے ہیں صرف پچاس ہزار ڈیک کا روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ (یہ روپیہ آٹھ آنہ کی برابر ہوتا تھا) وہ بھی دو دو مہینے ندارد۔ اب فرمائیے جب ایک لاکھ روپیہ ملنے لگا اور وہ بھی ماہ بماہ، اچھا ہوا یا برا؟

یہ سب کچھ تھا، مگر ساری پرانی باتیں موجود تھیں۔ وہی سارے کارخانے، وہی سارے عہدے جن عہدوں کی تنخواہیں ایک زمانہ میں لاکھ لاکھ روپیہ تھیں اب گھٹتے گھٹتے دس دس اور پانچ پانچ پر نوبت آگئی، نام وہی تھے گو درشن تھوڑے۔

لیجیے اسی زمانہ میں عید آتی ہے۔ بہار کا موسم ہے، جاڑا رخصت ہوا ہے گرمی کی آمد آمد ہے سرسوں

پھول رہی ہے، سارا جنگل زرد وردی پہنے کھڑا ہے۔ جدھر آنکھ اٹھتی ہے زرد کے سوا دوسرا رنگ ہی نظر نہیں آتا۔ جب وقت کا یہ سہاؤ ہے تو ہم بھی زرد پوش کیوں نہ ہو جائیں۔ منع کس نے کیا ہے۔ شوق سے سرسوں کے کھیت بنجائیے۔ اس زمانہ کا یہی دستور تھا اور یہی ہوتا تھا سب زندہ دل تھے، اب کی طرح مردہ دل نہیں۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

لیجیے عید کی صبح ہوئی۔ فراش تین چار دن سے سرگرم کار تھے۔ دیوان عام کو جھاڑ پونچھ کر سجا دیا ہے۔ دروں پر بسنتی پردے لٹک رہے ہیں، ستونوں پر زربفت تو اب کہاں کپڑا زرد رنگ کا لپٹا ہوا ہے اس پر دھنک ٹکی ہوئی ہے، خدا معلوم کھری ہے یا کھوٹی۔ تخت پر فرش بھی زرد ہے۔ سورج نکلتے ہی امیر امرا آنے شروع ہو گئے، اور دیوان عام میں قرینہ قرینہ سے کھڑے ہونے لگے۔ ابھی کرامات تسبیح خانہ میں برآمد ہیں یاد الٰہی میں مشغول۔ فوج فرا حاضر ہو گئی، سارا جلوس لگنا شروع ہو گیا۔ اہتمام و انداز وہی ہے جو سلف سے چلا آتا ہے لیکن ہر چیز پر فلاکت کے آثار نمایاں ہیں، گویا عہد ماضی کا منہ چڑایا جا رہا ہے۔ امیر بھی ٹوٹے پھوٹے ہیں۔ لباس اور سواریاں بھی واجبی ہی سی، کاٹ کی تسلیم میں کاٹ کا امام۔ اب سارا انتظام درست ہو گیا۔ بادشاہ سلامت ہوادار پر سوار تشریف لا رہے ہیں، چار کہار کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں، ان کی وردیاں بھی زرد ہیں۔ دہنے ہاتھ کی طرف ہوادار کا ڈنڈا پکڑے ہوئے حکیم احسن اللہ خاں ساتھ ہیں، طبیب خاص بھی ہیں اور وزیر اعظم بھی۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کی سعی دوران غدر میں کامیاب ہوئی، اور بہادر شاہ انگریزوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ ورنہ خدا معلوم کیا ہل چل مچتی۔ اس جھگڑے کو چھوڑیے اس سے ہمیں کیا مطلب۔ دوسری طرف محبوب علی خاں خواجہ سرا ہیں، یہ ناظر محلات ہیں۔ حکیم صاحب کے بعد انہی کا نمبر ہے۔ ان دونوں میں قدرے چشمک ہے، اور کبھی کبھی اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ ایام غدر میں رحلت فرمائی۔ علت لقمہ کے مریض تھے، آخر کار استسقا ہو گیا۔ ہوادار آگے بڑھا اور اب دوسرے ہوادار آنے شروع

ہوئے۔ دیکھیں یہ کون لوگ ہیں، پہلے ہیں مرزا مغل سوار ہیں، یہ ولی عہد بہادر ہیں۔ اس وقت جام عشرت سے سرمست ہیں، غدر میں جام شہادت نوش فرمائینگے، عنفوان شباب ہے، صورت شکل ماشاء اللہ ہزاروں میں ایک، کیوں نہ ہو مغل بچہ ہیں۔ اب اور ہوا دار نمودار ہوا، اس پر مرزا جوان بخت سوار ہیں یہ لاڈلی بیوی کے لاڈلے بیٹے ہیں، کم سن ہیں چھریرہ بدن ہے، خط وخال نازک اور خوشنما ہیں۔ ممتاز محل اور حکیم احسن اللہ خاں اس فکر میں ہیں کہ اُن کو ولی عہد بنائیں۔ سازش کا جال بچھا ہوا ہے، انگریزوں سے گفت وشنید ہو رہی ہے، کچھ عدہ وعید بھی ہو گئے ہیں، اس وقت ذکر کا موقع نہیں، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ اور ان کی ماں بادشاہ کے ساتھ رنگوں میں جلاوطن رہے۔ لیجیے سواری آگے بڑھی اور کرامات کا ہوادار لال پردہ سے باہر نکلا، سامنے مولا بخش ہاتھی کھڑا ہے۔ اس کو بٹھایا گیا، سیڑھی لگی اور بادشاہ سلامت عماری میں رونق افروز ہوئے۔ پیچھے حکیم احسن اللہ خاں بیٹھے۔ ان کے ہاتھ میں دُم گاؤ تبت کا مورچھل ہے مگس رانی کر رہے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے پیکدان اور خاصدان رکھا ہے۔ بھنڈ بردار بھنڈ لیے نیچے کھڑا ہے۔ شک کی نے عماری پر رکھی ہے۔ ہاتھی کو چرکٹے گھیرے ہوئے ہیں۔ ادھر ہاتھی کھڑا ہوا اُدھر باہر سے سلامی کی توپیں سر ہوئیں، پیچھے دو اور ہاتھی ہیں۔ ان پر ہودج کسے ہوئے ہیں۔ پہلے پر مرزا مغل براجمان ہیں اور دوسرے پر مرزا جوان بخت۔ سواری قلعہ کے دروازہ پر پہنچی انگریز قلعہ دار مع اپنی فوج کے دستہ کے حاضر ہے۔ انگریزی قاعدے سے سلامی اُتاری۔ سواری کی ترتیب یہ ہے۔ آگے آگے توپ خانہ ہے، توپیں باپ دادا کے وقت کی ہیں نوایجاد نہیں۔ اب تو بس دھلکے ہی کے کام کی رہ گئی ہیں۔ ان کو چار چار چھ چھ بیلوں کی جوڑیاں گھسیٹ رہی ہیں۔ سامنے کالے خاں گولنداز گھوڑے پر سوار چلا جاتا ہے، یہ ترک بچہ ہے، خوش رو ہے اور قد آور اور حسیم بھی۔ غدر میں اس کی ایک ٹانگ گولے سے اُڑ گئی اور اس کے صدمہ سے فوت ہو گیا۔ اس کے بعد روشن چوکی کا ہاتھی ہے۔ سواری چلتی جاتی ہے روشن چوکی بجتی جاتی ہے پیچھے پیچھے سواروں کی فوج ہے۔ کچھ زیادہ نہیں کم وبیش سو ہونگے سب ہتھیاروں اور وردیوں

سے آراستہ ہیں۔ پرا باندھے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیدل فوج ہے یہ بھی کثیر نہیں، تاہم کیل کانٹے سے درست ہے۔ لیجیے اب جھنڈی برداروں کی باری آگئی۔ یہ کم عمر لڑکے ہیں۔ سُرخ زرد جھنڈیاں ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ صرف سواری کی آرائش ہیں کسی کام کاج کے نہیں۔ اب خود بدولت کا ہاتھی آگیا جھومتا جھامتا چلا جا رہا ہے۔ عجیب انداز کا ہاتھی ہے۔ قدوقامت میں معمولی ہاتھیوں سے بہت بڑا ہے، اور وفاداری کا تو ذکر کیا۔ جب بادشاہ قید ہوگئے، اُس نے دانہ پانی ترک کر دیا، لاکھ کوشش کی کچھ نہ ہوا۔ آخر روتے روتے مرگیا۔ کیوں بھائی ہم تم بھی اپنے آقا کے لیے جاں نثار ہیں؟ جانور سے سبق لو اور جاں نثاری سیکھو۔ دیکھو اس کی بدولت اس کا نام آج تک زباں زد خلائق ہے۔ اب ولی عہد اور مرزا جواں بخت کے ہاتھی آ رہے ہیں۔ مرزا جواں بخت کے ہاتھی کے آگے کچھ پرا پلٹن ہے۔ چھوٹی چھوٹی بندوقوں پر سنگینیں چڑھی ہوئی ہیں۔ یہ سب ہماری دہلی ہی کی بنی ہوئی ہیں۔ خانم کے بازار کے کاری گروں نے تیار کی ہیں۔ اب نہ وہ بازار رہا نہ وہ کاری گر۔ ان کی وردی گھاگرا پلٹن کی سی ہے اور قواعد پریڈ بھی انگریزی طرز کی کرتے ہیں۔ یہ پلٹن حضرت پیر و مرشد کی ایجاد ہے۔ اپنے چاہتے صاحبزادے کے لیے بنائی ہے۔ اس کا ان کو بڑا خیال ہے لڑکے کم سن ہیں اور بے ریش، قدوقامت میں برابر، شکل صورت میں ایک سے ایک افضل، سب شریف زادے۔ ان کا کپتان ایک مغل بچہ ہے، خاندانی لڑکا ہے، یہ گھوڑے پر سوار ننگی تلوار لیے آگے آگے چلا جاتا ہے۔ غدر میں اس پلٹن کا کیمپ جھروکے کے سامنے ریتی میں پڑا ہوا تھا۔ پلٹن کٹ کٹ کے لڑی اور سب نے جان دیدی۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

اب کبوترخانے کے ہاتھی کی باری ہے۔ کبوتروں کی کابک اس پر لدی ہوئی ہے اور چھتری بندھی ہوئی۔ تھوڑی دیر میں کبوترباز ان کو چھیپی دکھا دیتا ہے۔ یہ اُڑتے ہیں اور شاہی عماری کا کاواکاٹ پھر چھتری پر آن بیٹھتے ہیں۔ یہ پُرانی رسم ہے ہمیشہ سے کبوتر اسی طرح عماری پر سے نثار ہوتے چلے آتے ہیں۔

اب امیروزیر سب اپنی اپنی سواریوں پر سوار چلے آتے ہیں۔ کوئی گھوڑے پہ ہے کوئی ہاتھی پر کوئی رتھ میں، اگرزیادہ تر تام جھام اور پالکیوں میں سوار ہیں۔ ان کے نوکر چاکر ان کے اردگرد ہیں۔ بازار میں لوگ دو طرفہ کوٹھوں پر سواری کی سیر دیکھنے کو جمع ہیں۔ شہر سارا دلہن بنا ہوا ہے۔ شاہ دولہا ہے اور شہری برات۔

سواری خراماں خراماں چاندنی چوک اور کھاری باؤلی ہوتی ہوئی پرانی عیدگاہ جب پہنچی۔ بادشاہ ہاتھی سے اترے ہوادار پر سوار ہوئے اور اندر داخل ہو گئے۔ اب عمر بڑھ گئی ہے پیادہ پا چلنے سے معذور ہیں۔ صفوں سے گذرتے ہوئے امام صاحب کے پیچھے قالین کے مصلے پر جا بیٹھے۔ پوری صف انکے اور ساتھیوں کے لیے روک لی گئی ہے۔ امیروزیر جس کو جہاں جگہ ملی کھڑا ہو گیا۔ یہ خدا کا گھر ہے یہاں تفاوت مراتب نہیں۔ بس جہاں پناہ کی سواری کا آنا تھا کہ تکبیر ہوئی اور نماز شروع ہو گئی۔ نماز کے بعد خطبہ پڑھا گیا اور خطبہ حضور کے نام سے مزین تھا۔ خطبہ ختم ہوا۔ بادشاہ کی طرف سے امام صاحب کو خلعت عطا ہوا، اور سواری اسی شان و شوکت سے واپس ہو گئی۔ لیجیے عید مبارک اور بندہ رخصت!

مشرق و مغرب

(مولانا حامد الانصاری غازی)

مارک ٹوئین (Mark twain) کا قول ہے کہ "جنگ کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں" دنیا کے مدبر مانتے ہیں کہ یہ قول راستی پر مبنی ہے لیکن دنیا کی حالت یہ ہے کہ کوئی مدبر امکان جنگ کے بازو کو جھٹک کر یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ جنگ واقعی نہیں ہونی چاہیے۔ مدبروں کا حال یہ ہے کہ ان کی زبانیں امن کے ساتھ ہیں اور دل جنگ کے ساتھ۔ عوام کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ ان کے منہ میں جنگ کے ذکر سے وہی حلاوت پیدا ہوتی ہے جو تازہ انگور کے رس سے۔

مارک ٹوئین نے بجا کہا کہ جنگ کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے لیکن اہل دنیا کہتے ہی نہیں عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ دنیا کو ایک اور جنگ عظیم کی ضرورت ہے۔ وہ ایک قول ہے، یہاں ہزاروں عمل ترازو کے دوسرے پلے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک اور دوسرے ملکوں کے ارباب سیاست بھری کانفرنسوں میں امن کے فرشتے بن کر جاتے ہیں لیکن لوٹتے ہیں تو جنگ کے شیطانوں کی فوجوں کو ایک حکم کا منتظر پاتے ہیں۔

انسان اکثر آپس میں ایک دوسرے سے ذکر کیا کرتے ہیں۔ جنگ ہوگی اس ذکر میں دل کا ہیجان قوت کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ کل ہونے والی جنگ آج ہو جائے تو ہماری خوش فکری اور خوش سخنی کا سامان فراہم ہو جائے، گویا جنگ ایک تماشا ہے کہ

پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

اس تخیل میں عام غریب انسانوں کا کوئی قصور نہیں۔ دنیا میں قابو یافتہ مدبروں کے دل اور عوام کی زبانیں ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں امن کی قسمت ہے جب وہی جنگ پر آمادہ ہوں اور جنگ کو دور سے قریب لا رہے ہوں تو غریب عوام کی زبان کو حلق سے کیسے کھینچا جا سکتا ہے۔

امن اور جنگ کے متعلق دنیا کے رجحانات کے متعلق روس کے وزیر خارجہ ایم لیٹونوف نے جس قدر صاف اور سچی بات کہی ہے، کسی دوسرے نے نہیں کہی۔

"ہماری عادت میں یہ بات داخل ہوگئی ہے کہ ہم یہ اعلان کرتے رہیں کہ جنگ کے بعد امن قائم ہو جائیگا۔ یہ بات غلط بھی ہے اور غلط فہمی پر مبنی بھی۔ دنیا کی طاقتیں اپنی خود غرضیوں کی خاطر امن کے لیے قوت نہیں بلکہ ایک خطرہ ہیں میں نے ایک بار لیگ اقوام میں جو کچھ کہا تھا آج بھی کہتا ہوں۔ ہر جنگ ایک دوسری جنگ کو جنم دیتی ہے اور ہر امن کے معاہدہ میں ایک نئی جنگ کا مقصد کام کرتا ہے۔"

لیٹونوف کے یہ جملے خود غرضیوں کے ان دائروں کو نمایاں کر رہے ہیں جن سے میونخ کے معاہدے کے بعد بھی جنگ کے ذکر و فکر کو ترقی ہو رہی ہے اور جنہوں نے یکساں طور پر مشرق و مغرب

کی عافیت کے امکانات کو درہم برہم کر رکھا ہے۔

منچوریا پر جاپان کے فوجی قبضہ کو زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ منچوریا کی فتح کے بعد فوراً مجلس اقوام کے کمیشن کے صدر لارڈ لٹن کے مخالف فیصلہ کے باوجود یورپ کی حکومتوں نے منچوریا پر جاپان کا قبضہ تسلیم کرلیا گویا یہ مان لیا گیا کہ منچوریا میں جاپان کی جنگ ناجائز تھی مگر جنگ کے نتیجہ میں جو سلطنت قائم ہوئی ہے وہ جائز ہے۔

منچوریا میں امن کی اسکیموں کی ناکامی کا قدرتی نتیجہ حبش کی جنگ کی صورت میں رونما ہوا مشرق بعید کی چنگاری افریقہ کے جنگل میں پہنچی تو شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور اس نے پہلا اسلامی اوّل کے تاج و تخت کو جلا کر آزاد حبشی قوم کی حسرتوں کو راکھ کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے منچوریا منچورین قوم کے ہاتھ سے گیا اور ادھر حبش حبشیوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔

اس وقت دنیا کی تمام سرگرمیاں دو جُدا جُدا خطوط کی شکل میں نظر آرہی ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ زمین کی بادشاہت ایشیا کا حق ہے یا اہل فرنگ کا۔ ایشیا اپنی تاریخ اپنی قدامت اور اپنی روحانیت کو نئی دلیل کی صورت میں پیش کر رہا ہے اور یورپ اپنے موجد دماغ اور اپنے ساز و سامان کی تازہ دم قوتوں کو اپنے حق کی تائید میں پیش کر رہا ہے۔ ایشیا یورپ کے نقشہ کو اپنی آزادی کے آئینہ میں دیکھ رہا ہے اور یورپ ایشیا کے سادہ نقشہ میں اپنا رنگ بھرنے کی سعی کر رہا ہے

خالدہ ادیب خانم نے دہلی کے ایک لیکچر میں کہا تھا کہ "مشرق اور مغرب میں ذہنی اتحاد

کے فقدان نے دونوں کو تباہی سے قریب تر کر دیا ہے۔ ہم یہ تباہی کارواں در کارواں سیاسی زندگی کی ہر منزل میں دیکھ رہے ہیں۔ مشرق بعید اور یورپ کی سیاست میں آج ہم جو الجھنیں دیکھ رہے ہیں اگرچہ وہ اندرونی معلوم ہوتی ہیں، مگر درحقیقت وہ مشرقی مسئلہ ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ مسٹر لائڈ جارج کی وہ حکمت عملی جس کا رُخ مجددانہ طور پر اور تیزی سے مشرقی فتوحات اور برطانوی سلطنت کی وسعت کی طرف رہا ہے، یورپ کے مطلق العنان آمروں کی تخلیق کا موجب ہوئی۔ لائڈ جارج کے بعد مسٹر بونرلا، مسٹر بالڈون، مسٹر ریمزے میکڈانلڈ بیس سال تک مشرق کو فتح کرنے کے لیے اپنے پیشرو اور ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے وزیر اعظم کی پالیسی پر چلتے رہے۔ بحر روم میں مقبوضات کا ہونا، بحر ہند اور خلیج فارس کی ماتحت عربی ریاستوں کی موجودگی اور مشرق قریب میں برطانیہ کی انتدابی حکومتوں کا قیام، بحر روم میں مالٹا پر برطانوی قبضہ، اس کے سرے پر جبل الطارق پر بالادستی، بحر الکاہل میں ہونولولو کی بحری راہوں کے مرکز پر تسلط، نہر سویز پر انگلستان کی بالادستی اور جنگ عظیم کے بعد جرمن نوآبادیات کی تبدیلیاں ایسے امور ہیں جو ہمیں منزل بہ منزل ایک جنگ سے دوسری جنگ کی طرف لیجا رہے ہیں۔ جنہوں نے روسی جمہوریت کے سیلاب کو جرمنی کی فولادی دیوار کے سامنے روکا ہے اور وسط یورپ میں نئے مسائل پیدا کر کے مغرب میں دو ڈکٹیٹروں۔ قہرمان ڈکٹیٹروں اور مشرق میں ایک نئی دہشت انگیز شہنشاہیت (جاپان) کو جنم دیا ہے۔

مشرق میں برطانوی مقبوضات نے دنیا کو ایک بڑے فتنہ سے آگاہ کیا اور آج دنیا کی تمام قوی اور قادر و قاہر حکومتیں اس فتنہ کو اپنی گود میں لینے کے لیے بڑھ رہی ہیں، اور اسی بڑھتی ہوئی

خواہش کا منفی اثر مشرق بعید کی جنگ مشرق قریب (فلسطین) کے دست بدست ہنگاموں، وسط یورپ کے اختلافات اور نوآبادیات کے متعلق جرمنی کے اشتعال کے لیے وجہ جواز بنا ہوا ہے۔

ہمارا حال کل کے واقعات کا نتیجہ ہے۔ کل کا تجربہ آج دنیا کے کام آرہا ہے۔ اس آسمان کے نیچے کوئی شے نئی نہیں جو کچھ پہلے ہو چکا ہے آج بھی ہو رہا ہے، کل بھی یہی ہوگا اور آئندہ بھی یہی ہوتا رہیگا۔ کل کی طرح آج بھی واقعات کی تلوار حکومت کر رہی ہے، واقعات کا رخ یہ ہے کہ دنیا کو ایک اور جنگ عظیم کی ضرورت ہے۔ مشرق اور مغرب میں اس جنگ کے علیحدہ علیحدہ کئی محاذ ہونگے، مگر دراصل یہ ایسے دو بڑے محاذوں کا مجموعہ ہوگی جس کے ماتحت دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے جداگانہ محاذ نظر آئینگے۔ یہ دونوں محاذ آج بھی حالات کی دوربین سے ہلکے ہلکے نظر آرہے ہیں۔

ہم اس وقت دنیا میں امن اور جنگ کے نام پر جو سرگرمیاں دیکھ رہے ہیں ان میں درحقیقت یہی مشرقی اور مغربی مسئلہ کا کام کر رہا ہے۔ اور اسی شے نے برطانیہ کی مشرقی حکمت عملی اور مغربی پالیسی کو ڈانواں ڈول کر رکھا ہے۔

برطانیہ کی خارجہ پالیسی تمام دنیا کی نظر میں محل نظر بنی ہوئی ہے۔ برطانوی سلطنت جس طرح عالمگیر ہے، اسی طرح اس کی مشکلات بھی عالمگیر ہیں۔ اگرچہ دنیا کے سیاستدانوں کے تدبر کا پورا پورا ظہور لاینحل مشکلات کے زمانہ میں ہوتا ہے لیکن زیادہ تر یہی مشکلات ایسی لغزشوں اور کمزوریوں کو ابھار دیتی ہیں جن سے ایک بنی بنائی قوم بگڑ جاتی ہے!

میونخ کا اثر دہلیس | میونخ میں برطانیہ نے جرمنی سے مل کر نومبر کے پہلے ہفتہ میں جو کچھ کیا وہ برطانوی مشکلات کا

ایک ایسا سلجھاؤ تھا جس سے ایک ماہ کے قلیل عرصہ میں دس الجھاؤ اور پیدا ہو گئے ہیں۔ آسٹریا پر جرمنی کے قبضہ کے بعد برطانیہ نے زیکوسلاوکیہ کو مجبور کر کے جرمنی کو سوڈیٹین علاقہ پر اس لیے قبضہ دلایا تھا کہ جنگ کا آفتاب سوانیز سے پہنچ کر اپنے مستقر پر واپس لوٹ جائیگا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی وقار خاک میں مل گیا۔ برطانیہ نے اپنا سب کچھ کھو کر جب دنیا کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ دنیا کو امن کی نعمت کا ایک حصہ بھی حاصل نہیں ہوا۔

دراصل آج کی سیاست کا حاصل ایک سعی لاحاصل کے سوا اور کچھ بھی نہیں رہا۔ کارل مارکس نے کہا تھا کہ برطانیہ سرمایہ داروں میں جابر ترین سرمایہ دار شہنشاہیت ہے آج اس کے مقابلہ میں تین سرمایہ شہنشاہیت پسند طاقتیں عروج پر آرہی ہیں۔

۱۔ جرمنی جس کے سامنے پرنس بسمارک کی عالمگیر جرمن سلطنت کا تصور ہے۔

۲۔ اٹلی جس کا مقصد ایک نئی رومۃ الکبریٰ کی تاسیس ہے۔

۳۔ جاپان، جس کا خیال ہے کہ اس کا شہنشاہ دنیا میں خدا کی مرضی کا نمائندہ ہے اور خدا کی مرضی یہ ہے کہ ایشیا ہی میں نہیں یورپ پر بھی جاپان کا قبضہ ہو۔

ان تینوں طاقتوں کو اپنی آبادی کی بڑھتی ہوئی فوج کے لیے نوآبادیات کی ضرورت ہے۔ چونکہ برطانیہ کی نوآبادیات تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اس لیے برطانیہ کا مفاد ان طاقتوں کے مفاد سے ٹکر کھاتا رہتا ہے۔ ہماری قریبی تاریخ کے واقعات اسی تصادم کا نتیجہ ہیں جو ابھی عرصہ تک جاری رہیگا۔

جرمنی نے ۱۹۱۹ء کے معاہدہ ورسیلز (میثاق صلح) کے خلاف روہر پر قبضہ کیا، سارے فرانس کو بیدخل

کیا، رائن لینڈ سے بین الاقوامی اختیار کا خاتمہ کیا، آسٹریا کو اپنی سلطنت میں ملایا، سوڈیٹین جرمن کو جرمن پارلیمنٹ (ریش) کی بالادستی قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اٹلی نے طرابلس میں مسلمانوں کو ختم کیا، جزیرہ روڈس کو ترکی سے غصب کرکے فوجی مستقر کی صورت دی۔ اریٹریا کے قبضہ کے بعد پورے حبش پر قبضہ کیا۔ اور اب یمن مصر اور سمرنہ کے زرخیز سواحل کو مشتاق نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ جاپان نے کوریا پر قبضہ کیا، منچوریا کو چین سے علیحدہ کرکے اُس پر اپنی سیادت قائم کی۔ اب چین میں شمال اور جنوب میں شنگھائی، نانکن، پکن کینٹن، ہانگ کانگ فتح کرنے کے بعد آگے بڑھ رہا ہے، اور سنگاپور کی کھڑکی سے ایک طرف ہندوستان کی طرف جھانک رہا ہے اور دوسری طرف آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور فلپائن کے امریکن مقبوضات کو دوربین سے دیکھ رہا ہے۔

یہ سب کچھ نوآبادیاتی مسئلہ کا نتیجہ ہے جو قدرۃً برطانیہ کی مشرقی پالیسی اور نوآبادیاتی حکمت عملی سے پیدا ہوا ہے۔ مسولینی نے حبش کی فتح پر، ہٹلر نے آسٹریا اور زیکوسلاویکیہ کے سوڈیٹین علاقوں پر قبضہ کے وقت اور افواج جاپان کے رہنما جنرل لوراکی کے کمان افسر نے چین میں اپنی فوجوں کو آگے بڑھاتے ہوئے انگریزوں سے خطاب کرکے غلط نہیں بالکل صحیح کہا ہے کہ تم جو کچھ ایک صدی سے کررہے ہو، ہم اس صدی میں اُس کو شروع کررہے ہیں۔ برطانیہ کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہے اسی لیے وہ چھوٹے چھوٹے معاملوں میں اپنے حریفوں کو مبتلا کرکے اپنے بڑے بڑے مقبوضات اور نوآبادیات کی حفاظت کررہا ہے۔ برطانوی تدبر کا رجحان یہ ہے کہ جرمنی، جاپان اور اٹلی کی فتوحات کا دائرہ اگر بڑھتا ہے تو اس کا رُخ برطانوی مقبوضات اور نوآبادیات کی طرف نہ ہو۔ گذشتہ چند سال کے اندر برطانیہ نے بین الاقوامی سیاست میں جتنی کڑوی گولیاں نگلی ہیں وہ اسی درجہ کی شے ہیں۔ آئندہ بھی برطانیہ اپنے حریفوں کا رُخ بدل بدل کر وقت کو ٹلاتا رہیگا، اور جب مجبور ہی ہو جائیگا تو مجبوراً جنگ میں حصہ لیگا۔

برطانیہ کی خارجی پالیسی

بعض لوگوں کو برطانیہ کی غیرملکی پالیسی کے اتار چڑھاؤ پر حیرت ہوتی ہے۔ اس قسم کی حیرت کا اظہار ہمیشہ کیا گیا ہے۔ دو سال قبل روس کے مشہور سیاستداں صحافی کارل ریڈک نے اپنی حیرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:-

"برطانیہ کی خارجی پالیسی سیاسیات عالم میں ہمیشہ ایک معمہ بنی رہی ہے۔ نپولین کی فتوحات سے پہلے بھی برطانیہ کے قول و فعل کو یکساں نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس کے بعد تو برطانیہ کی خارجی حکمت عملی میں اس قدر اتار چڑھاؤ ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جاپان برطانیہ کی خارجی پالیسی سے بے چین ہے۔ روس میں برطانیہ کو حیلہ ساز کہا جاتا ہے۔ جرمنی اور فرانس میں بھی برطانیہ کے لیے اسی طرح کے الفاظ کہے جاتے ہیں اور امریکہ میں بھی برطانیہ کے اس قول و فعل کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں پائی جاتی"

پہلے برطانوی مقبوضات میں برطانوی دماغ کی تعریف بڑے رعب و داب کے ساتھ کی جاتی تھی لیکن اب وہاں بھی برطانیہ کی ذات پہچان لی گئی ہے۔ یہ ماننا پڑیگا کہ برطانیہ آج بھی سیاسیات عالم کا ہیرو ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کل بھی ہیرو کا پارٹ اس کے حصہ میں آئیگا۔

میونخ کے معاہدے کے بعد برطانیہ نے کیا کھویا ہے اور دنیا نے امن و صلح کی دولت کا کتنا حصہ پایا ہے اس کا حال مدبرین عالم کی طاقتور رائے عامہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری دنیا میں گھٹنوں کے بل جو سیاست چل رہی ہے اُس کا قریبی تعلق مسٹر چیمبرلین کے سفر گوڈاسرگ اور معاہدہ میونخ سے ہے اس لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس معاہدہ نے دنیا کی رائے عامہ پر کیا اثر ڈالا ہے۔

مدبرین عالم کی نظر

گذشتہ ماہ کے پہلے ہفتہ میں انگلستان کے بھرے ایوان میں وزیر اعظم برطانیہ نے دعویٰ کیا تھا

"ہماری پالیسی سے یورپ میں امن کا نیا دور آنے والا ہے (میجر اٹلی لیڈر مخالف پارٹی کی طرف رُخ کرکے) معترضین کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور اس کا اثر زیکوسلاویکیہ

"دردنیا پر کیا پڑتا"

اس رائے کے بعد اب چند مدبرین کی رائیں دیکھیے کہ وہ معاہدۂ میونخ کے بعد کس قسم کے جذبات رکھتے ہیں۔ آراء سے پہلے حادثہ کی تاریخ مطالعہ کر لیجیے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو جرمن فوج کے افسر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ آج سوڈیٹین جرمن علاقہ پر فوج کا قبضہ مکمل ہوگیا۔

اسی تاریخ میں ہٹلر نے فرمان شائع کیا کہ "ریش" جرمن پارلیمنٹ کے قوانین اور جرمن نشان کے ساتھ اس علاقہ میں حکمرانی کرینگے۔

۲۲ اکتوبر کو فوجی راج ختم کردیا گیا اور سوڈیٹین علاقے میں سول انتظامی حکومت قائم ہوگئی۔

جرمن اور زیکوسلاویکیہ کے افسانہ کا آخری باب جب مکمل ہوگیا اور وزیر اعظم انگلستان نے امن کی عمارت کو آخری اینٹ رکھ کر مکمل کردیا تو دنیا کے مدبرین چلانے لگے کہ ہم آج بھی اسی طرح جنگ کے دروازہ پر ہیں جس طرح کل تھے۔

(۱) پراگ میں زیکوسلاویکیہ کے اخباروں نے بالاتفاق ایک جملہ لکھا "آج ہماری زندگی کا سب سے زیادہ منحوس دن ہے۔ ہم ذلت کے پیالے سے آخری گھونٹ پی رہے ہیں" ۹۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

(۲) مسٹر لائڈ جارج نے سٹی ٹمپل لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"ملک کی راحت کا پیمانہ ہمارے اس جذبۂ شرم سے پر ہو رہا ہے کہ ہم نے ضمیر اور سلطنت کے وقار کو ختم کر کے امن خریدا ہے"

حبش، اسپین اور سوڈیٹین علاقے کے واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ذلت کے گڑھے میں بہت نیچے اُتر آئے ہیں کیا ہمارے لیے پستی میں گرنے کی کوئی گنجائش ہے؟ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء

(۳) مسٹر چرچل نے امریکہ کے لیے اپنی براڈکاسٹ تقریر میں کہا:-

"انگریزی قوم اور ایمپائر کے اجزا یہ دریافت کر رہے ہیں کہ یہ انتہا ہے یا ابھی اور کچھ ہونے والا ہے۔ (۱۷۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

(۴) پارلیمنٹ کے لبرل رہنما مسٹر آرچبالڈ سنکلر نے ایوان میں رنج کے ساتھ کہا۔

"اس مثال نے ثابت کر دیا ہو کہ ہم دنیا کی طاقت کی کنجیاں ایک ایک کر کے زبردست آزار زبردستوں کے سپرد کر رہے ہیں۔ (یکم نومبر ۱۹۳۸ء)

(۵) مسٹر ایڈن وزیر خارجہ برطانیہ نے ازراہ تاثر آکسفورڈ یونیورسٹی کے کارسٹن کلب میں کہا:۔

برطانیہ کی غیر ملکی پالیسی کا مقصد بین الاقوامی معاہدوں کا احترام ہونا چاہیے۔

(۶) وجے لکشمی پنڈت (جواہر لال جی کی ہمشیرہ) نے سفر یورپ کے بعد کراچی میں بیان دیا:۔

"میں انگلستان میں کسی ایسے انگریز سے نہیں ملی جو میونخ کے معاہدے سے شرمندہ نہ ہو"

ان آرا کے علاوہ انگلستان کی وزارت پارٹی کے جرائد کی تازہ ترین رائے یہ ہے کہ معاہدہ میونخ کے ماتحت جرمنی سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ ہر ہٹلر نے میونخ سے واپس ہوتے ہی نوآبادیات (برطانوی ٹانگانیکا اور فرانسیسی کیمرون) کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ لنڈن ٹائمز کے قول کے مطابق ہر ہٹلر کے ذہن میں نوآبادیات کو فوری واپسی کا مطالبہ اس اصول پر مبنی ہے کہ گرم لوہے پر چوٹ زیادہ کارگر ہوتی ہے۔

جب حالت یہ ہو تو دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ برطانیہ نے اپنی کوششوں سے واقعات کے اس مطالبہ کو ختم کر دیا ہے کہ دنیا کو ایک اور جنگ عظیم کی ضرورت ہے۔ دنیا میں بڑھی ہوئی آبادی کا مسئلہ، پیداوار کی کمی اور عدم توازن صنعتی اور تجارتی مقابلہ، بالادستوں کا مطالبۂ نوآبادیات، زیردستوں کا مطالبۂ آزادی۔ اور ان تمام باتوں سے پیدا ہونے والی اور سو باتیں جب تک دنیا کے سر پر گذر رہی ہیں امن کا نام لینا بڑے لوگوں کا مذاق ہے جو پہلے بھی ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے ×

لطائفِ ادبیہ

ستارے

از جناب میر اُفق صاحب کاظمی امروہوی

(۱)

تمام دِن تو ہیں تابِ فروغِ مہر میں گُم
نقاب اُلٹتے ہیں چہرے سے رات کو انجم

خموش انجمنِ کائنات ہوتی ہے!
چمکنے لگتے ہیں انجم جو رات ہوتی ہے

شرارِ حسن مصابیح گنبدِ دوّار!
فلک کی بزم کے یہ زاہدانِ شب بیدار

فلاسفر انہیں روشن کُرے بتاتے ہیں!
حسابِ بُعدِ مسافت لگاتے جاتے ہیں

کشش سے اِن کی بتاتے ہیں چرخ کو قائم
یہ اُس پہ طرّہ کہ گردش میں رہتے ہیں دائم

جڑا ہوا انہیں سمجھا ہے چرخ پر کوئی
حقیقت ان کی بتاتا نہیں مگر کوئی

کچھ اس میں شک نہیں زینت ہیں آسماں کیلیے
فروغِ چشمِ بصیرت ہیں اک جہاں کیلیے

غرض انہیں کوئی کچھ کوئی کچھ بتاتا ہے
ہر اک فریق جُدا اپنی اپنی گاتا ہے

زمانہ کچھ کہے ان کو، انہیں نہیں مطلب
یہ اپنی ایک روش پر چمکتے ہیں ہر شب

(۲)

میں زیرِ سقفِ فلک اک رات سوتا تھا
خمارِ بادۂ غفلت میں عمر کھوتا تھا

کسی خیال سے یکلخت میری آنکھ کھُلی
معاً ستاروں کی جانب نگاہ جا پہنچی

یہ دیکھا میں نے کہ سب کانپتے ہیں ڈرتے ہیں — اک آنکھ کھولتے ہیں ایک بند کرتے ہیں
لرز رہے ہیں کسی خوف اور دہشت سے — نہیں قیام کسی ساعت ایک ہیئت سے
یہ رنگ دیکھ کے میں نے کہا کہ اے انجم! — بتاؤ تو سہی کس ڈر سے کانپتے ہو تم؟
ذرا یہ مجھ سے کہو تم ہو اصل میں کیا شے — تمہارے جرمِ منور کی کیا حقیقت ہے؟

(۳)

ستارے بولے کہ اے شاعرِ حقیقت جو — بتائیں کیا تجھے کیا ہم سے پوچھتا ہے تو
فضائے دہر میں ہم دیدہائے عبرت ہیں — مناظرِ شبِ انساں سے محوِ حیرت ہیں
جو شب میں کرتی ہے اعمال نوعِ انسانی — ہمارا فرض ہے تا صبح اُن کی نگرانی
محیط ابر ہو پوشیدہ ہو کہیں کوئی — ہماری آنکھوں سے پنہاں مگر نہیں کوئی
یہ دوربینیں ہیں عکاس آئینے کی طرح — نہ آئینے کی طرح بلکہ اکسرے کی طرح!
نظر جو آتے ہیں اعمال اشرف المخلوق — تو برقِ خوف سے پڑ جاتے ہیں جگر میں شقوق
کبھی ہے شرم کبھی لرزہ جسم پر طاری — جو دیکھتے ہیں تری قوم کی سیہ کاری
کہیں جو پاتے ہیں خاصانِ حق کو ہم بیدار — تو اس سے ہوتا ہے کچھ روحِ مضطرب کو قرار
غرض بخوف و رجا رات بھر ٹھہرتے ہیں — دمِ سحر تری دنیا سے کوچ کرتے ہیں

طلوعِ مہر سے روئے اُفق اِدھر پر نور
ہم اُس طرف لیے شب نامچہ خدا کے حضور

جذبِ جنوں

از مسعود الرحمٰن صاحب عثمانی جاوید

فکر کو جذبِ جنوں بھی جو میسر ہو جائے — تیری ہستی بخدا موت پہ دو بھر ہو جائے

عشقِ مجبور کی اک یہ بھی ہے قدرت اے دوست — منہ سے جو بات نکل جائے مقدر ہو جائے

دل وہ شعلہ ہے مرے دل کو جلانے والے — اس کو اڑنا اگر آجائے تو اختر ہو جائے

سوگوارِ غمِ ہستی! غمِ ہستی کی قسم — دل وہ شیشہ ہے کہ تو چاہے تو پتھر ہو جائے

عقل وہ زہد کہ زاہد کو بھی کافر کر دے — عشق وہ کفر کہ کافر بھی پیمبر ہو جائے

شوقِ گریہ ہے تو اتنا تو جگر کو خوں کر — آنکھ سے اشک جو ٹپکے تو گلِ تر ہو جائے

تجھ کو جینا بھی سکھا دیگا تیرا سوزِ طلب — پہلے مرنے کا سلیقہ تو میسر ہو جائے

عزمِ ہستی کی قسم! شورِ جنوں ہے وہ شے — دہشتِ خوف سے قسمت کی جبیں تر ہو جائے

عقل وہ قطرۂ شبنم کہ اڑے تو کھو جائے
عشق وہ اشک کہ ٹپکے تو سمندر ہو جائے

تبصرہ و نظر

جدید کتابیں

"یدِ بیضا" ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری بیرسٹرایٹ لا ہندوستان کے اُن گنے چُنے مسلمانوں میں سے ہیں جو انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے اور سرکاری عہدہ کی ذمہ دارانہ مصروفیتیں رکھنے کے باوجود اسلامیات سے شغف رکھتے ہیں۔ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ آپ کی متعدد کتابیں، آئینِ عالم، وفاق ہند اور Flash Lights on Islam شائع ہو کر ملک میں مقبول ہو چکی ہیں۔ اب آپ کے اسلامی و معاشرتی مضامین کا مجموعہ "یدِ بیضا" کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس مجموعہ میں آپ کے مختلف مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب اُن کو اضافہ و ترمیم کے ساتھ اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ متعدد مضامین ایسے بھی ہیں جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے ہیں۔

اس مجموعہ میں جتنے مضامین ہیں سب ہی دلچسپ اور مفید ہیں۔ علی الخصوص مضامین ذیل زیادہ توجہ اور غور سے پڑھنے کے لائق ہیں۔

"اسلام اور سرمایہ دار و مزدور" "اسلام اور وطنیت"، "اسلام اور عورت"، "عورت کی حیثیت ہندوستان میں"، "اسلامی فلسفۂ زندگی"، "انسان کامل"۔ زبان شگفتہ اور سہل و رواں ہے خیالات سنجیدہ و متین اور سلجھے ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے قرآن مجید کا مطالعہ بنظر عمیق کیا ہے اور اصولِ اسلام کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کے شروع میں خود فاضل مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جس میں مصنف

نے غیر مسلم مصنفین کے حملوں اور بیجا اعتراضوں کا دردانگیز طریقہ پر ذکر کیا ہے اور پھر مسلمانوں کے

ذہنی و دماغی تنزل کا ایک حسرت آمیز خاکہ کھینچا ہے۔ اسی ذیل میں آپ نے بعض باتیں بڑے

کام کی کہی ہیں۔ الغرض کتاب اپنی معنوی حیثیت سے بہت خوب، عمدہ اور مفید ہے۔ اس کا مطالعہ

نہ صرف مسلمانوں کے لیے سودمند ہوگا۔ بلکہ اگر غیر مسلم اس کو پڑھینگے تو انہیں اس کتاب میں اسلام

کی سادگی و صفائی، انسانی ہمدردی و اخوت اور جامعیت و اکملیت کی ایک دلکش تصویر نظر آئیگی۔

طباعت و کتابت متوسط تقطیع ۱۷×۲۷/۸، ضخامت ۱۳۷، قیمت عمر منیجر صاحب آرمی پریس سے طلب کیجیے۔

معین المنطق حصہ اول و دوم۔ مولانا محمود حسن صاحب مدرس و مفتی جامعہ حسینیہ راندیر ضلع سورت

نے ارادہ کیا ہے کہ فنون کو عربی سے آسان اردو میں منتقل کریں۔ آپ نے اسی سلسلہ میں معین المنطق

کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا ہے جس کے دو حصے ہیں۔ اس میں منطق کے مبادی اور اصول موقوفہ

کو سلیس اردو میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک حد تک کامیاب ہے لیکن اگر مسائل کی

توضیح میں چند نئی مثالوں سے کام لیا جاتا اور نحو و صرف کی جدید ریڈروں کی طرح ان کی تمرین بھی

کرائی جاتی تو غالبًا یہ کوشش زیادہ مفید ثابت ہوتی۔ بہرحال اردو خواں طلبہ کو اس سے فائدہ

اٹھانا چاہیے۔ چھوٹی تقطیع ضخامت حصہ اول ۸۰ صفحات قیمت ۳ر حصہ دوم ضخامت ۱۲۶ صفحات

قیمت ۸ر ملنے کا پتہ مولوی محمد یعقوب صاحب شاہجہانپوری مالک تعلیمی کتب خانہ قرولباغ دہلی۔

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

(۱) ندوۃ المصنفین کا دائرۂ عمل تمام علمی حلقوں کو شامل ہے۔

(۲) الف۔ ندوۃ المصنفین ہندوستان کے ان تصنیفی، تالیفی اور تعلیمی اداروں سے خاص طور پر اشتراک عمل کریگا جو وقت کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ملت کی مفید خدمتیں انجام دے رہے ہیں اور جن کی کوششوں کا مرکز دین حق کی بنیادی تعلیمات کی اشاعت ہے۔

ب۔ ایسے اداروں، جماعتوں اور افراد کی قابل قدر کتابوں کی اشاعت میں مدد کرنا بھی ندوۃ المصنفین کی ذمہ داریوں میں داخل ہے۔

محسنین۔

(۳) جو حضرات کم سے کم پچیس روپے (۲۵) سال مرحمت فرمائینگے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہونگے اُن کی جانب سے یہ خدمت معاوضے کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔

ادارے کی طرف سے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد اوسطاً چار ہوگی اور رسالہ برہان بطور نذر پیش کیا جائیگا۔

معاونین :۔

(۴) جو حضرات بارہ روپیہ سال پیشگی عنایت فرمائینگے اُن کا شمار ندوۃ المصنفین کے دائرہ معاونین میں ہوگا۔ اُن کی خدمت میں بھی سال کی تمام تصنیفیں اور ادارے کا رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے) بلاقیمت پیش کیا جائیگا۔

احبار:-

(۵) چھ روپے سالانہ ادا کرنے والے اصحاب ندوۃ المصنفین کے حلقۂ احبار میں داخل ہونگے ان حضرات کو ادارے کا رسالہ بلا قیمت دیا جائیگا اور اُن کی طلب پر ادارے کی تمام تصنیفیں نصف قیمت پر پیش کیجائینگی۔

(۶) معاونین اور احبار کے لیے یہ سہولت بھی رکھی گئی ہے کہ اگر کسی وجہ سے یکشت بارہ روپے یا چھ روپے ادا کرنا ممکن نہ ہو تو معاونین یہ رقم تین تین روپے کی چار قسطوں میں ہر سہ ماہی کے شروع ہی میں عنایت فرمادیں اور احبار تین تین روپے کی دو قسطوں میں ہر ششماہی کی ابتدا میں۔

چندہ سالانہ رسالہ برہان

پانچ روپے

خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر رسالہ "برہان" قرول باغ نئی دہلی

جید برقی پریس دہلی میں طبع کراکر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے
دفتر رسالہ "برہان" قرول باغ نئی دہلی سے شائع کیا